

# ره نور و شوق

بشریٰ اعجاز



# رہ نورِ شوق

بُشریٰ اعجاز

1000 صفحات پر مشتمل کتاب ہونے کی وجہ سے اس کی پی۔ڈی۔  
ایف کو 2 حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے۔ دوسرا  
حصہ اگلے صفحہ پر دی گئی ویب سائٹ یا اینڈرائیڈ اپلیکیشن یا وٹس  
ایپ پر آپ ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔

شام کے بعد پبلی کیشنز ۱۳۔ اے بہاول پور روڈ۔ لاہور

7237592 - 7310172 Fax: 7310115

الحمد للہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو وڈیو بیانات کو آپ کی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراً سن سکیں۔ ویب سائٹ کی اینڈ رائیڈ اپلیکیشن بھی موجود ہے آپ اپنے اینڈ رائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ اپلیکیشن سرچ کر کے



انٹال کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائٹ اور اپلیکیشن سے آپ

یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

- 1- مفسر، مترجم و مفسر قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔
- 2- مشکوٰۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔
- 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہ آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیو دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔
- 4- اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبدالباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیو سن سکتے ہیں۔
- 5- حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6- ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔
- 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8- اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیو وڈیو۔
- 9- سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریباً تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیو فوراً اپلیکیشن اور ویب سائٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔
- آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔
- آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میج کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔

اہتمام اشاعت  
امیر  
سمیر



جملہ حقوق محفوظ

جولائی ۲۰۰۰ء

پروڈکشن : حمیرا اکرم

آرٹ : تبسم نسیم

قیمت : ۴۵۰ روپے

انتخاب شدہ پریس ۸-ایچ ڈی ڈالہ، فون نمبر: 6314365



# انتساب

رب کائنات کے نام  
جو محبوب ازلی ہے  
حبيب خدا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ  
کے نام  
جو تمام محبتوں کی ابتدا اور انتہا ہے  
اور

اعلیٰ حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ  
کے نام

جنہوں نے حضرت محمد اکرم اعوان  
کی بصیرتوں اور بصراتوں کو نکھارا  
اور انہیں دردِ دل کی عظیم نعمت عطا کی !!

## ترتیب ابواب

### 1- بابِ اجد

- 17 نمک تحریر حضرت محمد اکرم اعوان صاحب 1- محمد  
18 2- نعمت  
19 3- الف ب کا قاعدہ  
27 4- کچھ اپنے بارے میں  
37 5- ذوالقرنین ایک شخص جس نے دو صدیوں کو متاثر کیا

### 2- بابِ تلاش

- 109 1- تعارف و حالات زندگی حضرت مولانا اللہ یار خان  
113 2- زندگی کو ڈھونڈنے نکلے تھے ہم حضرت محمد اکرم اعوان  
141 3- مخلوط نام حضرت محمد اکرم اعوان صاحب حضرت مولانا اللہ یار خان  
159 4- تصوف و سلوک اسلامی حافظ محمد شریف  
5- عرضِ محل حضرت مولانا اللہ یار خان  
6- تعلیماتِ شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ  
قولِ آخر  
165 شجرہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ  
166 ذکرِ الٰہی کی ضرورت و اہمیت  
168 لطائف کیا ہیں؟  
170 ذکرِ قلبی کا طریقہ  
172

### 3- باب شخصیت

- 322 -9- عیثیت شیخ الکریم مدظلہ العالی عہد الودود شاہ
- 326 -10- سلسلہ لونیہ کی عظمت عہد الودود شاہ
- 330 -11- حضرت مدظلہ العالی کی تربت کا طریقہ عہد الودود شاہ
- 337 -12- تعلیمات شیخنا صہ
- 350 -13- مرشد کامل! ڈاکٹر عائشہ سلطنت
- ایک نگاہ نفسیات اور نفسیات دانوں پر بھی
- 378 -14- اور کچھ نہیں: دوا کر عل سلطان
- 383 -15- میرے اد آسیہ اکرم اعوان
- 400 -16- میں اور میرے اد عہد القدر اکرم اعوان
- 407 -17- حضرت بی شینہ افتخار اعوان

## 4- باب عمل

- 425 -1- تنظیم الاخوان
- 426 تنظیم الاخوان کا تعارف
- 442 الاخوان
- 444 سیاسی مقاصد
- 447 الاخوان کا منشور
- 450 -2- امیر تنظیم الاخوان حضرت محمد اکرم اعوان صاحب
- کے مختلف خطبات سے مختصر اقتباسات
- 454 -3- امیر تنظیم الاخوان سے انٹرویو
- 483 -4- صقارہ نظام تعلیم
- 488 (پر پہل صقارہ اکادمی منارہ چکوال) محمد ابراہیم خلیل صاحب
- سے بات چیت

|     |                               |                     |
|-----|-------------------------------|---------------------|
| 492 | گلزار آفاقی                   | 5- نئے عہد کی خوشبو |
| 497 |                               | 6- شعبہ نشر و اشاعت |
| 501 | بریکینگ میز ایجاز احمد        | 7- الفلاح           |
| 504 | کرگل ریٹائرڈ افسر احمد چوہدری | 8- بھنگ سمن         |

## 5- باب قلم

|     |                           |                                       |
|-----|---------------------------|---------------------------------------|
| 513 | ڈاکٹر فیض الحق یوسف زئی   | 1- چشمہ ہدایت                         |
| 517 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 2- تبدیلی نظام ضرورت اور مراد         |
| 523 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 3- کیوں کچھ ہونے والا ہے              |
| 532 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 4- انقلاب کون لائے گا                 |
| 546 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 5- عشق خانہ خراب کی باتیں             |
| 553 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 6- شہنشاہوں اور فاتحین کی جولانگاہیں  |
| 560 |                           | 7- سیاحت                              |
| 562 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 8- برن کی موت                         |
| 564 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 9- دیس اندر پردیس                     |
| 598 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 10- شیروں کی کچھار میں                |
| 617 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 11- شکار ہمارا خاندانی شوق ہے + مشاغل |
| 619 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 12- یہ فانی چونیوں کا ہیرہ            |
| 626 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 13- اترتے ڈوٹے سورج                   |
| 631 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 14- شکار                              |
| 634 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 15- سیاحت کے رنگ                      |
| 646 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 16- کیم جون، انتہا پارک               |
| 649 | حضرت محمد اکرم اعوان صاحب | 17- ذہنی لینڈ                         |

651

حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

652

مقابل خیال۔ ابو الحسن نقوی

655

تاج رحیم

659

ڈاکٹر محمد حامد

18- حرف نکلے ہیں خیال نکلے ہیں

19- دیار حبیب میں چند روز

20- غبارِ اوپ تیسرہ

21- امریکہ ایک بار پھر

(غبارِ اوپ حصہ دوم) پر تیسرہ

## شاعری

## 6- بابِ دل

669

1- گردِ سفر

تعارف اور منتخب اشعار

672

سیما ابوبیسی

اہلی بات

674

حافظ پروفسر عبدالرزاق صاحب

غنہائے گفتنی

677

ڈاکٹر محمد حامد

بلا عنوان

679

2- نشانِ منزل

تعارف اور منتخب اشعار

681

سیما ابوبیسی

حرفے

683

سید ضمیر جعفری

مصابِ فکر

686

3- مصابِ فقیر

تعارف اور منتخب اشعار

690

سیما ابوبیسی

فیضانِ نظر

691

کر قل محمد خان

مولانا محمد اکرم کی شاعری

693

4- آسِ جزیرہ

تعارف اور منتخب اشعار

695

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

منارِ نور سے آواز

تعارف اور منتخب اشعار

706

ڈاکٹر محمد اہمل نیازی

دید و تر

709

6- کون سی ایسی بات ہوئی ہے

تعارف اور منتخب اشعار

712

منیر نیازی

ایک نئی فکر

713

علی اکبر منصور

مثنوی شاعر

716

منیر نیازی

7- مرشد محمد اکرم اعوان

718

پروفیسر خورشید رضوی

8- سیما رنگ

723

پروفیسر محمد اکرم طاہر

9- ایک خوشنوا فقیر

729

زہرا رانا

10- اکرم اعوان + مولانا + پیر

## 7- باب صحافت

739

حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

1- اخباری بیانات سے تراشے

740

موجودہ نظام

741

نفاذ اسلام

744

ارباب اقتدار

749

جماد

752

صحافت

755

مولوی

758

ادیب و شاعر

760

مترقات

- 762 امریکی - غارتخانے کے لئے ایک کمپنی ہارون الرشید
- 767 کوئی بتائے کوئی بھید کھولے ہارون الرشید
- 772 کچھ دیر کے لئے ہارون الرشید
- 776 تعبیر ہارون الرشید
- 779 شیخ المکرم ہارون الرشید
- 784 انقلاب اور تنظیم الاخوان کی جدوجہد قاضی خیاث الدین جانباذ
- 789 اسلام عملی زندگی کا نام ہے قاضی خیاث الدین جانباذ
- 792 میں وہی جانا جس کو راجنمن وہی گلزار آفاقی
- 798 مسمی رات اور فجر کی خبر دینے والے گلزار آفاقی
- 803 میرے پیاکھر آئے (۱) گلزار آفاقی
- 808 میرے پیاکھر آئے (۲) گلزار آفاقی
- 814 میرے پیاکھر آئے (۳) گلزار آفاقی
- 819 میرے پیاکھر آئے (۴) گلزار آفاقی
- 823 علماء کنونشن خورشید ندیم
- 827 باقی چاویہ چوہدری
- 831 جب میں نے تنظیم الاخوان سینئر محمد طارق چوہدری میں شمولیت اختیار کی
- 836 نیا نظام نیا امام ایم۔ ایم ادیب
- 840 لیاقت باغ کا آخری جلسہ ابن حسین علوی
- 844 نوید انقلاب غلام مصطفیٰ ملک
- 848 شک کے مارے ہوئے لوگو ٹکلیل پراچہ
- 853 شفا کی پڑیا بشری اعجاز



## 8- باب تمثال

1- کریم

861

## 9- باب مر اسلت

22 مختلف خطوط، نام

871

حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

## 10- باب عکس تحریر

1- حضرت مولانا اللہ یار خان

919

حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

2- منتخب کاام

924

## 11- من آمد

1- انکار سے اقرار تک

929

2- آسمان کے آئینل میں

963



شیر نام لیتے ہیں غنچے چڈکار  
 اکہ شیرت غنچوت کے گن قارہیہ  
 نرین پتے پتے کی اس عطر  
 اسی نام پر شاخ لہرا رہی ہے  
 اچھو کر عواٹنیوں شکر کی  
 شیرے نام کے زرخیز قارہیہ  
 یہی نام چاند کی چاندی میں  
 سکون دیکھتے کتنا بے سارہیہ

لفت

حسنِ فائز ہے تیرے روشن چہرے اور لبوں

پیرِ جمالِ باطنی کا خیرِ نشانی اور ہے

دلکشی ہے آنکھ لہر لہر کہیں در کو کہیں

دل نہ جو دکھایا ہے آئنا وہ کہانی اور ہے

بچتے ہیں دریا بہت شوریدہ سر جو جھیل کہیں نہیں

بھری جوت کی تیرے لپٹن روانی اور ہے

شیری طالت میں ہے لطفِ زندگی بیشک خیر

کھیت آگین لذتِ درِ نمانی اور ہے

## حرف آغاز

### الف 'ب' کا قاعدہ

میں جب سلسلہ عالیہ سے منسلک ہوئی تو 'تصوف' ذکر اذکار 'لطائف' مراقبات' شیخ اور آداب شیخ کیا ہیں۔

نہیں جانتی تھی 'مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آفس کی ریو الونگ چیئر پر بیٹھے ہوئے حضرت جی ذکر اور تبلیغ دین کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں؟ اور اگر کچھ کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟ میں تو مزے سے آتی تھی 'ذکر کیا' مسائل پر بات کی اور چلی گئی۔ اس کے علاوہ گرد و پیش میں کیا ہے؟ اس کی مجھے قطعاً خبر نہیں تھی 'اور نہ ہی میں نے خبر لینے کی کبھی کوشش کی۔ اور شاید بڑا عرصہ اسی بے خبری میں گزر جاتا 'اگر سالانہ اجتماع پر جانے کا اتفاق نہ ہوتا اور وہاں جا کر 'حضرت جی سے انٹرویو نہ لیتی تو 'اس انٹرویو کا حال میں نے کتاب میں شامل اپنے مضمون میں لکھ دیا ہے 'لہذا اب یہاں

اسے دہرائیں چاہتی۔

تصوف کے بارے میں ادب، فکشن اور تذکروں کے وسیلے سے جو کچھ مجھے تک پہنچا تھا۔ اس کے ذریعے اک پر اسرار اور تجسس سے بھرپور دنیا کا تصور ذہن کے پردے پر کھلتا تھا۔ ایسی دنیا جس میں کشف و کرامات کی رنگینیاں جا بجا بھری نظر آتی ہیں۔ مثلاً صوفیا کا پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا۔ چلتی ہواؤں کا رخ موڑ دینا۔ کھڑے کھڑے لوگوں کی تقدیر بدل دینا۔ نفس کو مارنے کی خاطر مہینوں کی فاقہ کشی میں تازہ دم رہنا۔ اور کھڑے کھڑے ماضی، حال اور مستقبل میں جھانک لینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس دنیا میں 'ضبط نفس'، 'عبادات'، 'شریعت'، 'طریقت'، 'عشق رسول' اور آداب شیخ کے موضوعات کم کم نظر آتے تھے۔ اور اُتر آتے بھی تھے تو اتنے پرکشش طریقے سے انہیں بتایا جاتا تھا کہ وہ بھی تصوف کی بوالعجبی کا حصہ نکلتے تھے اور انسان ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر آگے گزر جاتا تھا۔

ان کتابوں کے ذریعے جو تصوف مجھے تک پہنچا، اس میں سبز غلاموں، حجروں، خرقہ پوشوں، مجذوبوں اور مستوں کی نور میں گندھی، غائبانہات کے چھینے اڑاتی شخصیات کا ایسا ظلم تھا جو سانس روک لیتا تھا اور کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دیتا تھا بس دل چاہتا تھا کہیں سے کوئی ایسا فضا میں اڑنے، پانی پر دوڑنے، پل میں حاضر اور غائب ہو جانے والا سبز عمامے میں ملبوس 'نورانی چہرے والا' کرامات کے سانچے میں ڈھلا، اللہ والا مل جائے جو حق ہو کا نعرہ لگائے اور مجھے بھی ہستی سے الستگی کر دے۔ اک نظر میں کشف و کرامات سے مالا مال کر دے۔ پھر میں بھی دنیا کو پاؤں کی اک ٹھوکر سے اڑاؤں اور کسی قدیم تھانے سے آراستہ حجرے میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔ کھانے پینے کی فکر سے آزاد ہو جاؤں، سونے جاگنے کی مصیبت سے چھوٹ جاؤں، فاصلے، فاصلے نہ رہیں دنیا سمٹ کر میری چھٹکی کی اوٹ میں آجائے، سارے

حجاب ختم ہو جائیں اور حقیقت حال پیاز کے چمکوں کی طرح میری اک نگاہ سے  
ارتعاش شروع ہو جائے اور میں ظاہر و باطن کی حدوں کو پھاٹک کر ایک ہی جست میں  
ازل وابد کے بھید پالوں۔

بہت عرصہ ایسی صاحب کمال ہستی کی اندر ہی اندر تلاش رہی۔ جو کہ ظاہر ہے  
نہ ملنا تھی نہ ملی پھر اس کے نتیجے میں 'ما یوسی اور بے چینی کی ملی جلی کیفیت سے دو چار  
رہنے لگی' خدا سے تو کچھ نہ کچھ واقفیت تھی ہی، مگر اس تمام عرصہ میں سب سے بڑا  
نقصان جو ہوا وہ یہ تھا کہ آقائے دو جہاں علیہ السلام سے کوئی قلبی تعلق نہ پیدا ہو سکا۔  
بلکہ اُردو دانداری سے کموں تو یہ ٹھیک ہو گا کہ تھوڑی بہت نسبت جو باطنی حوالے  
سے ایک مسلمان کے دل میں ہوتی ہے، جو ہم میں اپنے جنیز کے ذریعے سے پہنچتی  
ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ میرا یقین تو ڈائریکٹ اللہ اور اس کے بعد  
گو ناموں صفات اور رنگارنگی رکھنے والے اہل کمال پر تھا۔ جو حیرتوں اور تجزوں میں  
پہلی ماورائی دنیا کا دروازہ ہم پر کھولتے تھے۔ جہاں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی  
جہاں سیر بالکل مفت تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا، مگر اس کے باوجود چونکہ درمیان میں سب سے اہم اور  
ضروری کڑی سب سے پہلا اور آخری حوالہ ہی گم تھا تو ذہن میں انتشار پیدا ہونا  
لازمی تھا۔ اسی لئے باتیں سوال بھنتی تھیں اور سوال مصیبت بن جاتے تھے۔ جواب  
کے لئے غائبات کے پھول بوٹوں اور حاشیوں سے جچی کتابوں سے رجوع کرتی تو  
وہاں سے کسبِ ثن کے علاوہ کچھ نہ ملتا۔ رب کی طرف پلٹتی تو درمیان سے حبیبِ خدا  
سے تعلق کی لازمی کڑی کی ناموجودگی کی وجہ سے منہ کی کھاتی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جھٹکھاٹ میں یہ تو سوچتی۔ مگر اس صورتحال کے اصل  
اسباب کیا ہیں ان پر کبھی غور نہ کیا۔

خدا کے رسولؐ کے ذکر کو میلا دوں، بزمِ نعت اور روزِ مرہ یول چال میں عادی نہ  
 دہرائی کافی سے زیادہ لگتا تھا۔ اس سے آگے بھی کچھ ہے یہ جاننے کی کبھی ضرورت  
 ہی محسوس نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ دل بجز ہوتا چلا گیا، اطمینان و یقین کا سبزہ و گل خشک  
 ہوتا گیا اور اندر اک بے مراد تلاش کا ذخیرہ لگتا گیا۔ سوال بڑھنے لگے اور سارے  
 جواب نہ ارد۔

ایسی ہی ناآسودہ باطنی کیفیات میں حضرت جی سے ملی۔ اور ذکرِ اللہ شروع کیا۔  
 ذکرِ اللہ کے بارے میں کستی چلوں کہ شیطان سے چنے کا آسان طریقہ ہے ذکر میں  
 اسماک ہو تو شیطان درمیان سے نکل جاتا ہے اور نفس کو کنٹرول کرنے کا بہترین  
 طریقہ ذکر میں گم ہو جاتا ہے۔

اور ذکر کیا ہے؟ اس کی یاد یاد بھی کس کی؟ اس پیارے کی جو پیاروں کا پیارا ہے  
 دلداروں کا دلدار ہے تو پھر جب اس کی یاد میں گم ہوئے تو نفس سے بچ گئے کیونکہ  
 نفس سے آپ یکتائی میں چتے ہیں یکسوئی میں چتے ہیں۔ پھر یہ ہوا..... پھر یہ ہوا کہ ان  
 سوالوں کے جواب مل گئے۔ جو میرے سینے کے خالی ڈھنڈار میں نین کی طرح چتے  
 رہتے تھے اور ان جوابوں میں روحانی باطنی اور دلی زندگی کی وہ حقیقی کڑی بھی مل گئی  
 جو گم تھی اور جس کا نہ ہونا ہی اصل مسئلہ تھا۔

عشقِ رسولؐ اتباعِ سنتِ رسولؐ اور فنا فی الرسولؐ۔ مسئلوں کے حل کی کلید باتحہ  
 لگ گئی۔ گرہیں کھلنے لگیں۔ اور گرہیں کھلیں تو پتہ چلا۔ حقیقت حال تو کچھ اور تھی۔  
 میں تو اک خوفناک غلط فہمی کے گرداب میں منہ کے بل گری ہوئی تھی۔ ایسی غلط فہمی  
 جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کتاب کو لکھنے کے دوران حضرت جی سے انٹرویوز  
 گاہے گاہے ہونے والی گفتگو، صاحبِ مجاز حضرات سے ملاقاتوں اور تصوف کی عملی  
 کتابوں سے جو رہنمائی ملی ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ تصوف



ما فوق الفطرت واقعات اور ترک دنیا کا نام نہیں۔ تصوف خانقاہی نظام کا نام نہیں۔ بلکہ تصوف خدمت اور عمل کا نام ہے پتہ چلا یہاں ہر شخص کو دلنے کے لئے مامور نہیں کیا گیا۔ بے شمار لوگوں کو نظارہ خاموشی سے دکھایا گیا۔ چپ کر دے نہیں دے لےنا آرام سے دیکھتے جاؤ۔

یہ سب نوادرات ہیں۔ اور ان نوادرات میں سے ہوتے ہوئے گزر جاؤ کچھ لوگوں کو دلنے کے لئے کما کر لاتے جاؤ اور خدمت عمل کے لئے کما کر کرتے جاؤ! اور یہ کہ تصوف سنبھالنے کا نہیں برتنے کا نام ہے، حجرے میں اکیلے بیٹھ کر متاعِ گراں کی طرح چھپا چھپا کر رکھنے کا نام نہیں۔ بانٹنے کا نام ہے۔ تصوف حسن عمل کا نام ہے مجھے تو یہی سمجھ آئی ہے۔

اور یہی اس کتاب کی غرض و غایت ہے۔ اک باعمل صوفی جو خدمت کی عظمت سے شراور ہو کر اک غامی کی طرح دنیا سے عمل سجائے بیٹھا ہے اس کی رودادِ عشق ہے۔

عشق حبیب جس کا خاصہ

عشق حقیقی جس کی پہچان ہے

اس باعمل صوفی کے حسن عمل کو غیر جانبداری اور پوری دیانتداری سے دکھانے اور بتانے کی کوشش کا نام یہ کتاب ہے۔ یہ دراصل اس شخصیت پر اہدائی کام ہے۔ اس لئے ہم اس کتاب کو بھی اہدائی کتاب کہیں گے اسے آپ اب کا قاعدہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تصوف کے اس زندہ متحرک اور فعال انسانی یوشن پر کام کا آغاز ہے۔ ایک ادنیٰ کوشش ہے عہد حاضر کے باعمل صوفی کی گونا گوں صفات کو معلوم کرنے کی۔ اس لئے حرف آغاز کو مکرر کہنا ہمارا مقصد نہیں۔ اسے آگے اور آگے لے کر جانا ہماری ضرورت ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں 'جو روحانی اور باطنی تجربات ہوئے' ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں، مگر ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ جب یہ کام مجھے سونپا گیا تو اس وقت یہ ناممکنات کی انتہائی شکل میں 'میرے سامنے تھا۔ اس لئے کہ مجھے اپنی تن آسانی کا بھی علم تھا اور کام کی نزاکت اور باریک بینی بھی میرے پیش نظر تھی۔ جیسا کہ شروع میں، میں نے کہا ہے میں کچھ نہیں جانتی تھی 'سلسلہ عالیہ' حضرت جی 'تصوف اور تعلیمات شریعہ کی اصل روح کے بارے میں۔ مجھے اپنے آپ کو دیئے ہوئے وقت کے اندر 'معلومات بھی اکٹھی کرنا تھیں' اور انہیں پوری صحت اور ذہب داری کے ساتھ ترتیب بھی دینا تھا۔ کہ شیخ المکرم اور سلسلہ عالیہ پر 'یہ پہلی باقاعدہ کتاب تھی۔ اس سلسلے میں مجھے رہنمائی کی ضرورت تھی جو بظنل تعالیٰ 'حبیب خدا آقائے دو جہان کی ہرکتوں کے طفیل اور جناب شیخ کی توجہ کے ذریعہ مجھے ملی اور مجھ سے یہ کام ہو گیا۔

جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔ کام کیا نہیں جاتا۔ لیا جاتا ہے 'اور میرا ایمان ہے کہ واقعی لیا جاتا ہے۔ ہم تو محض مزدور ہوتے ہیں اور یہ مزدوری کتنا بڑا اعزاز ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں جنہیں اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے۔

آخر میں سلسلہ عالیہ کے ان تمام خواتین و حضرات کا بطور خاص شکریہ ادا کرتا چاہتی ہوں۔ جنہوں نے کام کے دوران عملی اور قلبی دونوں طرح سے میرا ساتھ دیا۔ خدا انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ اس کتاب میں پڑھنے والوں کو جو بھی کینیاں اور خامیاں نظر آئیں انہیں میرے خلوص کے پس منظر میں دیکھئے اور یہ بات ذہن میں رکھئے گا کہ اس میں میری کسی شعوری یا اشعوری کوتاہی کا خدا نخواستہ دخل نہیں۔ ہاں اس کا باعث میری کم علمی ہو سکتی ہے۔

میں آپ کے مشوروں اور آراء کی منتظر رہوں گی۔ ہو سکتا ہے اس کتاب کا

دوسرے ایڈیشن یا ایک اور کتاب اس سے بہتر اور اچھی بن جائے۔  
 پڑھنے والوں سے درخواست ہے اپنی دعاؤں میں 'مجھے ٹاچیز کو یاد رکھیں کہ خدا  
 حسن خاتمہ کرے اور اپنے محبوب کی شفاعت میرا مقدر کرے! آمین  
 بشریٰ اعجاز

## کچھ اپنے بارے میں

اباجی کو ورنار کا علاقہ بہت پسند ہے۔ اس کا معتدل موسم کو ہستانی سلسلوں کے اندر چھپی ہوئی سرسبز وادیاں جو انسان پر ہانچک کے دوران قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کی طرح آشکار ہوتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی سادگی اور اخلاق۔ اس علاقے کا قدم قدم پر بکھرا ہوا نیچرل حسن اور اس کی بے شمار قرون صدیوں اور غمدوں پر پھیلی ہوئی تاریخ۔ یہی وجہ تھی کہ گرمیوں میں اکثر ہمیں لے کر وہ اس علاقے میں جایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے یاد ہے جب پہلی دفعہ ہم کلر کنار گئے تو وہاں لوکانوں کے سرسبز باغ کے اندر قدرتی میلوں پھولوں اور سرسبز شکوفوں سے ڈھکی ہوئی دیواروں والے ملک مہر خان کے پیلے رنگ کے گھر میں سامان اتار کر جب گھر کے اونچے نرس سے سامنے دیکھا، تو ایک ایسا منظر آنکھوں پر کھلا جو آج تک ہلکوں کے اندر محفوظ ہے۔

اب بھی یاد کروں تو جیسے آنکھ کے پردے پر ایک تصویر دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگتی ہے۔ ساحل نگاہ پھیلی ہوئی جھیل، جھیل میں دو درختوں کی طرح نظر آتی

کشتیاں، آس پاس خاموشی پر سکون پہاڑ، پہاڑوں کے درمیاں سیاہ لکیر کی طرح نظر آتی سڑک، سڑک پر بے فکری سے رواں دواں ٹریفک، ٹھٹھے کے غین نیچے سڑک پر چھوٹا سا بازار، بازار سے آگے جا جاہتے ہوئے چٹھے، گہری سبز خوشبودار میں دھلی پگھلے پگھلے کے قریب خاموشی کی اونگھ کو اپنے اندر سمیٹتا، شمس رانی کا مزار، مزار پر جلے آدھ جلے اوندھے اور سیدھے پڑے مٹی کے دیئے مزار کے پایوں کے ساتھ رنگ برنگے دھاگوں میں، مدھی، محبت کی بے شمار ادھوری کہانیاں اور آس پاس پھیلے سبزے کی اوٹ سے ڈھول بادشاہ، ڈھول بادشاہ کو کتا سنانا، اوپر آہو باہو سرکار کا مزار اور آس پاس اس خوبصورت زندہ منظر میں زندگی کی خوبصورت علامت کے طور پر جا جانظر آتے آہو باہو سرکار کے مور اور ان موروں کے چنگے تلاشتے لوگ۔

ملک مرخان کے ٹھگے کی پشت پر لوکاٹوں کے باغ کے بیچوں بیچ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی والی پکی مٹی جس کے کناروں پر بیٹھ کر سنیوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے معصوم بچے۔ یہاں سانپ بہت ہوتے ہیں کسی نے کہا، ہوئے پڑیں ہمیں کیا۔ سیلیوں کو ٹکوں سے چھینرتے ہوئے انہوں نے بے فکری سے کندھے اچکائے اور پکی مٹی کے اندر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے لگے، دن تو کھیلنے دیکھنے اور معلوم کرنے کی ایکسٹنٹ میں گزر گیا۔ شام پڑی تو نجانے کن پھولوں کیاریوں باغوں پتوں اور شاخوں سے مچھروں کی فوجیں مدھم مدھم ہوئیں اور نیرس پر ٹھنڈی ہوا اور دلکش مٹکوں کو انجوائے کرتے مسافروں پر حملہ آور ہو گئیں۔ رات کانوں میں ساؤن جاتے اور جسم پر سونیاں چھبوتے مچھروں کے ساتھ فائٹ (Fight) میں گزری، اور اگلی صبح لہاجی نے چکوال سے بہت سی مچھرواںیاں منگوالیں۔ یہ جگہ ہے تو بہت خوبصورت مگر مچھروں کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے۔ آج مچھرواںیاں آگئی ہیں مجھے امید ہے اب مچھروں سے چھاؤ ہو جائے گا۔ لہاجی نے

ہمارے چہروں پر جا بجا الال رنگ کے سوئیاں چہنچہنے جیسے چھوٹے چھوٹے نشانات دیکھ کر کہا، مگر ہمیں اس وقت گزری رات کے بارے میں کچھ بھی یاد نہ تھا کہ ہمارے اس دن کے پروگرام میں سامنے ریڈار والی پہاڑی پر چڑھنا، نیچے ناشپاتیوں کے باغ سے ناشپاتیاں چرانا، موروں کے ہلکے تالا شن اور شمس رانی کے مزار پر دیا جانے جیسے اہم کام شامل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ دور سے قریب اور معمولی اونچائی پر نظر آنے والی پہاڑیوں کے نزدیک پہنچے تو گردنیں اٹھا کر دیکھنے ہی میں ہم میں سے اکثریت کی بہت جواب دے گئی۔ ارے یہ تو بہت اونچی ہے اور ریڈار جو دور سے ہاتھ بھر کے فاصلے پر نظر آتا تھا بہت اونچا ہے تو بہ سب کی خاموش رائے تھی۔ تو پھر کیا کیا جائے، پھر کبھی سہی آج کا کام کبھی نہ آنے والی کل پر ہال کر ہم واپس ہوئے۔

ناشپاتیوں کے باغ سے ناشپاتیاں چرانے والا عظیم کام بھی ہم سے نہ ہو سکا کہ باغ کار کھولا اتفاق سے اسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے ہم اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔ اس نے شاید ہمارے مذموم ارادے بھانپ لئے تھے۔ اسی لئے اس نے ہمیں وہاں سے ڈانٹ کر بھٹکادیا اور خود ہاتھ میں پکڑے ہوئے مونے لکڑی کے ڈنڈے کو خواہ مخواہ ہوا میں گھمانے لگا۔ ہاں البتہ اس روز کی ناکامی کی ساری کسر ہم نے شمس رانی کے مزار پر آکر نکالی، پہلے تو قریبی چشمے سے ڈول بھر کر پانی لائے اور مزار کو رگڑ رگڑ کر دھویا۔ پھر دیوں کو صاف پانی سے کوچ مانجھ کر صاف کیا اور انہیں تیل سے بھر کر جلایا۔ اور شام ڈھلے واپس بیٹھے میں آگئے۔ رات مجھردانیوں کے اندر مجھردانیوں کے خفیہ راستے سے گھس آئے اور انہوں نے کاٹ کاٹ کر ہماری درگت بنادی۔ صبح ہمارے..... چہروں کے نشانات میں نمایاں اضافہ دیکھ کر لاجی نے کھڑکھار ٹھہرنے کا ارادہ ترک کیا۔

اور وہاں سے کچھ دور میانی اڈا کے قریب ایک پہاڑی گاؤں سردھی جانے کی

تجویز پیش کی۔ گاؤں سے ہٹ کر وہاں ایک انگریز میم کا بڑا خوبصورت منگہ ہے جس کے پیچھے پانی کا بہت بڑا تالاب ہے چاروں طرف پہاڑ ہیں اور منگہ پہاڑوں کے درمیان کے بالکل سامنے ہے۔ نیچے وادیاں اور چشمے ہیں۔ اس جگہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور پتھر مکھی ہام کی کسی چیز کا وہاں وجود نہیں۔ یوں تو ہمیں کلر کنار بہت بھایا تھا خاص طور سے اس کی حد نظر تک پھیلی ہوئی جھیل 'ریڈ اروال' اور اچھی پہاڑی 'لوکاٹوں کے باغ' شمس رانی کا مزار مور سیلیں اور ناشپاتیوں کے ہرے پھرے درختوں پر سبز پتوں کی اوٹ سے جھانکتی رہیں بھری مزے دار ناشپاتیاں مگر پتھروں نے خاصا درد کر دیا تھا اور پھر بابا جی نے اس نئی جگہ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا تھا کہ ہم سب کلر کنار کے بے شمار جاناہات چھوڑ کر سردھی جانے کے لئے جی جان سے تیار ہو گئے۔

سردھی میں گو کلر کنار جیسی رونق اور ایک دم سے متوجہ کر کے ساکت کر دینے والا حسن نہیں تھا۔ مگر پہاڑ کے دامن کے نشیب و فراز میں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے اس گاؤں کے آس پاس خشک پہاڑی ٹیلوں کچی بے آباد سڑک 'گدلے پانی والے تالاب' اور سادہ رکھ رکھاؤ والے لوگوں کے برتاؤ میں کچھ ایسا کھینچ لینے والا خلوص تھا جو حسن منور کی طرح آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے دیکھنے والی آنکھوں اور محسوس کرنے والے دلوں پر کھلتا تھا تو پھر کھلتا ہی چلا جاتا تھا۔ یوں کہ پھر اس کو چھوڑنا اور بھاگنا ممکن نہیں رہتا تھا۔

وہ منگہ جس کا عقبی حصہ منہدم ہو چکا تھا کسی انگریز خاتون نے بھالایا تھا۔ کس نے اور کب؟ یہ ٹھیک طرح معلوم نہ ہو سکا اس لئے کہ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایتیں ایک دوسرے سے خاصی متضاد تھیں اس لئے یہاں ان کا ذکر ضروری نہیں ہے، اس منگہ کا فرنٹ پورٹن اچھی حالت میں تھا اور اس کے کمروں میں پٹ بن کے ریشے سے

نے Under Lay کے اوپر خوب صورت ڈیزائنوں میں بہت اچھے دھماکے سے بنی موٹی موٹی دریاں بھی تھیں۔ بھاری شاندار فرنیچر چھتوں کے ساتھ مہلے لوہے کے کندوں سے سوت کے رسوں کے ساتھ بندھے ہاتھ سے کھینچنے والے کپڑے کے پچھے Johnsons and Brother's کی ہارک نفیس 24 Karat گولڈ کے کام والی کراکری، مہانگی کی بھاری ڈائمنڈ فیمل اور پرانے حماموں کی طرز کے غسل خانے دیکھ کر ہمیں لگا کہ ہم وکٹوریہ میں کسی انتہائی پراسرار پر تجسس اور عظیم کمائی کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گئے ہوں۔ جہاں بڑی بڑی کھڑکیوں کی رنگ خوردہ جالیوں سے سامنے پہاڑی ورے سے آنے والی تند ہوا ٹکراتی تو عجیب قسم کی گونج پیدا ہوتی جو خاصی دیر کمرے کی دیواروں کے اندر ایک تسلسل سے بجھتی رہتی، سوت کے ریشوں سے بنے Under lay اور موٹی پرنٹڈ دری کو بھی ہوا کا ارتعاش کچھ یوں جگا دیتا کہ وہ اس آواز میں شامل ہو جاتی، ہم رات کھڑکیاں بند کرنے کھولنے اور دری کے کناروں پر بھاری چیزیں مٹا کر سیاں اور سنول وغیرہ رکھنے میں گزار دیتے۔ امی جی بار بار: بس کھڑکیوں کے پٹ بند کر کے آرام سے سو جانے کی تلقین کرتیں مگر ہم ان دنوں اک ایسی عجیب ایکسانٹ سے گزر رہے تھے جہاں زیادہ سے زیادہ ہے آرام ہو کر سکون ملتا ہے اور ویسے بھی ہوا کے ساتھ آنکھ پھولی کا وہ تجربہ کچھ اتنا نوکھا اور مزیدار تھا کہ اسے چھوڑا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

وہاں اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں ایسی تھیں جو ہمیں بے پناہ fascinate کرتی تھیں۔ ہمارے بیٹے سے کچھ آگے ہو چھال گاؤں کی طرف "لون بنگلہ" جو سردی والے بیٹے کی کاپی تھا جس کی طرف جانے سے ہمیں سب نے ڈر دیا تھا کہ وہ سانپوں کا مسکن ہے۔ یعنی وہاں کے بے آباد کمروں میں ہر طرف سانپ ہی سانپ



سر سراتے رہتے ہیں اور سانپ ایسی چیز ہے جس سے آج بھی کل بھی اور ماضی میں بھی ہماری جان جاتی تھی۔ لہذا اس بچے سے ایک مناسب فاصلے پر کھڑے ہو کر ہم اسے حسرت سے دیکھنے کے علاوہ کبھی بھی کچھ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ ایک خاص چیز سر دھمی سے ملی الصبح چکوال کے لئے چلنے والی کھنارہ بس تھی جس کے ذریعے ہم اخبار نامشتے کی چیزیں، کیرے کی فلیس، کولڈ ڈرنکس، پھل، دوسرا روز مرہ کا سامان اور کتابیں وغیرہ منگوا کرتے تھے۔ وہ بس صبح سر دھمی سے چلتی اور شام ڈھلے جب واپس پہنچتی تو ہم کچی گرد آلود سڑک کے کنارے کھڑے بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے ہوتے تو بس اس دور افتادہ خاموش پہاڑی گاؤں کی ٹھہری ہوئی زندگی میں حرکت اور رابطے کا واحد ذریعہ تھی جس سے صبح شام کے کچھ پل وہاں کا ماحول خاصا بدل جاتا تھا۔

بچے کے آدھے سے زیادہ منہم ہو جانے والے سرونٹ کو انرز کے باقی شدہ حصے میں خان محمد چوکیدار اپنے اہل و عیال کے ہمراہ رہتا تھا۔ جس کی جیب میں موٹی موٹی لوہے کی چابیوں کا گچھا کھنکھاتا رہتا تھا۔ جو بچے کے منہم ہو جانے والے حصے سے لے کر پتہ حصے ڈائمنگ ہال کی Antique کراکری والی شیشم کی الماری اور ان مختلف الماریوں کے تالوں کی تمیں جن کا وجود تک اس وقت نظر نہیں آتا تھا۔ مگر خان محمد تھا کہ چابیوں کا گچھا ہمہ وقت جیب میں ڈالے انہیں ٹوٹا رہتا تھا کہ ان میں سے کوئی چابی کیس ادھر ادھر تو نہیں ہو گئی۔

سفید سر، جھریوں بھری لنگی ہوئی جلد ڈھلکے ہوئے پوٹوں، پیوند زدہ کپڑوں اور ہندو لے کی طرح گھومتے ہوئے سر والی بڑھی مائی مستور اس بھی سر دھمی کا بہت اہم حصہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی موٹی انٹھی ہوتی تھی۔ جس کے سہارے وہ ہمہ وقت گاؤں میں گھومتی رہتی تھی۔ بچے میں ای جی کے پاس دن میں اس کے دو



تین چدر ضرور لگتے تھے ای ہلاتی تھیں۔ بہت دیکھی خاتون ہے اسکے آگے پیچھے کوئی نہیں، مگر عجیب بات تھی کہ میں نے اسے جب بھی دیکھا روتے ہوئے دیکھا مگر کسی اپنے دکھ پر نہیں اہل بیت کو۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک ہی نوحہ تر پتار ہوتا تھا۔ "حی حسن، حسین کے صبروں کا صدقہ" یہ کہتے کہتے جیسے پورے کا پورا کر بلا اس کے اوپر سے گزر جاتا عجیب ان دیکھے دکھ سے اسکا وجود تڑپنے لگتا اور اس کی میلی گدلی آنکھیں نمکین پانی سے کچھ یوں بھر جاتیں کہ بعد میں وہ پانی اس کے چہرے پر کھدی لکیروں سے کتنی کتنی دیر پوشیدہ پہاڑی چشموں کی طرح قطرہ قطرہ رستار بتا اور وہ اپنے ملتے ہوئے سر کو فصرانے کی کوشش میں مزید ہلاتے ہوئے اپنی بچھی چادر سے اس پانی کو خشک کرنے میں بے حال ہوتی رہتی۔

مجھے کے نشیب میں دو تین فرلانگ پر کنویں تھے جہاں سے تازہ سبزی اور صاف پانی مجھے میں آتا تھا۔ وہاں کا ماشکی آمدے کے سامنے اونچے چبوتروں پر رکھے گھڑوں کی قطار میں صبح و شام کنوئیں کا ٹھنڈا میٹھا پانی باقاعدگی سے بھرتا تھا اس کے بعد وہ غسل خانے کے زنگ اور سیلن سے کالے سرخی مائل میڑھے میڑھے ہو جانے والے لوہے کے ٹیوں میں پانی بھر تا اور اپنا گدھا بٹکا تا سامنے درے کے قریب اپنے مکان کی طرف چلا جاتا۔

سر شام ہم سب بہن بھائیوں کی چار پائیاں آمدے کے سامنے اونچے چبوترے پر بٹھ جاتیں۔ ملازمہ سانپ بھگانے والی گولائی دہکا کر آمدے میں رکھ دیتی، سامنے صحن میں پرانے پتیل کے درخت کے نیچے ابا جان کا پلنگ بٹھ جاتا۔ اسی جان کو سانپوں کا وہم تھا وہ ہمیں شام کے بعد چار پائیوں سے نیچے اترنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ مگر ہم تھے کہ بہانے بہانے سے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے تھے۔ رات پڑتی تو ہوا مزید تیز ہو جاتی پتیل کے پتے زور زور سے تالیاں جانے لگتے۔ سامنے گاؤں کے

آوارہ کتے مل کر ڈاؤنی آوازوں میں رونے لگتے اور میں اندیکھے سانپ کے خوف سے  
 بستر کی سفید چادر کو بار بار سمیٹتے ہوئے کھیس کو اپنے گرد لپیٹ کر مکینے میں منہ چھپالیتی  
 ایسے میں لاجی کے گاہے بگاہے کھنکھارنے کی آوازیں ڈھارس بندھ جاتیں اور انہیں  
 سنتے ہوئے میں سگری سٹی سو جاتی۔ مگھہ، مگھہ کے سامنے پہاڑی درہ اس سے شرشر  
 بہہ کر آنے والی کنواری ہوا، پتیل کے تالیاں جاتے سبز چمکیلے پتے مگھہ کے عقب  
 میں گدے پانی والا تالاب (جہاں انسان اور حیوان ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے بلکہ  
 نہاتے دھوتے بھی تھے)۔

تالاب کے قریب سے گزرتی کچی سڑک جس پر صبح شام کھڑکی ہوئی چوہوں  
 والی دھواں چھوڑتی بس چلا کرتی تھی، سڑک پر آگے جا کر یہ چھال اور میانی اڈا، میانی  
 اڈے سے قریب ہی نور پور سیتھی اور منارہ۔ و نہار کے مشہور گاؤں۔ کسے معلوم کون  
 جانتا تھا۔ کہ تہذیبی اور جغرافیائی لحاظ سے اس قدیم ترین علاقے میں جہاں کی  
 زمینیں بارانی ہیں۔ جہاں قلت آب نے زندگی مشکل ہی نہیں پر مشقت بھی بنا رکھی  
 ہے جہاں بارشوں کے پانی کو نشیبی گڑھوں میں جمع کر کے اس سے ضروریات زندگی  
 پوری کی جاتی ہیں۔ جہاں کوہستان نمک کے دور دراز پھیلے اس پہاڑی سلسلے میں بے  
 شمار معدنیات کے خزانے موجود ہونے کے باوجود یہاں کے لوگ آج بھی اپنے ہی  
 پسینے کو گلاب بنانے کی کوشش میں خاک ہوئے جاتے ہیں۔

کون جانتا تھا، کسے معلوم تھا کہ کبھی منارہ، ڈھوک ٹلیالہ اور سیتھی کی زمینوں پر  
 ”اللہ حق“ کی نوبت کچھ یوں باجے گی کہ اک عالم گوش بر آواز ہو جائے گا۔ کون جانتا  
 تھا کہ کبھی ان بے سرو سامان خشک بھوری زمینوں پر دارالعرفان جیسا حق کا مرکز  
 کھلے گا اور پھر چہار جانب حق کی دھوم مچ جائے گی۔

.....میں جو اپنے چھین اور شعور کا کافی حصہ انہی زمینوں مکانوں اور

کینوں میں گزرتی رہی، وہیں، کھر کھار، میانی اڈا، سردھی، پوچھال، نور پور، سیٹھی اور منارہ کے ارد گرد منڈلاتی رہی، انہی زمینوں میں حیرتوں کو کاٹتی اور بڑھتی رہی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ان پھڑی ہوئی ماں کی محبت جیسی زمینوں سے دوبارہ ملاقات بھی ہوگی اور اس رنگ میں ہوگی۔ علاقہ و منارہ سے اپنے قلبی تعلق کے حوالے سے چند باتیں، صرف اسلئے کی ہیں کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو، اس کتاب کو لکھنے کے دوران میں جن کیفیات سے دوچار رہی۔ ان کی جڑیں میرے اندر کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جوں جوں ان کے قریب گئی ہوں، انہیں گہرا اور مزید گہرا پایا ہے۔ اس گہرائی کے انت سرے پر (اگر کوئی انت سرا ہے تو) میرے چہن کی محبتیں، شرارتیں، رفاقتیں اور حیرتیں، آج بھی میری منتظر ہیں، مگر اس سلسلہ روز و شب سے نکلوں تو دیکھوں۔

منارہ، دارالعرفان اور سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ، رابطے کی وہ کڑیاں ہیں، جنہوں نے اس گمشدہ حصے سے دوبارہ جوڑ دیا ہے۔ یعنی زندگی کا وہ باب جو یادوں کے نماں خانے میں گم تھا، جس پر وقت کی بے حساب گرد پڑ چکی تھی۔ اس باب کو اس روحانی تعلق نے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ کہ اب مجھے چہن کی یادوں کا کوئی بھی حوالہ اجنبی نہیں لگتا۔ یعنی اب اگر خود کو دیکھنا چاہوں تو پہلے کی طرح صرف دھول مٹی اور گرد و غبار ہی نظر نہیں آتا، اس میں سے ایک مٹے ہوئے رنگوں والا خاکہ بھی گاہے گاہے جھانکتا ہے۔

حضرت جی کے تعارفی مضمون کا پیڑن، شاید پڑھنے والوں کو تھوڑا مختلف لگے، کیونکہ اس میں کہیں، میانہ، لہجہ ہے، کہیں واقعاتی انداز ہے اور کہیں شخصیت کے اپنے الفاظ میں احوال حال بتایا گیا ہے، یہ ضروری تھا۔ اس لئے کہ اس مضمون کی تیاری میں جو بھی معلومات میں نے اکٹھی کیں، وہ مختلف ذرائع سے مجھے ملیں۔ یعنی کچھ

باتیں حضرت جی سے گفتگو کے ذریعے معلوم ہوئیں۔ کچھ ان کے انٹرویوز (جو مختلف اخبارات و رسائل میں گاہے بگاہے چھپتے رہتے ہیں) سے حاصل ہوئی ہیں اور کچھ معلومات ان کے مختلف ساتھیوں کے ذریعے سے مجھ تک پہنچیں<sup>۱</sup> اب ان کو اک تسلسل میں بیان کرنا تھا، جو خاصا مشکل تھا۔ اس لحاظ سے کہ کوئی اہم بات رہ نہ جائے اور پاس ادب بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے تو کوشش کی ہے، اس لئے کہ کوشش ہی کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ملٹی ڈائنمنشن والی اس شخصیت کو کسی ایک حوالے یا ایک انداز سے دیکھا جاسکتا۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ عکس در عکس، سطح در سطح، زاویہ در زاویہ، اتنے رنگ ہیں کہ انہیں یکجا کرنا ممکن ہی نہیں۔

پھر مروجہ قواعد و ضوابط کا ذکر کیا۔ پھر بات جیسے بھی ہو، جہاں سے بھی ہو، گھوم پھر کر دیں آجائے گی۔ ایسے میں انداز میاں کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ہاں واقعات کی صحت اور درستی بہت ضروری ہے۔ جس کا ممکن حد تک خیال رکھا ہے۔ باقی اللہ کی اللہ جانے۔

## ”ذوالقرنین“

”ایک شخص جس نے دو صدیوں کو متاثر کیا“

علاقہ و نمار کو ہستان نمک کے تقریباً درمیان جہلم سے شروع ہو کر کالا باغ تک جاتا ہے۔ ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پلاٹو ہے۔ جس میں تقریباً بیس گاؤں آباد ہیں۔ اس کے مشرق میں دھن، شمال میں علاقہ پکھڑ، مغرب میں سون، جنوب میں تھل اور جنوب مشرق میں علاقہ کہون ہے۔

چکوال سے خوشاب جاتے ہوئے بل کھاتی لہراتی سڑک پر بلندیاں چڑھتے آئیں تو مشہور جھیل اور باغات سے مزین کلر کمار ہے۔ اوپر آئیں تو چھت پر علاقہ و نہار شروع ہو جاتا ہے جس کا آخری گاؤں منارہ ہے۔ منارہ سے اترائی شروع ہو کر پہاڑوں سے نیچے نخل میں موضع کٹھہ جا کر ختم ہوتی ہے۔

اس سارے علاقہ میں اعوان آباد ہیں۔ جو شمال کے حملہ آوروں کے ساتھ یہاں آئے۔ اعوان حضرت علی کی اولاد ہیں۔ افغانستان اور وسطی ایشیا میں ان کے اجداد بس گئے تھے۔ پھر محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے اور ان علاقوں میں مضبوط قلعے اور چوکیاں بنائیں جن کے آثار ابھی تک ملتے ہیں۔ اس علاقے کے اعوانوں کے اجداد یہاں شاہی امراء تھے۔ جو بعد میں اپنے علاقے اور پھر گاؤں کے حاکم رہے۔ انگریز کے آنے پر یہ حیثیت بدلی اس سے پہلے سکھوں کے ساتھ لڑائی میں بہت سے شہید ہو گئے۔ بلکہ سکھوں کے قبضے کے دوران بھی ان کی چھاپہ مار لڑائیاں جاری رہیں جن کے قصے آج بھی مشہور ہیں۔

انگریزی عہد میں یہاں کے عام لوگوں نے فوج کی نوکری کا رخ کیا اور آج تک



ان کی اکثریت فوج کی ملازمت میں ہے۔ اب کچھ لوگ کاروبار اور تعلیم کے شعبوں میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ کچھ کار جہان سول اداروں کی طرف بھی ہو گیا ہے۔ مگر بنیادی طور پر چونکہ یہ علاقہ بارانی ہے اور ہمیشہ قلت آب کا شکار رہتا ہے۔ اس لئے یہاں کھیتی باڑی پر گزر اوقات مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اسی لئے کاشتکاری کو یہاں پٹھے کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کا اب بھی رجحان فوج میں جانے کا ہی ہے۔ اب چند صاحب ثروت لوگوں نے ٹیوب ویل لگوا لئے ہیں۔ مگر ایک تو وہ طریقہ آب رسانی بہت مہنگا ہے اور دوسرا ہر کسی کے حصول میں نہیں۔ تو اب بھی مسائل وہی ہیں جو ہمیشہ تھے یعنی نام آدمی غریب ہے تعلیم سے لے کر حق و انصاف تک اس کی رسائی آج بھی مشکل ہے۔

انگریز کے زمانے میں دو چار قوموں کو مارشل اتوام کہا جاتا تھا۔ ان میں اعوان قوم بھی شامل تھی۔ اسلئے کہ شاید ان کے پاس فوجی ملازمت کے علاوہ اور کوئی پیشہ ہی نہ تھا۔ ان علاقوں میں زمینداریاں کوئی خاص بڑی نہیں تھیں۔ کاروبار پر ہندوؤں کا قبضہ ہوا کرتا تھا یہاں سب سے بڑا کام یہی تھا کہ لوگ فوج میں ملازم ہو جائیں۔

ملک محمد اکرم اعوان کا فیملی ایک گراؤنڈ بھی فوجی ہے۔ ان کے خاندان کے تقریباً سارے ہی لوگ فوج میں تھے۔ سیکھتی گاؤں سے ذرا ہٹ کر پہاڑی کے اوپر ڈھوک عمیالہ نامی ایک چھوٹا سا ڈیرا ہے جہاں ۳۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کو ملک فیروز خان اعوان کے گھر وہ چہ پیدا ہوا۔ جس نے آگے چل کر نہ صرف خاندان اور علاقے کا نام روشن کرنا تھا بلکہ اس نے روحانی قلبی اور اخلاقی لحاظ سے بھی اپنے عہد کو ایک خاص حوالہ نام اور شناخت دینا تھی۔

اس بچے کے دادا حکیم عباس خان اولیٰ ذوق کے حامل تھے۔ دینی علوم سے بھی خاصا لگاؤ تھا انہیں 'آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے علم طب حاصل کیا اور

علاقہ میں طبیب کی حیثیت سے حکیم عباس خان کے نام سے معروف ہوئے۔ اور ان کی پیشین مرزا خان بھی آری سے ریٹائرڈ تھے انہیں متعدد زبانوں پر دسترس حاصل تھی اردو پنجابی پشتو عربی فارسی اور انگریزی زبانوں کے مانے ہوئے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔ جنگ میں زخمی ہوئے اور جگمگے۔ پنشن کے بعد انہوں نے اپنے گاؤں بیکھی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اپنی مردہاری تجربے اور فہم و فراست کی وجہ سے خاندان بھر میں ان کا نمایاں مقام تھا۔

ملک فیروز خان اعران کے تین اور بھائی تھے۔ صرف ایک نے فوج میں ملازمت نہیں کی وہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے باقی دونوں بھائی فوج میں ملازم تھے جن میں سے ایک برما کے محاذ پر ۱۹۳۲ء میں مارے گئے۔

پہلے دو سال اس بچے نے شیر مادر پیا۔ جو والدہ نے ہمیشہ با وضو ہو کر پالایا۔ ملک فیروز خان اعران چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اسلئے ان کے گھر میں پیدا ہونے والا پہلو غمی کا چہ گھر بھر کے لئے باعث توجہ تھا۔

دادا نے پہلے پہلے پوتے کے لئے بڑے شوق سے ساتھ کے گاؤں جھامروہ سے شیردار بھیس پور سے بیاسی روپے میں خریدی اس زمانے میں چونکہ چیزوں کے نرخ بہت ارزاں تھے اور روپیہ کیاب تھا اس لئے یہ رقم خاصی بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ اس دور میں چونکہ دیہات میں چینی کی جگہ گڑ استعمال ہوتا تھا اور سب سے اعلیٰ گڑ یعنی چاقو گڑ ایک روپے کا سترہ سیر آتا تھا۔ گندم ایک روپے کی تیس سیر تھی اور دیسی گھی دو آنے کا سیر ہوا کرتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر دودھ مانگنے سے مل جایا کرتا تھا اسلئے ان دنوں دودھ بچے کا دیہات میں کوئی Concept ہی نہیں تھا دیہے بھی وہ زمانہ مہمان نوازی کے لحاظ سے یادگار زمانہ تھا جب مہمان کو دعائیں مانگ کر بلایا جاتا تھا اور بعد اصرار ٹھہرایا جاتا تھا۔

ڈھوک میالہ سے سیکھی کا فاصلہ تقریباً دو میل تھا۔ اور سارا راستہ ناہموار اور  
دشوار گزار پہاڑی سے ہو کر گزرتا تھا۔ ان کا چھین گاؤں اور ڈیرے پر آنے جانے میں  
بھر ہوا۔ پہاڑی راستوں پر چلنا مگر نا اٹھنا کبھی گھوڑی پر بابا منکا (پرانا ملازم) کے ساتھ  
اور کبھی والد والدہ کے ساتھ۔

اس دور کی یادوں میں ایک یاد بڑی نمایاں ہے۔ ایک دفعہ والد والدہ کے ہمراہ  
ڈیرے سے گاؤں واپس جاتے ہوئے راستے میں بارش آگئی۔ وہاں ان کی اپنی زمینیں  
تھیں جہاں بارش کے پانی کو روکنے کے لئے مہ باندھے گئے تھے۔ اس روز اتنی بارش  
ہوئی کہ چشم زدن میں سارے کھیت تالاب بن گئے۔ ایک کھیت کی منڈیر پر ایک  
چھتری دار درخت کے نیچے بیٹھ کر انہوں نے ساری بارش گزاری۔ جب خوب پانی  
جمع ہو گیا اور بارش رک گئی تو وہ تھوڑی دور پانی میں گیا اور واپس آیا تو بڑا خوش تھا کہ  
بہت بہادری دکھائی۔ والد نے کہا نہیں تھوڑا اور آگے جاؤ تب بات بنے گی۔ وہ تھوڑا  
اور آگے چلا گیا تو انہوں نے کہا وہ سامنے ایک تنکا سیدھا کھڑا ہے اسے ہاتھ لگا کر آؤ  
تو ہائیں وہ جوش میں اس تنکے کی طرف بڑھنے لگا آگے گہرائی زیادہ تھی۔ اس لئے  
اس کو غوطے آنے لگے اور پھر اس سے آگے کچھ یاد نہیں رہا ہوش آیا تو درخت کے  
نیچے لیٹا تھا اور والد والدہ ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اور بہت  
گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ جگہ اس پچے کو اب بھی یاد ہے اسی لئے اس راستے سے  
گزرتے ہوئے اس کی نگاہ اس مقام پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ جہاں اب نہ تو چھتری دار  
درخت ہے نہ پانی۔ مگر دل کے مقام پر کہیں ایک ہلکی سے جھمن کا احساس ضرور باقی  
ہے جو ہمیشہ چھن کے حوالے سے کہیں نہ کہیں رہ جاتی ہے۔

(حضرت جی فرماتے ہیں)

”مجھے وہ دن یاد ہیں“

جب ہماری سکول میں داخلے کی باری تھی نور پور نزدیکی گاؤں تھا۔ جہاں اڈل سکول تھا اور سیکھی میں برانچ تھی۔ یعنی پہلی اور دوسری جماعت وہاں پڑھائی جاتی تھی۔ سکول کی باقاعدہ کوئی عمارت نہ تھی۔

لوگوں کے خالی گھر ہی مدرسہ ہوا کرتے تھے۔ جو مل گیا۔ وہاں بچے جمع کر لئے۔ ہمارے محلے میں ماسٹر صاحب تھے۔ جن کا پوتا ساقی اور سفید گیزی پر طرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک اکلوتی کرسی مدرسے کا اثاثہ تھا۔ جو غالباً دو گھروں میں منتقل ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے تقسیم ملک تک یہی حال رہا اس کے بعد متروکہ دھرم شالہ پر انٹری سکول بنا جو ابھی تک چل رہا ہے۔

تیسری جماعت میں نور پور آنا پڑا پانچ سال کی عمر میں سکول داخل ہوا۔ تیسری میں آٹھ سال کا تھا اور جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا لوگ اکثر فوج میں ملازمت کرتے تھے۔ مانا جان فوج میں تھے۔ دادا جان پہلی جنگ عظیم کے سابق فوجی تھے۔ والد چچا ماموں سب فوجی تھے۔ ۴۲ء میں چچا کی تار آئی۔ فوجی جو جنگ میں مارا جاتا اس کے گھر سرکار کی طرف سے بذریعہ ٹیلی گرام اطلاع دی جاتی جسے کہا جاتا تھا ان کی مدد آئی ہے یعنی مارا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلی گرام کا ابھی تک آنا خیریت تصور نہیں ہوتا۔

چچا جان پنجاب رجمنٹ کے افسر تھے۔ برما میں دریائے ایراوتی کو عبور کرنا پنجاب رجمنٹ کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے پار جاپانیوں کے پختہ بھر تھے۔ مگر پنجاب رجمنٹ نے وہ علاقہ دریا عبور کر کے چھین لیا رات کو بھر میں گولا پھٹا۔ چچا اور ان کا اردلی جو پاس کے گاؤں کا تھا مارے گئے۔ میں سکول کی مارنگ اسمبلی میں کھڑا تھا کہ استاد نے تار تھما کر کہا گھر لے جاؤ۔ کچھ عرصہ پہلے چچا چھٹی آئے تو ان کی شادی ہوئی تھی۔ ایک روز میں گاؤں سے ڈیرہ پر ان کے ساتھ جا رہا تھا ایک جگہ اترائی پر میں نے دوڑ لگائی اور گر گیا۔ میرے ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھے۔ چچا نے اٹھایا اور

سمجھایا کہ اگر پرندے کے پر باندھ دیں تو گر پڑے گا۔ اسی طرح انسان کے ہاتھ بندھے ہوں تو وہ گر پڑتا ہے۔ میں رونا بھول کر اس فلسفے کو سوچنے لگا۔ جو آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس دوران مجھے یہ یاد نہ رہا کہ میں ابھی ابھی گرا تھا اور آنکھیں ابھی بھی آنسوؤں سے گیلی ہیں۔ چچا شادی کے بعد واپس چلے گئے اور برما کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ان کی بیوہ نے ساری عمر ان کی یاد میں گزار دی۔

ایک ماموں جنگ عظیم میں کام آئے مجھے یاد ہے بہت خوبصورت اور دراز قد جوان تھے۔ تانا جان دونوں عالمی جنگوں میں شریک رہے 'والد صاحب جنگ عظیم میں مل ایسٹ میں رہے۔ جہاں رو میل اور منگمری میں معرکے ہوئے۔

کچھ اقدار فہمیز اور ٹرائیز کی جو ہوتی ہیں 'وہ ہمارے گاؤں میں بہت سخت تھیں۔ مثلاً کوئی لڑکی سر عام کلی میں بلا مقصد نہیں جائے گی۔ کوئی نوجوان لڑکا کلی سے پگڑی کے بغیر نہیں گزرے گا۔ آوارہ لڑکے کلی میں نہیں بیٹھیں گے۔ خصوصاً اس وقت جب عورتیں کنوئیں یا تالاب سے پانی لینے جاتی تھیں۔ کوئی ایک محلے سے دوسرے محلے بلا مقصد نہیں جائے گا۔ سودا لینے اگر دوکان پر بھی جانا ہے تو پگڑی باندھ کر جائے گا۔

وہ زمانہ کچھ اتنا سادہ تھا کہ ہم عمر لڑکے لڑکیاں رات کو آنکھ پجولی کھیلا کرتے تھے۔ گلیوں میں بھاگ دوڑا دوڑا دم مچایا ہوتا تھا۔ اور کسی کو خیال نہ ہوتا تھا کہ لڑکے لڑکیاں اکٹھے کھیل رہے ہیں۔ یعنی اس وقت ماحول میں اتنی پاکیزگی تھی کہ کسی برائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جو لوگ مذہب سے واقف نہیں بھی تھے۔ اقدار سے ضرور واقف تھے۔ اور ان کو پوری طرح فالو کرنے پر ہمیں فخر محسوس ہوتا تھا اور ہم ایک دوسرے کو غلط باتوں پر ٹوکا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ہمارا گاؤں اس وقت تین ہزار گھروں پر مشتمل تھا۔ تو پورے گاؤں میں کوئی چار عورتیں ایسی تھیں جن کے لئے مشہور تھا کہ ان کے اطوار اچھے نہیں۔ یہ نہیں کہ ان پر کوئی بڑا الزام تھا۔ بلکہ اگر ان کا فکہ آتا تھا تو یہ کہا جاتا تھا کہ یہ جو ہیں۔ فلاں فلاں کوئی زیادہ اچھی نہیں ہیں۔ ان میں کیا برائی تھی یہ ہمیں کبھی بھی پتہ نہ چل سکا۔ چونکہ ہمارے ہاں قبائلی نظام تھا اس لئے بڑی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اسلحہ بہت کم ہوتا تھا لوگوں کے پاس، ہمارا فوجی آفیسر زکا خاندان تھا۔ تو اس اعتبار سے ہمارے پاس شروع ہی سے اسلحہ تھا۔ دادا جان کے زمانے سے بھی پہلے کی بددقیں تھیں ہمارے پاس۔ اس زمانے میں عموماً لاشیوں سے لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اقدار یہ تھی کہ اگر دو گروپوں کے درمیان لڑائی ہو رہی ہوتی تھی۔ تو درمیان میں متعلقہ گروپوں کی یا کوئی اور عورت آکر کھڑی ہو جاتی تھی۔ تو مارنے والے کا ہاتھ رک جاتا تھا۔ پھر سہی بعد میں دیکھ لیں گے یہ کہہ کر دونوں طرف کے فریق خاموش ہو جاتے تھے۔ تو یہ احترام صرف خاتون کے لئے تھا۔ یہ نہیں کہ اسے کوئی جھڑکے اس کی بات کوئی ٹالے یا پکڑ کر درمیان سے ہٹا دے۔

پھر جنگ ختم ہو گئی والد صاحب 'ڈیرہ اسماعیل خان' تھے جب ہم بھی ساتھ رہے، چھٹی جماعت میں نے ڈیرہ اسماعیل خان میں پڑھی اس دور کے بازار 'سکول' چھاؤنی وغیرہ کا نقشہ اب تک یاد ہے۔ دریائے سندھ 'دریا خان' اور ڈیرہ کے درمیان لگ بھگ 14 میلوں پر پھیلا ہوا تھا اور وہاں جہلم نامی اسٹیر چلا کرتا تھا۔

ہم ڈیرہ اسماعیل خان اعلان پاکستان تک رہے۔ مجھے یاد ہے کہ 13 اگست کی رات ہم نے ایک فلم دیکھی تھی جس کا نام ملنگنی تھا۔ غالباً یہی نام تھا۔ یا اس سے کوئی ملتا جلتا نام تھا اور اگلی شام تک وہ سینما ہاؤس جل چکا تھا۔ شہر میں فسادات ہو رہے تھے پتہ چلا کہ ہندو سینئروں نے بھی پنخان گارڈ بھرتی کر رکھے ہیں۔ یوں دو

طرزِ فارغِ مسلمانوں میں ہی ہو رہی ہے۔ ہم اگلی صبح گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔  
 دریائے سندھ سردیوں میں کئی شاخوں میں بٹ جاتا تھا جن پر کشتیوں کے ٹیلے بنائے  
 جاتے تھے یوں ٹریک دریا خان پہنچا کرتی تھی۔

گھر جا کر پھر مڈل سکول نور پور میں داخلہ لے لیا۔ نور پور مڈل سکول جہاں  
 صاحب کے استاد چوہدری مہدی حسین کرتے کے بن کھلے رکھتے تھے، کھیزی کے  
 پچھڑپاؤں کے نیچے، قد چھ فٹ سے لگتا ہوا خوشحالی داڑھی کے ساتھ ایک آنکھ ذرا دلی  
 ہوئی بہت سخت مزاج تھے۔ ہم اور کچھ کرتے نہ کرتے حساب کا کام ضرور کرتے  
 تھے۔

اردو ملک خدا بخش صاحب پڑھاتے تھے۔ رہتاس کے رہنے والے صوفی منش  
 نیک انسان تھے۔ نورانی چہرہ اور نیک اطوار والے ملک خدا بخش کا لہجہ بہت دھیمہ اور  
 مزاج بہت شریفانہ تھا۔ انگریزی کا مضمون سائیں داس پڑھاتے تھے، دبلا پتلا منحنی سا  
 شخص 'بات بات پر حکم' کن تو پچھڑ کے میرے دل لے آ" اور جب لڑکا حاضر کیا جاتا تو  
 کہتے تمہاری سزایہ ہے کہ کمرے کے کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے  
 ہو جاؤ۔ پچارہ سزا پانے والا۔ پھر سارا دن چاہے کونے ہی میں منہ دیئے کھڑا رہے  
 انہیں اسکی پرواہ نہیں ہوتی تھی وہ سزا دے کر بھول جاتے تھے۔

ہیڈ ماسٹر ملک غلام قاسم ایک مثالی استاد تھے۔ مثالی ڈسپلن جس نے پورے  
 سکول کو واقعی ایک بارعب اور باضابطہ ادارہ بنا دیا تھا۔ بہت سے اساتذہ کی تصاویر ذہن  
 میں ہیں مگر نام یاد نہیں۔ ہاں میں نے چوتھی جماعت جن سے پڑھی وہ مقامی استاد  
 ملک محمد نواز تھے۔ خوبصورت سرخ و سپید رنگت ہلکی سفید داڑھی خوبصورت اجلی کلاہ  
 پر باندھی ہوئی گھڑی صاف ستھرا لباس اور بے داغ کردار کے مالک۔ اللہ کریم ان  
 سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

اس زمانے میں تعلیم و تربیت کا ایک خاص معیار تھا۔ اساتذہ کا ایک خاص دور تھا۔ انہیں بے پناہ عزت و احترام حاصل تھا۔ سکول کا نظم و ضبط مثالی تھا۔ مجھے یاد ہے اگر کسی بچے کا کوئی ملنے والا گھر سے آتا تو اسے گیٹ عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر غلام قاسم صاحب نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ کوئی ملاقاتی دوران تدریس سکول میں داخل نہیں ہوگا۔ ملاقاتی کے لئے لازم تھا۔ وہ سکول کے چہرے کو بتائے جو کلاس ٹیچر کو اطلاع دے، اگر کلاس ٹیچر فارغ ہے تو چند منٹ کے لئے ملاقاتی کو ملنے کی اجازت ہوگی۔ بصورت دیگر ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ اور ملاقاتی کو پیریڈ ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔

مڈل سکول کے بعد جب میں ہائی اسکول میں پہنچا تو بھی یہی طرز تدریس نظر آیا۔ اساتذہ کی کوشش ہوتی تھی کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا جائے۔ وہ ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یہ بھی ہوتا کہ سکول سے باہر نکلنے کے بعد ہم راستے میں کوئی شرارت کرتے تو اس کی شکایت بھی سکول ٹیچر کے پاس آجاتی تھی۔ اور استاد کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس لئے اساتذہ ان معاملات میں بہت محتاط ہوتے تھے۔

ہائی سکول بوجھال کلاں تھا۔ تین چار میل کا فاصلہ تھا۔ کچھ عرصہ پیدل جاتے رہے۔ اپنے گاؤں سے نکلے تو راستے میں پتھر کی چٹانیں آتیں۔ جن کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا۔ ہم سب لڑکے اس پانی میں چینی یا شکر ملا دیتے۔ رات کو چونکہ ٹھنڈ ہوتی تھی۔ تو وہ پانی جم جاتا۔ صبح گزرتے وقت ہم اس جگہ ہوئی برف کو نکال لیتے اور اسے بڑے بڑے سے چوستے ہوئے سکول چلے جاتے۔ پھر ہمیں سائیکل مل گیا اور ہم چند سائیکل سواروں میں شامل ہو گئے، بہت اچھے نیک اور قابل اساتذہ کی رہنمائی نصیب رہی۔ ماسٹر ظفر صاحب، پیر بہادر شاہ



مولوی عبدالحق اور ہیڈ ماسٹر ملک اللہ شش صاحب میانوالی کے تھے، بہت ہی مدبر  
علی شخصیت، یوں ہم نے میٹرک کر لیا۔

نانا جان کا خیال تھا کہ ہمیں فی اے کرنا چاہیے تاکہ نائب تحصیلدار بھرتی ہو  
سکیں۔ لہذا گورنمنٹ کالج چکوال میں داخلہ لیا۔ جو گورنمنٹ ہائی سکول کی عمارت  
میں شروع کیا گیا تھا۔ اور گورنمنٹ ہائی سکول خالصہ سکول کی عمارت میں منتقل ہو گیا  
تھا۔ میں نے ہوٹل میں رہنے کے بجائے قریبی عزیزوں کے ہاں رہنا شروع کر دیا  
جہاں سے سائیکل پر کالج آتا۔ تقریباً دس میل کا فاصلہ صبح اور دس میل کا فاصلہ شام  
کو کرنا ہوتا تھا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا کہ خاندانی جھگڑوں اور قبائلی  
لڑائیوں میں نانا جان قتل ہو گئے۔ ان کے قتل نے ہماری دنیا ہی الٹ دی۔ وہ  
خاندان کے سربراہ اور عظیم انسان تھے ان کے خالمانہ قتل سے خاندانی وقار کی  
عمارت ڈھیر ہو گئی اور ہم تقریباً لاوارث ہو گئے۔ پھر کیسی پڑھائی اور کیا کالج میں  
نے کتابیں اٹھا کر طاق پر رکھیں اور ہدوق ہاتھ میں پکڑ لی۔ قاتل پارٹی پر مقدمہ چل  
رہا تھا۔ مگر نیچے کچھ نہ نکلا اور ڈیڑھ برس کے عدالتی چکروں کے بعد وہ لوگ رہا ہو کر  
گھر آ گئے۔

دو سال بعد ۵۳ء میں پھر لڑائی ہوئی جس میں مخالف اور قاتل پارٹی کا سربراہ  
مارا گیا۔ اس میں مجھے بھی چالان کیا گیا۔ مقدمہ چلا مجھے ایک سال کے لگ بھگ  
حوالات اور جیل میں رہنا پڑا۔ کیس کا جلدی فیصلہ ہو گیا تھا۔ ورنہ کئی سال لگ جاتے  
ہیں ایسے کیسوں میں 'اس زمانے میں حوالات' جیل میں بڑی سختی ہو کر تھی۔ جیل  
کی زندگی میں دو تین چیزیں تھیں جو آج نہیں ہیں۔ ایک تو جیل کے قواعد پر سختی سے  
عمل ہوتا تھا۔ جس میں آج کی طرح کوئی سولت بیچی اور خریدی نہیں جاتی  
تھی۔ البتہ چوری چھپے کوئی چھوٹی موٹی حاصل کر لیتا وہ اور بات ہے۔ ہم لوگ بھی

بعض اوقات جیل والوں سے چھپ چھپا کر اپنے لئے الگ کھانا تیار کرالیتے تھے۔ اگر والوں کو کچھ دے دلا کر اچھی روٹیاں لگوالیں۔ کبھی کھالیں کبھی کھانا نصیب ہی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی چوری چھپے چائے، ہوالی کہ ایک برتن میں دودھ پتی اور چینی ڈالی اور کمی کو دیا کہ تنور میں رکھ دے اور لبال کر لے آئے۔ اس طرح کبھی کبھی چائے پی لینے ورنہ جیل میں چائے پینا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کسی نے شیو کے لئے بلیڈ منگوانا ہوتا تو صان کی نکلیا میں چھپا کر منگولایا جاتا کافی سخت زندگی تھی جیل کی۔

ہمارا اشار خطرناک حوالاتیوں میں ہوتا تھا۔ ہمارے پس منظر کی وجہ سے ہمیں باہر مل لوگ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مجھے جیل کی کوٹھڑی میں ہم کیا جاتا تھا۔ میری کوٹھڑی کے قیدی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہوا تھا۔ اس کو دو سال سزا ہوئی تھی۔ وہ لہذا تنگ شخص تھا۔ داڑھی صاف بڑی بڑی مونچھیں اور لمبے بال رکھے ہوئے تھے۔ نبوت کے اس جھوٹے مدئی سے بان، ہوانے کی مشقت لی جاتی تھی۔ گجرات کا ایک اشتہاری بھی اس سے اگلی کوٹھڑی میں قید تھا۔ میں چونکہ حوالاتی تھا اس لئے میری مشقت نہیں ہوتی تھی۔ ان دونوں سے مشقت لی جاتی تھی۔ ہم تینوں کوٹھڑیوں سے باہر بیٹھے کر مپ شپ کر لیا کرتے تھے۔ میں وقت گزاری کے لئے اس سے باتیں پوچھتا رہتا تھا۔ کہ اگر تم نبی ہو تو نبوت والی کوئی بات بھی بتاؤ تو وہ مختلف کیفیات اور مشاہدے بتاتا کہ آج وہ دیکھا کل وہ دیکھا۔ اور دعویٰ کرتا کہ اس کا ملک پر قبضہ ہو جائے گا اور سب لوگ اسکے مطیع ہو جائیں گے۔ ایک دن میں نے اسے کہا کہ کل جیلر رازدہ پر آیا تھا۔ تم نے لوگوں کی شکایتیں کیس یہ چغلیاں کھانا اور نبوت کا دعویٰ کرنا آپس میں مطاہت نہیں رکھتا۔ تمہاری بعض عادتیں ایسی ہیں جو ایک شریف آدمی میں بھی نہیں ہونی چاہئے اس لئے تم نبی نہیں ہو۔

تو اس نے بڑے مزے سے کہا کہ کمزوریاں اور کوتاہیاں سارے نبیوں میں

تھیں۔ اگرچہ ہم ان دونوں بے دین اور بے نماز تھے۔ لیکن یہ بات برداشت نہ ہو سکی  
میں اس پر چڑھ دوڑا اور وہاں پڑا ہوا پانی والا گھڑا اٹھا کر اس کے سر پر دے  
مارا۔ گجرات کا اشتہاری بھی میری ہمایت میں آگیا۔ ہم دونوں نے اس کو بڑی  
پھینٹنی لگائی شور سن کر جیل کا نمبردار بھی آگیا۔

اس کے پاس آہنی چابیوں کا گچھا تھا۔ ہم نے نمبردار سے آہنی چابیوں کا گچھا چھین  
کر اس جھوٹے مدعی نبوت کو خوب مارا۔ وصل ج گئی۔ پولیس آگئی، ہمیں پکڑ کر جیلر  
کے پاس لے گئے۔ جیلر کے پوچھنے پر ہم نے مارنے کا اعتراف کر لیا۔ اور ساری بات  
سنا کر کہا کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے جیلر بھی آخر کلمہ گو مسلمان تھا۔  
اس نے نبوت کے جھوٹے مدعی کو الٹا لٹکا دیا۔ سیشن کورٹ جہلم جہاں عبدالصمد  
خان سیشن جج تھے۔ مجھے میرے دو ساتھیوں سمیت جن میں ایک ماموں اور ایک  
دوسرے رشتہ دار تھے باعزت بری کر دیا گیا۔

اب وہ آزاد تھا مگر یہ کیسی آزادی تھی جس نے اسے احتیاطیں اختیار کرنے اور لمحہ لمحہ چوکس اور چوکنا رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بغرض ملازمت والد صاحب کی گھر سے غیر حاضری سر پرست و انتہائی مربان نانا کے افسوسناک قتل کا حادثہ 'چچا کا جنگ میں مارے جانا' دادا جان کا دنیا داری ترک کر کے یاد خدا میں مصروف رہنا، ایسے عوامل تھے۔ جن کی وجہ سے نو عمر لڑکا مجبوراً خاندان کا سر پرست اعلیٰ بن گیا۔ اب اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ گھر والوں کی دیکھ بھال اور دوسرے تمام امور کا اسے ہی خیال رکھنا تھا۔ پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد پچھلے دو تین سالوں میں پے در پے ہونے والے حادثات نے اس کی سوچ کا انداز بدل دیا تھا۔ اب وہ کتاب نہیں، مذاق کی بات کرتا تھا۔ اچھا اسلحہ دفاع اور گھر والوں کی سلامتی اسکے پیش نظر تھی۔ قبائلی لڑائی اور ایک ہی گاؤں میں مخالف پارٹی کے ہمراہ رہنا پنچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

دشمنی کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں زندہ رہنے کے لئے بڑی ہمت اور حد درجہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہر وقت مسلح رہنا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا۔ دن کی جائے راتوں کو سفر کرنا معمول میں شامل تھا۔ زندگی کے ان شب و روز

میں اسے گھر اور خاندان کے افراد کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان سالوں میں وہ اپنی ایک کزن سے ذہنی طور پر بہت قریب ہو گیا۔ جو اکثر اس کی خبر گیری اور سپرہ داری کا خیال رکھا کرتی تھی۔ مگر یہ فطری انس تھا جو خالصتاً خلوص اور بھلائی کے جذبے پر نمودار ہوا تھا۔

اب اسے کسی روز گار کی بھی تلاش تھی اسلئے کہ گھر میں بیٹھ کر وقت کیسے گزر سکتا تھا۔ دشمن اس کو قتل کرنے کے درپے تھے 'زندگی ان دنوں ایک عذاب مسلسل تھی۔ سخت گرمی میں راتوں کو کمرے کے اندر بند ہو کر سونا کھڑکیاں رو شندان بند رکھنا جبکہ جلی کا دیسات میں ان دنوں تصور بھی محال تھا۔ ہر وقت مسلح رہنا اور سونے کی جگہ بدلتے رہنا۔ ایک آرمی آفیسر جو اس کا عزیز تھا فوج میں جانے کا سبب بن گیا جانے کو تو وہ چلا گیا۔ مگر وہاں تک نہ سکا آزاد منٹس بند تھا اور فوج پابندی کا نام ہے۔ لہذا جلد ہی چھوڑ چھاڑ کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ راولپنڈی میں رہا ملازمت تو حاصل کر لیتا مگر خاندانی دشمن اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اسی لئے اسے واپس آنا پڑا۔

جن دنوں وہ راولپنڈی سے واپس آیا۔ گھر میں اس کی معافی کی بات چل رہی تھی۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی اسی کزن کا نام لے لیا جس کے ساتھ لگاؤ اسکے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس کزن کے لئے ان دنوں ایک اور پروپوزل بھی آیا ہوا تھا۔ اپنے ایک عزیز کا جو آرمی آفیسر تھا اور اس کے والدین اس پروپوزل پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ تقریباً ہاں ہونے والی تھی۔ ایسے حالات میں اس نے پسند کا اظہار کیا تو خاندان بھر میں شور مچ گیا (اس کے بچو بچا) کزن کے والد اسے اپنی بیٹی دینے پر بالکل بھی آمادہ نہ تھے ان کا کہنا تھا ایک ایسے جوان کو جس کا کوئی مستقبل نہیں 'قائل دن رات جس کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ بھلا کون غفلت مند بیٹی

دے سکتا ہے۔ اب بات صرف پسند کی نہ رہی، کیونکہ بات اگر صرف پسند کی ہوتی اور زبان سے اس کا اظہار نہ کیا جاتا تو اور بات تھی۔ اب چونکہ علی الاعلان پسند کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس لئے پیچھے ہٹنا مشکل تھا اور وہ پیچھے ہٹنے والا تھا بھی نہیں یہ بات بھی سمجھ جانتے تھے۔ پھر کھینچا تانی اور جھگڑے بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر اس کے دلہا جان درمیان میں آگئے وہ بہت نیک بزرگ تھے۔ خاندانی سیاست اور دشمنیوں میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت یاد الہی میں بسر ہوتا تھا۔ مگر اس نازک موڑ پر انہوں نے پوتے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور انہوں نے سب کو رشتہ دینے پر مہالیا یوں اس کی مٹگنی ہو گئی۔

یہ اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا وہ اس موقع پر اپنے اندر ایک الگ ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ کسی کے لئے سوچنا کسی سے ملنے کی خواہش، کچھ عجیب سا انس، جو اسکی وحشت پسند سخت طبیعت کو بالکل نرالا کام محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جو دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور ان کے ساتھ دشمنی نبھانا اسکے حالات کی مجبوری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان حالات میں وہ بالکل ہی ایک الگ انسان بن گیا تھا۔ ہندو قبیلے کا اسلحہ اپنا دفاع اور دشمن کو نچا دکھانا جیسے مقاصد اس کی شخصیت کا حصہ بن گئے تھے۔ جیسے کہ ہر دشمنی کرنے والا دوست بھی ضرور ہوتا ہے کہ دوستوں کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسے لوگوں کے لئے ایک بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ کوئی دشمنی میں گھرا ہوا مرد کبھی عورت کی دوستی کا تصور بھی نہیں کرے کہ یہی اسکی بہت بڑی کمزوری ہو گی۔ جو اس کی شکست اور موت تک کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ بات اس کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ ممکن ہے کبھی کسی لڑکی نے اسے متوجہ کرنا چاہا ہو۔ مگر اس کا انہی باتوں کی طرف کچھ دھیان ہی نہ تھا۔ وہ تو اور ہی مسئلوں کا شکار تھا ایسے مسئلے جو دل سے نہیں دماغ سے سوچے جاتے ہیں اور عقلمندی سے حل کئے جاتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا وہ ایک بچنگ کورس میں داخلہ لے کر الہ موئی چلا گیا۔ اب زندگی کسی حد تک ایک ڈمر پر چلنے لگی۔ مستقبل کی پلاننگ قدرے بہتر انداز میں ہونے لگی۔ پچھلے چند سالوں سے زندگی میں بن بانی آجانے والی پریشانیاں اور حادثے جو تازہ زخم کی طرح مسلسل دکھتے رہتے تھے۔ مدھم پڑتے گئے۔ اس نے پوری دلجمعی سے کورس کیا اور قریبی گاؤں کے سکول میں اہلورا استاد اسکی تعیناتی ہو گئی۔ کتاب اور حرف سے ٹوٹا ہوا رشتہ پھر استوار ہو گیا۔ راستے کا گرد و غبار چھٹنے لگا۔ پاؤں کے نیچے جلتی زمین کی ہر وقت تپش کچھ کم ہونے لگی۔ آسمان کی چھت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی تمنا دل میں کروٹیں لینے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بادلوں کو چھوٹا چاہا مگر یہ کیا انہی سے اسکی پلکیں آنکھیں اور چہرہ بھگ گیا۔ بادل ہاتھ نہ آیا۔ آسمان دھجی بھر آسمان۔ اس کی دسترس میں تھا۔ جس سے سانبان کا تصور بھی محال تھا۔ زمین پر دھوپ تھی ہر طرف جلتی ہوئی تیز دھوپ۔ اس دفعہ زندگی حادثات کا نیارنگ لائی تھی۔

قریبی گاؤں میں رہائش رکھنے کے سلسلے میں اس پر جموٹے الزام لگے۔ جنہیں اس نے ہنسی میں اڑا دیا۔ اور اپنے معمولات میں مگن رہا اور اگر بات بیس تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ مگر معاملہ کچھ بڑھ گیا۔ بات اس کی ذات سے ہوتی ہوئی اتنا تک آئی تو صورتحال مختلف ہو چکی تھی۔ معاملہ سنجیدہ رخ اختیار کر چکا تھا۔ الزام کو جموٹا تھا مگر بات اتنی تھی۔ اس کے اندر چھپے بیٹھے کبھی نہ جھکنے والے اس انسان کی تھی جسے نو عمری میں ایک بڑے خاندان کا سربراہ بن جانا پڑا تھا اور ذمہ داریوں کا بوجھ ایسے وقت میں اٹھانا پڑا تھا جو خواب دیکھنے اور تعبیروں کی فکر نہ کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے میں اس نے پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی لئے اس نے تمام ذمہ داریاں ہنسی خوشی اٹھائیں اور مردانہ وار تمام مشکلوں سے ٹکٹا چلا گیا اور کبھی کسی کے سامنے

کنزور نہیں پڑا۔ دشمنی کرنے دشمنی نبھانے اور دشمنوں کے درمیان سرائف کر پڑنے تک کے مراحل میں اسکو کبھی بھی کسی نے جھکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

تو پھر یہ سب کیا تھا جسو ہا الزام سچ تو نہیں تھا۔ پھر اسات سچ کیوں مان سمجھ اور جان لیا گیا۔ دشمنوں کی صفوں میں دوستوں کے بھی چہرے تھے ایسے میں اس نے اپنا طرف مڑ کر دیکھا وہ تنہا نہیں تھا۔

اس کے پاس اس کے ناقابل شکست ارادے تھے۔

اس کی نہ ٹوٹنے والی امانت تھی۔

اس کی کامیابیاں تھیں۔

دشمنوں پر فتح حاصل کرنے والی اندھی خوشی تھی

اور

اسکی بے پناہ طاقت تھی۔

مگر یہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے ارادوں کے بلے پر شکست خوردہ بیٹھا اپنے آپ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

یہ کیا..... زندگی میں پہلی دفعہ اس نے خود کو کنزور پا کر خود سے سوال کیا۔

یہ کیا..... اس کی بے پناہ طاقت اس سے ہاتھ بھر کی دوری پر کھڑی خود سے نظریں چرا رہی تھی۔

یہ کیا..... خود کو ایک طویل وعریفن تنہائی میں گھرے دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

سب کہاں گئے۔ وہ جو دوست تھے 'یار تھے' اپنے تھے۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس نے ان کو پتھروں کی بستی میں پتھر بنے دیکھا تھا۔ سب نے منہ پھیر لیا تھا۔ یا پھر اس



نے ہی مڑ کر نہ دیکھنے کے مہم کے باوجود پیچھے مڑ کر دیکھ لیا تھا۔ شاید یہ دیکھنے ہی کی سزا تھی۔ یقیناً یہ دیکھنے ہی کی سزا تھی۔ وہ سچا تھا۔ بے قصور تھا مگر حالات و واقعات نے اسے قصور وار بنا دیا۔ اپنی طاقت اور مضبوطی پر بے پناہ مان کے باوجود وہ ہار گیا۔ اس جھوٹے الزام کا جھسر پر اٹھاتے وقت۔ وہ ایک مختلف کیفیت میں تھا ایسی کیفیت جو بعد میں بہت دیر تک اس کے ساتھ رہی۔

وہ جو خود کو ہمیشہ سے ناقابل شکست طاقت مانے ہوئے تھا آج تک اس نے جو چاہا کر مڑا۔ پولیس جیل اور عدالت بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ خاندان اور روایات میں سے کوئی بھی اپنی مرضی کرنے سے اسے باز نہ رکھ سکا۔ تو پھر بھلا روایات اور مصلحتوں میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی وہی خاندان کے افراد تھے جن کی بات بھی وہ اپنی مرضی سے مانا کرتا تھا دوبارہ منہ نہ مٹا کر تاتا تھا۔ پھر یہ سب کیا تھا۔

(یہاں حضرت جی کا کہنا ہے کہ ایک باغی اور خود سر کو تبدیل کرنے کے لئے جتنا بڑا حادثہ چاہئے تھا شاید یہ اتنا ہی بڑا حادثہ تھا) جس نے اس باغی نوجوان کو جذباتی طور پر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا کہ وہ خاک سے بنا ایک عام انسان ہے۔ جسے حادثات اور واقعات کی آندھیاں ہلکے کی طرح اڑانے کی طاقت رکھتی ہیں اپنے اندر۔ وہ جو اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ درحقیقت کچھ بھی نہ تھا۔ اسے اپنے ناقابل شکست ارادوں کی ٹوٹ پھوٹ نے تھرا کر رکھ دیا۔ وہ تو زندگی کے بہت سے معاملات میں صاحب اختیار تھا۔ پھر یہ بے اختیاری کیسی۔ اس نے کم عمری اور ناتجربہ کاری کے زمانے میں ایک بہت بڑی لڑائی جیتی تھی ایک لمبی دشمنی مردانہ وار نبھائی تھی۔

وہ خود کو فاتح سمجھتا تھا اور شاید سمجھتا ہی رہتا مگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو۔  
گو تم بدھ نے شاید کسی ایسے ہی موقع پر کہا تھا کہ فتح نفرت پیدا کرتی ہے کیونکہ۔

مفتوح دکھ کی میند سوتے ہیں لیکن فتح و شکست سے بلند آدمی شانت رہتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات اور حادثات وقت کے انوکھے کھیل ہیں اور اصل میں وقت کی حقیقت ہیں۔

اب وہ سوچ رہا تھا مسلسل سوچ رہا تھا دوستوں کی محفلیں چھوٹ گئی تھیں۔ لوگوں سے ملنا ملنا موقوف ہو چکا تھا۔ گھر والوں سے بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کھانے پینے سونے اور جاگنے تک کے اوقات بری طرح سے ڈسٹرب ہو چکے تھے اور تو اور اب تو اس نے ہمراہ اسلحہ رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ راستوں کی احتیاط نہ قتل ہو جانے کا اندیشہ۔ عجیب لا تعلقی تھی عجیب بے نیازی تھی۔ یوں جیسے وہ حال میں رہتے ہوئے بھی اپنے حال سے بے خبر ہو۔ یا جیسے اسے کسی معاملے یا سلسلے سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی ہو۔

اب وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ زندگی کیا ہے خیر یا شر عذاب یا ثواب؟ محبت یا نفرت دوستی یا دشمنی؟ کیا ہے آخر؟ کیا وہ محض ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

یہ کچھ اور اس کی تلاش تھی یہی کچھ اور اس کی جستجو تھی۔ جو اس کے سامنے سوالوں کی گٹھنیاں کھول کھول کر ڈھیر کرتی جا رہی تھی اور وہ ان رنگ برنگے سوالوں کے ڈھیر پر بیٹھا خود سے پوچھ رہا تھا وہ کون ہے؟ یہ سب کیا ہے؟ ایسے میں اس نے دیکھا کہ چاروں طرف خلا ہے اور وہ اس میں ہمیشہ کی طرح تنہا موجود ہے۔

دنیا کا ازلی وابدی انسان

تھکا ہوا شکست خوردہ اور پر امید انسان

جو ہمیشہ خدا کی تلاش میں رہتا ہے

جسے ہمیشہ ان دیکھے محبوب کی طلب مضطرب رکھتی ہے

جو صاف چھپتا بھی نہیں اور دکھائی بھی نہیں دیتا۔

خدا جو پریت نہیں پریتم ہے۔

پریتم بھی ایسا جو لک چھپ لک چھپ آنکھ پجولی کھیلتا رہتا ہے۔

اور لپک جھپک میں ہوں میں ہوں بھی گنگنا رہتا ہے کبھی پلکوں پر سائے کی طرٹ

اڑتا ہے

اور کبھی چکا چوند لیے دھوپ کے ہمراہ چلا آتا ہے

کبھی رگ رگ اور پور پور سے جھانکن تاکن کرتا ہے۔ اور کبھی پر ہول سنانے

کے تمبوٹان کران میں خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے ڈھونڈو مجھے کھوجو۔ کچھ سوچو

نہیں آئی کچھ پتہ نہیں چلتا

کیا ہے؟ آخر کیا ہے؟

اب وہ گم شدہ سا انسان بن چکا تھا

گھر والوں نے ان حالات میں اس کی شادی کا فیصلہ کیا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور

شادی ہو گئی۔ مگر اس کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ ملازمت جاری تھی، وہ صبح

سکول جاتا تو سکول سے باہر کھیتوں میں چلا جاتا۔ غیند آتی تو کسی بھی کھیت کی منڈیر پر

سو جاتا۔ حتیٰ کہ دھوپ سائے کی بھی پروا نہ کرتا۔ کئی بار اس کے ساتھی استاد اسے

ایسی حالت سے جگا کر لاتے۔

انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں ہیں

اور زندگی بعض وقت خوابوں کا یہ جہ سارنے کے قابل نہیں رہتی تو ایسے میں پھر کیا

کیا جائے۔

دل کے رنجوں پر فتح پالو  
 امانیت کا خول توڑو اس سے باہر نکل آؤ۔  
 نصیب کا مقابلہ کرنے والا کبھی خوش نہیں رہ سکتا سب سے اچھا مقصد حیات  
 سے جو کسی کی خوشنودی کے لئے ہو۔  
 خدا عظیم ہے

اس لئے کہ وہ سب کی حمد اُٹھاتا ہے  
 کسی ایک طبقے میں آکر کسی دوسرے طبقے کے خلاف ایکشن نہیں لیتا  
 بلکہ ایکشن تو لیتا ہی نہیں۔  
 ہر عظیم آدمی کھن مراخل سے گزرتا ہے۔ ہر عظیم آدمی پر سے کربلا گزرتی  
 ہے۔ جتنی زیادہ گزرتی ہے اتنا ہی اللہ سے قرب زیادہ ہوتا ہے۔  
 تو قرب ہی قوت برداشت عطا کرتا ہے  
 اگر قرب نہ ہو تو قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے

تقرب ہو گا تو غصہ نہیں آئے گا

ہا نہیں آئے گی اور انسان ابتداؤں سے خاموشی کے ساتھ گزر جائے گا۔ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھلنے لگیں اب ایک تبدیلی تھی جو آرہی تھی وہ یہ تھی کہ اس نے مذہب کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اور نماز ادا کرنے لگا تھا وہ آہستہ آہستہ اللہ کی عظمت کا قائل ہونے لگا تھا۔ جو اس کی زندگی کی بہت بڑی تبدیلی تھی اسے عبادت میں ایک سکون ساملا یا شاید اس کا نام کچھ اور ہو اور یہ کہ اسے لگا جیسے کسی دیرانے میں ہینک ہینک کر اب وہ گھر کے راستے پر ہے۔ ایسے راستے پر جس پر امید کی روشنی جھلما رہی ہے۔ ایسے میں اسے یہ خیال آیا کہ بہت سے نیک لوگ اور اللہ کے بندے ان راہوں کے راہروہی نہیں رہ رہتے ہیں۔ کیوں نہ کسی کو تلاش کیا جائے۔ ایک خیال جو اچانک آیا اور پھر کہیں اندر ٹھہر گیا وہ معروف پیروں کی طرف متوجہ ہوا۔

ڈھونڈتے ڈھانڈتے ایک بہت مشہور خانقاہ میں جا نکلا اور اپنی اصلاح کی درخواست کی جو پیر صاحب نے خوشدلی سے قبول کر لی۔ زیادہ سے زیادہ وقت پیر صاحب کے قریب رہنے کے لئے اس نے ان کی خدمات اپنے ذمہ کر لیں۔ اب وہ دن رات پیر صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ اور کچھ ہی عرصہ میں وہ ان کے بہت قریب آ گیا۔ مگر یہ قریب ایسی تھی جس نے بہت سے راز بے نقاب کر دیئے اور اصلیت کو بہت جلد اس پر روشن کر دیا۔ اسے پتہ چلا کہ بظاہر لوگوں میں پیر صاحب کے چلے اور گوشہ نشینی کی عبادات درحقیقت ان کی سوانح نامہ نگاری کو ششیں ہیں جس میں اس فن کے چند بے دین لوگ پیر صاحب کے ساتھ شامل ہیں اور لوگوں سے نذرانے وصول کر کے پیر صاحب مختلف ادویات اور دھاتیں منگواتے ہیں اور رات دن اس کی میاگری کے چکر میں اس پر محنت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے نسخے آزمائے جاتے ہیں اور

طرح طرح کے طریقوں سے سونا ہانکی کو شیشیں کی جاتی ہیں۔

اس انکشاف نے اسے ششدر کر دیا، کیونکہ اللہ کے نام کا دھوکہ دے کر دنیا جلی کا یہ انداز نہ صرف اس کے لئے نیا تھا بلکہ پریشان کن بھی تھا وہ تو گھربلا کام اور آرام چھوڑ کر اللہ کے راستے پر چلنے کے لئے نکلا تھا۔ اگر اس راستے پر بھی اللہ کے بندوں کے روپ میں دنیا دار بیٹھے ہیں تو پھر اس سے بہتر ہے کہ واپس جایا جائے۔ پیر صاحب سے متنفر ہو گیا اور وہاں سے چلا آیا مگر اس نے اپنی تلاش نہ چھوڑی اس لئے کہ اب اسے تلاش میں ہی کہیں نجات چھپی ہوئی نظر آتی تھی۔

اس کے بعد اس راہ میں اسے متعدد عظیم ہستیوں، مشہور پیروں اور نامور اولیاء اللہ سے ملنے کا موقع ملا اور یہ دیکھ کر اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔ کہ کبھی ایک جیسے مقاصد رکھتے تھے۔ کبھی اندر سے ایک جیسے تھے۔ دولت کی ہوس اقتدار کے شوق اور دنیا کی محبت نے سب کو اندھا کر رکھا تھا۔ سب اپنے اپنے طریقے سے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ اللہ کے نام کا بازار سجا تھا۔ سب نے اپنی اپنی قیمتیں مقرر کر رکھی تھیں۔ سب مال کی ریزحیاں لگائے اللہ لے لو، اللہ لے لو، کی صدا تیں لگا رہے تھے اور سادہ لوح دیکھی، مظلوم اور بے بس لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ہر ایک کو اللہ چاہئے تھا۔ ہر ایک کی اللہ کے ساتھ اپنی اپنی ضرورتیں وابستہ تھیں۔ ہر ایک کو اس سے کام تھا۔ اسی لئے بدلے میں کوئی تن کی بنیاں کاٹ کر پیش کر رہا تھا اور کوئی جان کا نذرانہ کسی کی بکلی میں اس کی مجبوریوں کے کھوٹے سکے پڑے تھے۔ اور کوئی اپنے گھرے کو کھوٹا بنا کر پیش کر رہا تھا۔ پیر صاحبان تھے کہ دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔ گاہکی زوروں پر تھی ریزحیوں میں اللہ نام کا ڈھیروں ڈھیر مال رکھا تھا اور اللہ دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اپنی لوٹ کا تماشا بڑے مزے سے دیکھ رہا تھا۔ نیلام گاہ میں اپنے نام کی بولی لگانے والوں کی آنکھوں میں حرص کی چمک دیکھ کر شدید ادا اس ہو رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا آخر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ لوٹنا ہے تو ڈاکو بن کر لوٹو۔  
ہمدوق کی نالی سے لوٹو۔ یہ تسبیح کے چکر میں جو لوٹ بچار کھی ہے یہ تو بہت خطرناک  
ہے۔ ہمدوق دولت چھین لے گی۔ جان لے گی مگر ایمان نہیں چھین سکتی۔ جبکہ تسبیح  
کی لوٹ براہ راست لوگوں کے ایمان لوٹ رہی تھی۔ کوئی جنوں کو قالا کرنے کے  
دلیفہ پڑھ رہا تھا کوئی تسخیر ہمزاد کے لئے چلے کاٹ رہا تھا۔ کوئی مختلف امراض کے  
علاج کے لئے تعویذ بچ رہا تھا۔ اور کوئی پیتل اور تانبے کو سونا بنا کر راتوں رات امیر  
بننے کے چکر میں تھا۔

رب کی رخصت سے کوسوں دور دنیا طلبی کے چتے صحرا میں سب بہرہ و پنے نظر  
آتے تھے۔ اس وقت اس کی حالت یہ تھی۔ کہ نہ تو وہ واپس جاسکتا تھا اور نہ ہی آگے  
چلنے کے لئے راستہ نظر آتا تھا۔ کیا کرے عجیب کشمکش تھی۔ اسی ذہنی ابتری کے عالم  
میں اس نے فیصلہ کیا اب چل پڑے تو چل پڑے واپسی کی کوئی راہ نہیں۔ شاید کبھی  
کبھی کوئی مل جائے۔ یا پھر زندگی اس امید اس طلب اور اسی تلاش میں بسر ہو جائے۔  
اس مسافری میں یہ تصور بھی اسے منزل کی طرح لگتا تھا ایک ایسی منزل کہ حقیقی  
منزل نہ ملے تو بھی صادقین اسے کھو نہیں سکتے۔ اس لئے کہ پھر یہی ان کی منزل  
ہو ا کرتی ہے۔

”صادقین کی صحبت اختیار کرو“

(صادقین سے مراد اولیا اللہ ہیں)

یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے وسیلہ یعنی ذریعہ شیخ وہادی  
تلاش کرو۔

انہی دنوں دکھ کا ایک نیا باب کھلا زندگی نے ایک تھکی ہوئی کروٹ بدلی اور اس  
نے وقت کے اقدار ہمدوق صحرا میں جلتی ہوئی ریت پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف

دیکھا جہاں ایک ککڑا بھی اسے نظر نہیں آیا، دور دور تک دھوپ کی تیزی قہر  
آنکھوں میں چبھتی تھی اسے چلنا تھا

چلنے رہنا تھا

کو موت کا دکھ اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ مگر موت بجائے خود ایک ایسا  
ساختہ ہے جو کبھی بھی پرانا نہیں لگتا، ہر بار نیا لگتا ہے۔ ہر جانے والا پہلی و آخری انڈر  
اس جہاں سے جاتا ہے اور اپنے جانے کے بعد پیچھے اک ایسا خلا چھوڑ جاتا ہے۔ نئے  
کبھی بھی کوئی پر نہیں کر سکتا۔ اس خلا میں جتنا مرضی دکھ، آنسو، اداسیاں اور تنہائیاں  
بھر دو اسے باقی رہنا ہوتا ہے اور وہ باقی رہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ انسان آہستہ آہستہ  
اس کے ساتھ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ یہ  
پیارے نانا کی وفات کے بعد اک عرصہ اس نے بھی اس خلا کو اپنی اداسی، دکھ اور  
تنہائی سے بھرنے کی کوشش کی، مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو وہ اس کے ساتھ رہنے کا  
عادی ہونے لگا اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا، مگر بعد کے حالات اور  
جذباتی کرائس نے اسے ایک عجیب موز پر لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں سے وہ پیچھے جانا  
نہیں چاہتا تھا اور آگے جانے کے تمام راستوں پر بھی دھند نظر آتی تھی۔

وہ عجیب کوگو کے عالم میں کھڑا سوچتا تھا۔ کیا کرے کہاں جائے۔ کہ انہی دنوں  
چچا، چچی مکے کے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ ابھی ان کے جانے کا غم تازہ ہی تھا کہ دلہا  
جان جیسی شفیق اور مہربان ہستی بھی اس جہان فانی سے منہ موز کر چلی گئی۔ اور وہ ان  
کی قبر پر مٹیوں میں بھری مٹی ڈالتے ہوئے۔ دکھ کی انتہائی سرحدوں پر کھڑی  
زندگی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اگر ہم جانے والوں کو روک نہیں سکتے تو پھر ان کی یادوں کے نقش مٹاتے وقت  
یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ کبھی اس زمین اور آسمان کے درمیان اڑتے ہوئے



ہندوں نے 'ان کی آواز کی بازگشت پر' اپنی اڑانیں تیز کر دی تھیں ان کے قدموں کی چاپ پر 'چوئیاں ملے جانے کے خوف سے اپنے مسکنوں کی طرف لوٹنے لگی تھیں۔ اور ہوا صبح کا پیغام ان کے کانوں میں اٹھیلنے کی خاطر کھڑکیوں پر دھکم دیتی تھی۔

وہ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں

جنہیں دیکھنے کی خاطر ہم روز آنکھوں کی پچانوں پر چڑھتے ہیں

پلوں کا چھبانا کراٹھیں پتلیوں میں اتارنے کی آرزو کرتے ہیں!

دوسرے چٹا کے انتقال نے رنج کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کے ایسے بے پناہ

وجہ سے اسے یاد دیا کہ پھر ان دو خاندانوں کے قیموں اور یہ کی (ایک چچی کا انتقال

پہلے ہو چکا تھا) کفالت کی خاطر اس نے گاؤں سے اپنی رہائش ڈیرے پر منتقل کی اور

اپنی منتشر زندگی کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس

دوران والد صاحب کی پیشین آگنی اور وہ ڈیرے پر آگئے۔

اب اس کی حالت پھل سرمست کے اس شعر جیسی تھی

اے عمر! میری آنکھیں آنکھوں پہ نرم آلودہ رہتی ہیں

میں تیرے قلعے میں بیٹھ کر فالس نکالتی رہتی ہوں

پھل کی محبت تجھے یاد کرتی ہے

کچا والا آکر اپنے کرم سے نوازے گا

محبت کرنے والے کی جان مشتاق اور بے تاب ہے

اپنے ایک انٹرویو میں حضرت جی فرماتے ہیں ان دنوں میں ذاتی طور پر شدید

ذہنی اضطراب کی زد میں تھا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد یہ کیفیت روز افزوں تھی، خاندانی جھگڑوں نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ کوئی بھی حساس آدمی اس صورتحال کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسے ایک ذہنی اور جذباتی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ سب ایک دم سے ٹھیک ہو جائے لیکن ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ سچ پوچھیں تو اس صورتحال سے میں کچھ ٹھک سکتا تھا۔ میں سلامتی اور سکون کی راہ تلاش کر رہا تھا۔ اس لئے تجارت اور کاشت کاری کے علاوہ مسلسل سوچ چار بھی کر رہا تھا۔

خاندانی طور پر ہمارا گھرانہ ایک دیندار گھرانہ تھا۔ نماز روزے اور پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ میرے دادا جان کا حکم تھا۔ گھر کی کوئی خاتون جو بے وضو ہو گئی کھانا نہیں پکائے گی ان کی اس بات پر بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ جس کاچی چاہئے وہ کھانا پکالے۔ یہ ہماری خاندانی روایات تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی باقاعدہ مولوی یا عالم نہیں تھا۔ لیکن دینی روایات کی جڑیں بہت گہری اترتی ہوئی تھیں۔ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے بدل کر رکھ دیا۔

تقسیم ملک کے وقت ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی، ہماری مسلم لیگ کی لیڈر شپ جو تھی اس میں شیعہ حضرات بڑے طاقتور تھے۔ تو شاید ان دنوں شعوری طور پر کوشش کی جا رہی تھی کہ شیعہ ازم کو لوپر لایا جائے۔ یا شاید محض ان لیڈران کو دیکھ کر اہل تشیع کے علماء نے اپنے طور پر ایسی کوششیں تیز کر دی تھیں اس زمانے میں چارپانچ عالم ہوا کرتے تھے۔ اہل سنت کے، جو میدان مناظرہ یا تحقیق و تصنیف میں نمایاں تھے۔ اس زمانے کے نامور علماء میں علامہ دوست محمد قریشی پیر احمد شاہ ظہاری، عبدالستار تونسوی، جو ابھی حیات میں اور حضرت مولانا اللہ یار خان کا نام حلیت مناظرہ اہل سنت میں معروف تھا۔

اہل تشیع کے ایک عالم ہوتے تھے گوجرہ کے رہنے والے تھے مولانا اسماعیل میری ذاتی رائے میں 'جب میں نے دین پڑھا سیکھا اور مطالعہ کیا' تو میں سمجھتا ہوں کہ مولانا اسماعیل 'شیعہ کے پہلے پہلے علماء کی یادگار تھے بہت وسیع المطالعہ بہت ذہین' اور حاضر جواب 'عربی زبان پر پورا عبور حاصل تھا انہیں۔ وہ شیعہ سنی مناظرے کے لئے پورے ملک میں دورے کرتے تھے۔ عام مولوی ان کے سامنے نہیں تک سکتا تھا۔ عادت یہ تھی کہ جہاں جایا کرتے تھے بہت زوردار انداز میں تنقید کیا کرتے تھے۔ تو اکثر جہاں مولوی اسماعیل کو بلایا جاتا تھا وہاں چکڑالہ سے مولانا اللہ یار خان کو ان کے ساتھ مناظرے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اور یہ مانی ہوئی بات تھی کہ ان کے سامنے مولوی اسماعیل نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

منارے سے آگے ایک گاؤں ہے پدھراڑ وہاں اہل تشیع کا سالانہ سہ روزہ جلسہ تھا۔ وہاں مولوی اسماعیل نے آتا تھا۔ سنی حضرات نے مولانا اللہ یار خان کو اسی جلسے کے سلسلے میں وہاں بلایا تھا۔ مجھے بھی چند دوستوں کے ہمراہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو خیال آیا کہ پہلے مولانا صاحب سے مل لیا جائے۔ تو پتہ چلا وہ آرام فرما رہے ہیں۔ جہاں انہوں نے حضرت کو ٹھہرایا ہوا تھا وہ لوہاروں کا اک گھر تھا۔ کچا اور معمولی سا اس میں اوپر چھوٹی سی کوٹھڑی بنا رکھی تھی۔ اوزاروں اور ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے سامان کے لئے۔ وہیں ایک کھر درہی سی چارپائی پر ایک پرانی سی درہی چھی ہوئی تھی اور ایک ٹکیہ رکھا تھا۔ حضرت نے لمبل کا لباس پہن رکھا تھا منہ پر بھی لمبل کا پنکا سا ڈالا ہوا تھا۔ وہ اس وقت قیلولہ فرما رہے تھے اس پائے کے عالم یاندہ ہی رہنا میں اس طرح کی سادگی میں نے پہلی بار دیکھی۔ نہ کھانے میں تکلف نہ رہنے میں تکلف لباس بھی سادہ غذا بھی معمولی مگر جیسے بات کرے تو علم کے دریا بہا دے۔ وہ مجھے کچھ ہٹ کے لگے۔ ایک تجسس سا پیدا ہوا ان کے بارے میں۔

ظہر کے بعد حضرت کی تقریر تھی۔ جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا میں اصلاحی باتیں کروں گا ہاں اگر شیعہ حضرات نے اعتراضات کئے تو کل کے جلسے میں ان کے جوابات دیئے جائیں گے۔ میں نے اس جلسے میں بہت سی عجیب باتیں دیکھیں۔ ان آدمی میں کوئی ایسی بات بظاہر نظر نہیں آتی تھی۔ جو انسان کو متاثر کرتی ہو۔ دیکھنے میں معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑے عالم ہیں۔ مگر جب انہوں نے بات شروع کی تو پتہ چلا۔ یہ تو بحر العلوم ہیں۔ انہوں نے مناظرے کے شروع میں کہا ہم شیعہ حضرات سے کچھ سوالات کریں گے۔

اگر انہوں نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا اور اپنے لوگوں کو ہم سے دور رکھنا ہے تو پھر اس مناظرے کی کوئی افادیت نہیں۔ وہ اپنے عقائد میں خوش ہم اپنے عقائد پر راضی۔ پھر اس بحث و مباحثے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے ان کی اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو بے وجہ چھیڑ چھاڑ پر یقین نہیں رکھتے۔ اس کے بعد مولانا اللہ یار خان نے تقریر کی۔ تو وہ بھی اصلاحی قسم کی تھی۔ اس میں کوئی گستاخی نہیں تھی۔ کوئی شیعہ سنی مسئلہ نہیں تھا۔ مولانا نے پھر زور دے کر کہا۔ اگر شیعہ حضرات ان کے سوالات کا بھی جواب دیں گے تو وہ مناظرہ کریں گے ورنہ بے کار کی مشقت میں نہیں پڑیں گے۔

اس سے پہلے تو ہم نے دیکھا تھا کہ مسجدوں میں میدان کارزار بنا ہوتا ہے۔ چٹم دھاڑ اس کو مار اس کو مار کسی پر کفر کا فتویٰ کسی کو مرتد قرار دے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ یعنی مقابلہ کے لئے ایک ہندو آیا ہے اور اس کا رویہ اتنا مضامنا ہے اب ایک نئی بات تجربے میں آئی۔ کہ یہ آدمی دوسروں سے مختلف ہے۔ ان کی تقریر دین کے عملی پہلوؤں پر تھی۔ خصوصاً اس میں زیادہ زور رزق حلال پر تھا کہ عبادات کی جیاد جو ہے وہ بھی رزق حلال ہے۔ اس کا زیادہ اہتمام کیا جانا چاہئے پھر اس تقریر

کے آخر میں حضرت نے فرمایا۔

میں زرا مناظر نہیں ہوں۔ میں صوفی بھی ہوں مجھے پندرہ بیس برس ہو گئے ہیں  
اللہ اللہ کرتے میں سلسلہ ادویہ نقشبندیہ میں صاحب مجاز بھی ہوں۔ مجھ میں اللہ کے  
فضل سے یہ قوت بھی ہے کہ جو میرے ساتھ اللہ اللہ کرے، میں سلوک میں اس کی  
ترتیب کروں۔ جسے حق کی تلاش ہو وہ میرے پاس آئے

میں اسے اپنی مرضی سے غذا دلاؤں گا

اللہ کا ذکر کراؤں گا

اگر

میرے ساتھ رہے گا فانی الرسول کراؤں گا

آقائے دو جہاں رحمت العالمین کے ہاتھ پر روحانی بیعت کراؤں گا

یوں کہ اس پر حق واضح ہو جائے گا !!

جلے میں بہت سے لوگ تھے۔ کچھ تقریر سننے کے شوق میں آئے تھے۔ کچھ  
شیعہ سنی گرما گرمی کا نظارہ دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ کچھ محض وقت گزاری یا تماش  
بینی کو ہمراہ لے کر آئے تھے اور مجھ جیسے کچھ روا روی میں دوستوں کے ہمراہ وہاں  
محض ایک نئے تجربے کے لئے آئے تھے۔ شاید دل کے اندر کہیں وہ چھپی ہوئی  
تلاش بھی وہاں آنے کا سبب ہو جو گاہے گاہے نکلتی تھی۔ جو بہت سے آستانوں  
کی خاک چھاننے کے بعد بھی روز اول کی طرح بدستور تشنه تھی اور موجود تھی کوئی تو  
ہو گا کہیں تو ہو گا۔ خدا کی اس کائنات میں آخر، اس کا یہ نظام ایسے مہدوں کے بغیر تو  
نہیں چلتا۔ وہ جو روحانی مراتب اور درجات پر فائز ہوتے ہیں۔ درحقیقت جن کے  
ہاتھ میں انتقام زمانہ ہے۔ وہ جن کا ذکر کتابوں میں بار بار ملتا ہے اور تمام کتابیں جھوٹ  
تو نہیں کہتیں۔

سچ ہے۔ کہیں نہ کہیں موجود۔  
کتابیں کہتی تھیں۔

اسلام علم بعد میں ہے عمل پہلے ہے۔ علم اور عمل میں فاصلہ کم کرنا ہی اسلام ہے  
یہی شریعت ہے اپنے علم کو خوشی سے عمل کے تابع کرنا۔ یہی اصل اسلام ہے  
شریعت عمل اور حکم ہے۔  
صرف علم نہیں ہے۔  
حکم ہے اس راستے  
پر بڑھے چلو۔

درویش آیا تو اس نے کہا!

یہ حکم ہے تو یہی میری خوشی ہے۔ حکم کو خوشی بنانے والے ہی اہل تصوف  
کہلاتے ہیں  
اور

کتابیں یہ بھی کہتی تھیں۔

چونکہ صوفیاء کا کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں کوئی قبیلہ نہیں  
ہے۔ اسلام صرف اسلام ہے صوفیا کرام کو اگر ٹولے کے طور پر سوچیں تو غلطی  
کریں گے۔ صوفیاء کرام یا ہر صوفی کا الگ الگ طریقہ ہے۔ الگ الگ واقعات ہیں۔  
ایک بات ہے کہ جو اچھی نیت سے سفر کر گیا۔ اس کو کہیں تضاد نظر نہیں آیا۔ اور یہ  
بھی ہے کہ تضاد رکھنے والا سفر نہیں کرتا۔ بس دیکھتا رہ جاتا ہے۔ وہ لوگ جن کو  
اصلاح باطن میسر آجائے وہ آگے پھر اصلاح باطن کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان  
کو صوفی کہا جاتا ہے۔ صوفیا کا آپس میں Comparison نہیں کرنا چاہیے۔  
تصوف علم نہیں ہے تصوف عمل ہے کرنے والے کا عمل! اس بظاہر سادہ انسان کو

دیکھ کر مل کر اور اس کی باتیں سن کر اس کے اندر سے ایک آواز اٹھ رہی تھی۔ جو اس کی تمام حیات میں شامل ہو کر 'جزو یقین بن رہی تھی! سچ ہے! حق ہے، ضرور ہے اس شخص کی باتوں میں روشنی ہے! حقیقت ہے عمل ہے اور کیفیت ہے! حق کی کیفیت۔ کیوں لگتا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ تماشہ نہیں کر رہا! حالانکہ اس کی بعض باتیں سمجھ نہیں آرہیں تھیں۔ مگر کہیں کچھ ایسا بھی ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔ مگر ہے! وہی دراصل حق ہے، اس کی باتیں جو فہم سے بالاتر تھیں۔ مگر دل کو بے اختیار بھاتی تھیں۔ مثلاً اللہ کا ذکر کراؤں گا۔

فنا فی الرسول کراؤں گا

نبی پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کراؤں گا

اور

حق واضح ہو جائے گا

اس نے دیکھا اس کے دل میں تسلی جیسی کوئی چیز پیدا ہو رہی تھی جو کسی بھی منفی سوال یا شک کو خاطر میں نہیں لارہی تھی، جس کا نرم ہاتھ اس کے دل پر تھا اور دل مدتوں بعد طمانیت جیسی کسی کیفیت سے آشنا ہو رہا تھا۔

اس کے بعد شیعہ مناظر نے تین چار سوالات کئے۔ اس کی ساری تقریر ان چند اعتراضات پر تھی۔ ایک فدک کا معاملہ تھا۔ خلافت کا معاملہ تھا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دفن کا معاملہ تھا۔

دوسرے دن جو جلسہ رکھا گیا تھا۔ اہلسنت کی طرف سے وہ دوسری مسجد میں تھا۔ جو شیعہ کے مرکز کے قریب تھی۔ وہاں صوفی نے خطبے میں فرمایا کہ میرے پاس شیعہ مقرر کے سوال پہنچ گئے ہیں۔ اور میں آج کی تقریر میں ان سوالوں کے جواب دوں گا اور علمی اعتبار کے حوالے سے دوں گا۔ لیکن صرف جواب نہیں دوں گا

سوال بھی کروں گا اور ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ سوال کریں مگر ساتھ ہی میں یہ بھی پورے یقین سے کہتا ہوں اور شیعہ حضرات بھی سن لیں کہ آپ کا عالم بھاگ جائے گا یہ جواب نہیں دے گا۔ اب شیعہ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ یہ اپنے عالم کو جانے نہ دیں اور اس سے میرے سوالوں کے جواب حاصل کریں۔

اس نے دیکھا اس کے بعد صوفی نے شیعہ مناظر کے سوالوں کے غلط اور استدلالی طور پر ایسے جواب دیئے کہ عالم دین سے لے کر عام دیہاتی آدمی بھی ان سے مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد صوفی نے کچھ سوال کئے اور جلسہ ختم ہو گیا۔ اس شیعہ عالم نے مختلف بیہانے بنا کر وہاں سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور وہ واقعی چلا گیا اس نے صوفی کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جس کا انہیں پہلے سے یقین تھا۔ یہ ملاقات بیہانہ بن گئی وسیلہ حق بن گئی!

ملک محمد اکرم اعوان قبائلی روایات اور اقدار کا باغی گولی کا جواب گولی سے دینے کا قائل مکمل دینا دار انسان ظلم و جبر کے خلاف سر عام آواز اٹھانے اور اس سلسلے میں کسی بھی مصلحت کو خاطر میں نہ لانے والا نوجوان، معاشرتی دباؤ سے ذہنی توڑ پھوڑ اور کشمکش میں سکون قلب کا متلاشی خدا کی زمین پر..... خدا کے کئی نام نہاد نام لیواؤں کی اصلیت دیکھ کر ان سے متنفر ہونے کے باوجود متلاش حق جاری رکھنے والا انسان! دیکھ رہا تھا اس راستے کو جو دور اس منزل کی طرف چاتا تھا جس پر روشنی تھی حقیقت تھی اور سچ تھا۔

اس کی شروع سے عادت تھی جس بات کو وہ اندر سے مان لیتا تھا۔ پھر اس کی چھان بین نہیں کرتا تھا۔

پھر اس کے لئے اسے کسی ہر دنی امداد یا گواہی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے اس نے بلا جھجک آگے بڑھ کر اپنی اک غرصہ کی طلب جستجو اور متلاش



اس ولی کامل کے سپرد کردی جو یقینی طور پر اسے سنبھالنے اور جاننے کا اہل تھا یعنی اس نے روحانی طور پر خود کو اس کامل انسان کے سپرد کر دیا۔ جس نے اس کے تمام اختیارات سنبھال کر بھی اسے با اختیار ہی رکھا کہ یہی صوفی کا اصل کام ہے۔

دیے بھی وہ جانتا تھا کہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت تجربے نہیں کرنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان بن جانا ہی اصل بات ہے۔

کیونکہ اللہ کے ساتھ تین درجے بزرگوں نے بتائے ہیں سرمد مدہ تو 'سگ تو' عاشق تو!

نا چیز اتنے کہ تیرے کوچے کے ہم سگ ہیں۔

اور مدہ اس لئے کہ تو معبود ہے

ہم تیرے غلام ہیں کارمد ہیں طلب۔۔۔ تیری ہے تیرے علاوہ ہم کسی اور شے کے طلبکار نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر شے فانی ہے دھوکا دے گی۔ ہر تمنا مگر اسی کی طرف لے جائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے محبوب ﷺ کی طرف محبت سے رجوع کرو!

پھر اسے محبت ہو گئی! اس محبوب سے 'جو محبوب حقیقی سے ملاتا ہے یہ محبت اپنے پھیلاؤ میں کائناتوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی کیونکہ یہ محبت محبوب خدا رحمت العالمین ﷺ کی محبت میں وجود کے تمام جغرافیے 'منطقیں اور کائناتیں منادیٰ والی محبت تھی ایسی محبت جو فنا فی الرسول ہو کر باقی ہو جاتی ہے قائم ہو جاتی ہے۔ کشف المحجوب میں ہے۔

بنی نوع انسان میں سے کوئی لڑا یا نہیں کہ جس نے محبت کا زخم نہ کھایا ہو یا

اس سے خوش نہ ہوا ہو۔ کبھی تو اس کا دل مست شراب ہے یا پھر قمر دوست  
 خراب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی ترکیب میں بے چینی ذبے قرار دی ہے اور  
 عقل بے کار ہے۔ محبت دل کی غذا ہے اور وہ دل جو محبت سے خالی ہے۔ مغل ہے۔  
 محبت کو کوشش اور محنت سے بنایا نہیں جاسکتا اور نفس ان لطائف سے بے خبر ہے۔  
 دل پر گزرتے ہیں۔

حضرت عمر بن عثمان مکی رحمۃ اللہ کتاب محبت میں فرماتے ہیں!

خداوند تعالیٰ نے دلوں (یعنی قلوب کو) جسموں سے سات ہزار سال پہلے پیدا  
 کیا اور مقام قرب میں رکھا اور روحوں کو دلوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور  
 درجات انس میں رکھا اور اسرار کو روحوں سے سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور  
 درجات وصل میں رکھا اور ہر روز تین سو ساٹھ بار لطیفہ سر پر تجلی فرمائی اور تین سو  
 ساٹھ بار نظر رحمت فرمائی اور محبت کے کلمات روح کو سنائے اور تین سو ساٹھ بار انس  
 کی نگاہ سے دل کو دیکھا۔

لیکن جب انہوں نے کائنات میں اپنے آپ کو معزز پایا تو ان کے اندر فخر پیدا ہوا  
 اس لئے حق تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر لطیفہ سر کو روح کے اندر روح کو دل کے اندر  
 اور دل کو جسم کے اندر قید کر دیا! اس کے بعد ان کے ساتھ عقل کو رکھا اور انبیاء علیہم  
 السلام کو بھیج کر احکام ارشاد فرمائے اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کو اپنے مطلوب  
 کی تلاش میں لگا دیا چنانچہ جسم کو نماز میں لگا دیا، دل کو محبت میں مصروف کیا روح کو  
 قرب میں اور سر کو وصل میں قرار حاصل ہوا۔ خلاصہ یہ کہ محبت کی حقیقت لفظ  
 محبت سے ظاہر نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ محبت ایک حال ہے اور حال ہر گز قال میں  
 نہیں آسکتا۔ اگر سارا جہان مل کر یہ کوشش کرے کہ محبت کو پیدا کیا جائے یہ ہرگز  
 نہیں ہو سکے گا اور اگر سارا جہان مل کر اس کو مٹانا چاہے تو ہرگز نہیں مٹا سکتا۔ کیونکہ

حال وہی (عطیہ) ہوتا ہے نہ کہ 'کبھی' (کوشش سے) انسان لایہی (حادث) ہے اور  
 حال (الہی) ہے لایہی ہر گز الہی پڑ قادر نہیں ہو سکتا! حضرت جی فرماتے ہیں۔  
 حضرت اللہ یار خان کی ایک خصوصیت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے سینے میں  
 جو کچھ ہے وہ اٹھنے کو بھی نصیب ہو جائے۔ اس میں ان کا رویہ تشدد کی حد تک چلا جاتا  
 تھا۔ اٹھنے کو مجاہدہ کی تلقین کرنے میں محنت اور اس کی اصلاح کرنے میں۔  
 کیونکہ ان کے اپنے معمولات ابتداً کچھ یوں تھے۔

فجر کی نماز سے دوپہر تک لطائف کرنا، پھر کھانا اور آرام کرنا۔ ظہر سے عصر تک  
 لطائف، پھر ضروریات سے فراغت کھانا پینا اور مغرب سے عشاء تک پھر ذکر، عشاء  
 کے بعد آرام اور تہجد کے بعد پھر ذکر یہ معمول آپ کا مسلسل سولہ برس رہا۔  
 میں نے بھی لطائف پر تقریباً تین سال صرف کئے ہیں۔ حالانکہ مینے کے اکثر  
 دن حضرت جی کی خدمت عالیہ میں گزارا کرتے تھے۔ ہم چند ساتھی جو اس دور میں  
 تھے۔ ہمیشہ مسلسل لطائف کیا کرتے تھے۔ کبھی سانس توڑنے کی نوبت نہ آتی تھی ہاں  
 اگر کوئی بیمار ہو یا کھانسی وغیرہ آجائے تو اور بات تھی مگر یہ بھی اس قدر کم ہوتا تھا کہ  
 یاد نہیں پڑتا۔

سردیوں میں میرے ساتھ ایک پرانے ساتھی 'بابا دوست محمد' (مرحوم) مقیم  
 تھے اور ملک خدا بخش ہوا کرتے تھے، تو میں سحری میں تقریباً ایک بجے اٹھ جاتا تھا۔  
 وضو اور نوافل سے فارغ ہو کر دوپہر لطائف شروع کر دیتا۔ اس قدر اندازہ ہو چکا تھا  
 کہ تقریباً ایک سادقت لطائف کو دے کر چار بجے تک سات لطائف پورے کر لیتا۔  
 اور چار بجے یہ دونوں حضرات شامل ہو جاتے پھر چوبیس بجے تک ہم صرف لطائف کیا  
 کرتے اور چوبیس بجے فجر کی نماز ہوتی تھی۔ میرے چار گھنٹے ہو جاتے اور ان کے دو تو ان  
 مسلسل چار گھنٹوں میں ہم سانس نہیں توڑا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آٹے

جبکہ کوئی چیز اٹھانا پڑتی تو لطائف کے مقامات یوں دہر کر مٹتے تھے جیسے سینے میں کوئی مضبوط میخیں گزی ہوں جو پشت تک چلی گئی ہوں۔

سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں صفائی باطن کے تین طریقے مقرر ہیں۔ رابطہ شیخ ذکر اور مراقبہ! صوفیاء کے نزدیک قرب الہی حاصل کرنے کا ذریعہ ذکر اللہ ہے۔ حضرت سید احمد رنائیؒ فرماتے ہیں

ذکر اللہ کی پابندی کرو۔ کیوں کہ ذکر وصال حق کا مقناطیس ہے قرب کا ذریعہ ہے۔ جو اللہ سے مانوس ہو جاتا ہے وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ذکر کی عملی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جس کو پیر شیخ یا مرشد کہا جاتا ہے۔

رہنما مل گیا تھا۔ جانب منزل پاؤں اٹھ چکے تھے اب تو سفر ہی شوق تھا سفری خیال تھا سفر ہی آرزو تھا، سفر جو کہ روحانی لحاظ سے تو کبھی بھی تپانہ جاسکتا تھا مگر مادی لحاظ سے جو منارہ سے چکڑالہ تک کا تھا چکڑالہ میانوالی ضلع کا ایک گاؤں تھا جو منارہ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ ان دنوں بسوں کے ذریعے سفر ہوتا تھا۔ سیتھی نے منارہ، منارہ سے چیل۔ چیل سے تلہ گنگ، تلہ گنگ سے دندہ شاہ بلاول اور وہاں سے چکڑالہ تک پیدل سفر تھا۔

گھر سے علی الصبح نکلتے تو عصر تک وہاں پہنچ جاتے۔ اس وقت بسیں بھی کم کم چلتی تھیں، ہر سٹاپ پر رک کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں دو آنے کا چائے کا کپ ملتا تھا۔ اگر پانچ روپے پاس ہوتے تھے تو آتے جاتے وقت راستے میں چائے کے ساتھ ساتھ کرائے کیلئے بھی کافی ہوتے تھے۔

میں عموماً عصر سے پہلے دندے پہنچ کر وہاں سے چائے پیتا اور پھر عصر کی اذان حضرت کی مسجد میں جا کر کرتا۔ اذان سن کر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں پہنچ گیا ہوں

گویا۔ اذان میرے وہاں پہنچنے کی ایک طرح سے اطلاع ہوتی۔

وہ سخت طبیعت کے بزرگ تھے، ذکر اذکار اور تربیت پر زیادہ زور دیتے تھے مغرب سے مشائخ ذکر، پھر نماز کی ادائیگی چند گھنٹے آرام اور تہجد سے پہلے ذکر پھر نماز و عبادات۔ ان کے معمولات اتنے سخت تھے کہ عام طور پر ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ مگر ان سے بات کرنا کچھ زیادہ ضروری بھی نہیں ہوتا تھا اس کو دیکھ لیا ان کے ہمراہ نماز و ذکر کی ادائیگی ہو گئی یہی بہت ہوتا تھا۔

ان سے کوئی ایسا تعلق بن گیا تھا کہ جیسے پیاس لگتی ہے تو انسان پانی کی طرف بھاگتا ہے پانی پی لیتا ہے تو کچھ دیر کیلئے اسے طمانیت ہی محسوس ہوتی ہے مگر پھر جب پیاس لگتی ہے تو پھر پانی کی طلب ہوتی ہے ایسی ہی پیاس کی کیفیت ہوتی تھی ان دنوں۔ حضرت سے ملنے کی پیاس۔ ان کو دیکھنے کی پیاس۔ ذکر اذکار کی پیاس۔ اس لیے میں ہر پندرہ روز کے بعد چلڑالہ پہنچ جاتا تھا دو چار روز کے قیام ملاقات ذکر اور عبادات کے بعد تازہ دم ہو کر واپس آنا چند روز گزرتے تو پھر وہی پیاس اور یہ سلسلہ حضرت کے ساتھ پہلی ملاقات سے شروع ہوا تو پھر ان کے وصال تک یونہی چلتا رہا۔

جیسا کہ شیخ طریقت کے لئے لازمی ہے کہ اپنے مریدین اور طالبان حق کی اس طرح دیکھ بھال اور تربیت کرے کہ ہر مرید اور خائب کو استعداد اور ظرف کے مطابق تعلیم دے۔ جس طرح پرندے پالنے والا پرندے کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتا ہے کہ وہ ہر پرندے کے پوٹے سے واقف ہوتا ہے اور اس کے حسب حال اس کو خوراک دیتا ہے۔

اسی طرح حضرت جی تربیت میں طالبان کے ساتھ بالکل ایسا ہی رویہ اختیار رکھتے تھے۔ ہم چار پانچ ساتھی ہوا کرتے تھے سب کو ان کی استعداد کے مطابق اسباق

دئے جاتے تھے، زور ذکر الہی اور عملی زندگی میں فعالیت پر تمام مقامات کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ شروع شروع میں جماعت چند افراد پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد وہاں نبویؐ سے حضرت اللہ یار کو فیض نام جاری کرنے کا حکم ہوا، تو آپؐ نے ذکر اللہ اور روحانی بیعت کے ذریعے حق کا پیغام نام کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ آپؐ کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔ جماعت کی تعداد بڑھنے لگی۔ جماعت کا پہلا اجتماع ۱۹۶۱ء میں ڈھوک ٹیالہ ہوا۔

جس میں چند رہنما تھے شریک ہوئے۔ ڈھوک ٹیالہ (ملک اکرم اعوان صاحب کا ذریعہ) چونکہ کھیتی گاؤں سے آگے پہاڑوں کے درمیان جنگل میں واقع تھا۔ ناکافی سولتیس پانی کی کمی اور دشوار گزار پہاڑی راستے کے باوجود اجتماع پورے اہتمام سے ہوا۔ وہاں سے ایک طرح باقاعدہ جماعت کی ابتدا ہوئی۔ جو بعد میں آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوئی۔

شروع شروع میں چالیس پچاس کے قریب لوگ ہوتے تھے۔ اس کے بعد تعداد بڑھنے لگی۔ ڈھوک پر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے چونکہ موسم اچھا ہوتا تھا اس لئے حضرت اللہ یار خانؒ گرمیوں میں وہاں ایک ڈیڑھ ماہ قیام فرماتے تھے۔ انہی دنوں اجتماع ہوتا تھا۔ جنگل میں تالابوں سے پانی بھر کر لانا، اسنے لوگوں کے قیام و طعام کا انتظام کرنا اور ذکر اذکار اور عبادات میں بھی پوری طرح شامل ہونا۔ بظاہر مشکل لگتا ہے۔ مگر خدا کی رحمت سے سب کچھ خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ ڈھوک پر تقریباً آٹھ برس باقاعدگی سے اجتماع جاری رہا۔ اس کے بعد حضرت ملک محمد اکرم اعوان (جو کہ ان دنوں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے) کی پوسٹنگ ذوالہال ہو گئی، تو دو سال وہاں اجتماع ہوا۔ سکول کے اندر، اس کے بعد ان کی تبدیلی نور پور ہو گئی۔ تو سالانہ اجتماع نور پور منتقل ہو گیا۔ جو تقریباً دو سال تک وہاں چلتا

رہا۔ پھر حضرت جی منارہ سکول میں تعینات ہوئے تو سالانہ اجتماع منارہ میں ہونے لگا۔ جو تقریباً آٹھ برس تک وہیں باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ تا آنکہ دارالعرفان کی ۸۱ء میں تعمیر ہوئی اور اس کے بعد مستقل طور پر جماعت کا مرکز دارالعرفان منارہ بن گیا۔

اجتماعات اور جماعت کے پھلنے پھولنے کے دنوں کے بارے میں حضرت اللہ یار خانؒ کے مکتوبات سے جو انہوں نے مختلف ساتھیوں کو ۶۳ء سے ۸۰ء تک وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں۔ کافی معلومات ملتی ہیں۔ میں ان مکتوبات سے چیدہ چیدہ باتیں موضوع کے لحاظ سے 'یساں تاریخ وار درج کر رہی ہوں۔ صرف اس لئے کہ قارئین کو پتہ چلے کہ کن منازل، مشکلات، کڑے مجاہدے اور روحانی مراحل سے گزر کر اللہ والوں کی یہ جماعت عہد حاضر کی تنظیم الاخوان اور سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی موجودہ شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ یہ مکتوبات ایک لحاظ سے جماعت و سلسلہ کے ارتقا کی تاریخ بھی ہیں اور راہ سلوک کے مسافروں کے شب و روز کی پر نور داستان بھی۔

## اقتباسات

مکتوبات جناب مولوی محمد فضل حسین

از

حضرت مولانا اللہ یار خان

از چکڑالہ

میں پیر نہیں ہوں نہ بیعت لیتا ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو کتا سے بھی رزیل جاننا ہوں۔ پیری کے قابل کہاں۔

ہاں میرے رب کو منظور ہو تو بیعت رسول اللہ ﷺ سے کراتا ہوں۔ جو پیر مرشد شافع امت ہیں۔ ہاں اتنی عرض کروں۔ اس سلسلہ سلوک میں 'ہم منازل طے کراتے ہیں۔ جب میرے رب کا فضل شامل حال ہو تو۔ آپ کو اس بدکار سے بلا کر اس وقت کوئی آدمی نہ ملے گا۔

میں 63-7-18 خود کیس باہر ایک دو جلسہ پر چلا گیا تھا۔ دوم سخت گرمی ہے۔ سوم کچھ نئے ساتھی حلقہ ذکر میں آچکے تھے خیال تھا کہ خدا تعالیٰ مہربانی فرما کر اپنے فضل و کرم سے ان کو فانی الرسول تک پہنچا دے۔ وہ ہو گیا۔



16-10-63

سرگودھا 5-10-63 کو تمام رفقاء نے شام تک بڑا انتظار کیا۔ بار بار جناب کا ہم لیتے تھے۔ مگر آخر مشائخ سے علم ہوا کہ آپ نہیں آئیں گے۔ اگر آپ آجاتے تو جناب کو تمام مشائخ حتیٰ کہ قطب الاقطاب صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا۔ آپ کی ترقی کے لئے عرض کی جاتی۔ انھارہ سال آپ نے خدا کی راہ میں لگائے ہیں وہ محنت ضائع کرنے والی ذات نہیں ثواب تو ملے گا۔ آپ کو علم نہیں سولہ سال تو بندہ نے بھی لگائے ہیں اس کے بعد معمولی پانی کی بوندیں پھونکیں۔ بیس سال کے بعد دریا کی لہریں شروع ہوئیں۔ بائیس سال کے بعد دریا طغیانی میں آیا۔ ساڑھے تیس سال بعد سمندر کی ٹھانٹیں شروع ہوئیں۔ آپ یاد رکھیں مقام احدیت سے سلوک شروع ہوتا ہے اور کمالات اولو العزمیٰ تک نصف سلوک ختم ہوتا ہے۔ آگے آدھی یعنی نصف ولایت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے عزیزم! میں تو اب مشائخ و حضور ﷺ کی طرف سے مجبور ہوں کہ تبلیغ کرتا ہوں۔ تعلیم کتابوں کی دیتا ہوں۔ قدرے دنیا کے کاروبار کرتا ہوں۔ توجہ ذکر، تعلیم سلوک دیتا ہوں ورنہ دل چاہتا ہے ایک میں ہوں ایک میرا رب ہو۔ درمیان دوسرا کوئی حائل نہ ہو۔

10-4-64

میں نے درخواست پیش کی تھی حضرت مدنی مدظلہ کی خدمت میں پیش کرنا۔ وہ مجھے غلوں سے تھی کہ یہ چیز یعنی علم باطنی دنیا سے اپنا مقام کھو بیٹھا ہے۔ اس علم کا بازار بے رونق ہو چکا ہے۔ اس کے متلاشی و طالب نادر ہو چکے ہیں۔ میں نے پاکستان کے گوشہ گوشہ کو دیکھا اس کا صحیح طالب نہ پایا۔ جو پایادہ طالب عزت و طالب جاہ و طالب مال پایا۔ میں نے خوب سمجھ لیا ہے کہ طالب رضائے مولا نادر ہے۔ جو تصوف کا دم بھرتا ہے وہ محض اس کو ذریعہ معاش جان کر!

مولانا! میں نے خوب سمجھ لیا ہے پیروں کے لئے پیری حجاب ہے مولوی کے لئے مولویت ہی حجاب ہے۔ سابقہ بار حضرت صاحبؒ کی خدمت میں بارہ آدمی نفاذ الرسول کے لئے پیش کئے گئے تھے۔

5-4-64

کوبائیس پیش کئے تھے۔ اس بار سخت حکم دیا مشائخ نے جلدی کو خیر باد کہیں محنت کرایا کریں۔ کافی وقت بعد مراقبات کرائیں۔

ملک محمد اکرم جناب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کا تبادلہ ذلوال ہو گیا ہے۔ اب پھر سابقہ مقام نور پور میں ہو جائیگا۔ پروفیسر حافظ عبدالرزاق اور ملک محمد اکرم کو توجہ کی اجازت ہو چکی ہے!!

29-6-64

گرمیوں میں تمام رفقا کو دو ماہ کی رخصت ہوگی۔ تو جنگل میں واقع ذریعہ میں قیام کرنا ہے۔ وہاں آپ بھی آجائیں۔ مل کر معمول کرنے سے زیادہ نورانیت پیدا ہوتی ہے عزیز! اہل اللہ کا وجود تو دنیا سے ناپود ہو چکا ہے۔ چند دن ہوئے کہ غوث اعظم کے پاس یہی مسئلہ پیش ہوا۔ تو فرمایا کہ دنیا میں اس وقت تین آدمی ہیں جن سے مخلوق کو فیض ہو رہا ہے۔ ان میں سے تیز فیض اس بدکار دنیا کا بتایا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ہیرے و موتی پیدا ہوں گے۔ جو دین محمدیؐ کی صحیح خدمت کریں گے میں سنگ ریزے جمع کر رہا ہوں شاید ان میں کوئی لعل یا کچھ موتی نکل آئیں۔ آپ اللہ والوں کی جماعت میں داخل ہیں۔ اس جماعت سے بڑھ کر کوئی خدا کے ہاں مقبول جماعت نہ ہوگی۔



حضرت ملک اکرم اعوان و عبدالقدیر اعوان



فیصل آباد ریلی میں

## اقتباسات!

حافظ غلام قادری صاحب کے نام مکتوبات سے

21-9-66

انسان کو انسان بنانا تو کمال نہیں درندوں کو انسان بنانا کمال ہے، تم کسی کو دین کی تعلیم دینا چاہتے ہو ذکر الہی میں مشغول رکھنا چاہتے ہو۔ حضرت صاحب ناراض ہوں گے ہرگز نہیں۔ نرمی اور اخلاق سے پیش آئیں۔ استاد کا رعب کسی پر نہ ڈالا جائے گا بلکہ خادم ہونے کا ثبوت دیا جائے۔

24-6-69

میں انشاء اللہ تعالیٰ نور پور سیتھی متصل سڑک اس بار ڈیر الگاؤں کا چودہ دن کے لئے قیام کروں گا کوئی ساتھی چھٹی پر آئے تو 12-7-69ء تک نور پور آسکتا ہے۔

3-9-69

وقت نازک ہے الحاد کا زور ہے خدا کے بندے بن جاؤ۔ جو انعام تم پر ہے وہ

غیروں پر نہیں۔ دنیا داروں کو اگر دنیا کی رسیاں ملتی ہیں تو ہم کو بفضل اللہ دربار نبویؐ میں ملتی ہیں جس پر ساری دنیا کی کرسیاں قربان ہیں۔

16-10-69

عزیزم خوب سمجھ لو! ابد الیت 'نجبائیت' 'نقبائیت' 'اوتادیت' 'قطبیت' 'قومیت' 'افرادیت'، 'قطب و حدیت' 'صدیقیت' یہ مناصب ہیں اولیاء اللہ کے۔ حتیٰ کہ قومیت تک ہر منصب رسول اکرم صلی اللہ کی جوتیوں سے نصیب ہوتے ہیں ہر طرف کوشش کریں کہ اتباع شریعت کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

30-6-70

میں انشاء اللہ 4-7-70 کو منارہ چلا جاؤں گا۔ اس دفعہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت بفضل اللہ بھاری تعداد میں منارہ آئے گی۔ منارہ کی جماعت کی کوشش ہے کہ طلباء ہمراہ لانا۔ روٹی لٹکر کی کرایہ مدرسہ کا ہو گا۔

10-8-70

اس بار دورہ بے حد مفید رہا۔ جماعت کم و بیش ہو جاتی تھی مگر ستر اسی آدمی حاضر ہی رہتا تھا۔ پورا دورہ منارہ ہی ساتھیوں کو روحانی فائدہ بھی بے حد ہوا۔

15-12-70

میرا ارادہ بالی ایئر جج پر جانے کا ہو چکا ہے۔ کیونکہ ملک محمد اکرم آیا تھا اور منع کر گیا ہے کہ بحری سفر نہ کریں 'آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے نذر کیا۔ تو جیسا کہ اس کی عادت ہے کہتا تھا 'ہم سب کو اور پاکستان کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔

25-5-81

رب العالمین کا جماعت پر بے حد فضل ہے۔ تمام مناصب اولیاء اللہ

اخیار۔ امدار۔ اوتاد۔ نجباء۔ نقباء۔ امامین۔ مکتومان۔ ابدال۔ انقلاب۔ غوث۔ قیوم۔  
 افراد۔ قطب وحدت۔ صدیق۔ یہ تمام مناصب منتقل ہو کر ہمارے سلسلہ میں آچکے  
 ہیں۔ حج سے واپسی پر قطب مدار جس کو قطب تکوین کہا جاتا ہے اور قطب عالم بھی یہ  
 زندہ تھا سلسلہ قادر یہ کا۔ چند دن ہوئے وہ بھی فوت ہو گیا۔ دربار رسالت مآب سے  
 معلوم ہوا۔ یہ مناصب مناسب حال رفقاء کو خدا تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ ان کے حالات  
 میں نے مختصر انیو ضات حرمین میں لکھ دیئے ہیں۔ یہ ایک ایک منصب والے کافی  
 کافی تعداد میں ہوتے ہیں۔ کوئی تین سو۔ کوئی ستر۔ وغیرہ ذلک البتہ قطب  
 مدار۔ غوث۔ قطب وحدت۔ اور صدیق یہ مناصب ساتھیوں کے لئے میری حیات  
 میں مشکل ہیں بعد میں جس کو میرا رب چاہے گا عطا کرے گا۔

20-6-72

رات کو عزیزم ملک محمد اکرم صاحب و حافظ غلام جیلانی صاحب تشریف لائے  
 تھے۔ منارہ کا پروگرام بنا گئے۔ دیری لا جہ قلت پانی ہے۔ منارہ میں پانی کی سخت قلت  
 ہے۔ اس واسطے اجتماع کی دعا 16-7-74 مقرر ہوئی ہے 16-8-72 تک ایک ماہ  
 ہے۔ ہندوستان میں بڑی بھاری جماعت بن گئی ہے۔ دو کر تل۔ انصارہ۔ میجر کیپٹن  
 وزیریں طبقہ بے شمار ہے۔

30-4-72

میں عمرہ سے واپس آیا تو شدت گرمی تجلیات حرم شریف و خاص کر قرب دربار  
 نبوت کی فینش و توجہ رسالت مآب ﷺ کی وجہ سے خزاں اور شدت گرمی قلب میں  
 مبتلا ہوا۔ آج دو دن سے قدرے آرام ہے۔ پھر جماعت بھی عمرہ کی وجہ سے مسلسل  
 آ رہی ہے۔ آج چونکہ راولپنڈی و اسلام آباد میں سخت خطرہ ہے۔ تمام اولیاء ہند و پاک  
 کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس سے پھر دل پر بڑا اثر پڑا۔ خلاصۃ الکلام آپ سے

درخواست ہے کہ آپ منارہ کافی وقت لے کر آنا کہ آپ کی پوری تکمیل ہو جائے۔  
اور آپ کو صاحب مجاز خلیفہ بنادیا جائے کہ آگے آپ کام کر ملیں۔ منارہ کے دورہ کی  
تاریخ 7-6-77 سے 7-7-77 تک تقریباً 36/38 دن مقرر ہوئی ہے۔

15-2-74

میں 31-01-74 کو گھر آ گیا تھا۔ (دوسرے حج سے) رات قیام چکوال  
تھا۔ جماعت راستہ سے کافی ملتی رہی۔ میجر غوث ساہیوال سے ہمراہ ہوا۔ گوجرانوالہ  
سے لاہور کی جماعت کے ہمراہ واپس ہوا۔ جہلم جماعت، سپیشل بس اور دو کاریں  
لائے تھے۔ چکوال جماعت تقریباً ۳۰۰ آدمی، سرگودھا پنڈی تک جمع ہو گئے  
تھے۔ جنگلی قیدی احباب سے ساتھ آدمی پاکستان آ گئے۔ وہ تمام جمع ہو کر 19-2-74  
کو چکڑالہ آرہے ہیں۔ اس بار حج پر بے حد انعامات روحانی حاصل ہوئے۔ پوری  
جماعت مالا مال ہو گئی۔ بفضل اللہ۔

اس کے بعد  
ملک مختار احمد صاحب کے نام مکتوبات سے

## اقتباسات

9-3-78

دورہ منارہ 28-2-78ء سے 2-8-78 تک مقرر ہوا، یعنی 28 جون سے دو اگست تک رہے گا۔ نئے چارپانچ کرئل حلقہ میں آگئے ہیں۔ جماعت دن دگنی رات چو گنی ہو رہی ہے۔

13-12-78

عزیزی! 7-12-78 کو جماعت آئی تھی 'ستر' اسی آدمی تھے۔ نوکرئل چو بیس میجر تھے۔ ملک محمد اکرم صاحب و حافظ صاحب بھی تھے۔ دارالعرفان مسجد کی مکمل تیاری ہو گئی۔ چند دن تک تعمیر شروع ہو جائے گی۔

مولوی عبدالغفور صاحب کے نام مکتوبات سے چند اقتباسات :

8-10-79

منارہ کا دورہ بعد رمضان متصل ہو گا۔ تیرہ چودہ اگست عید ہو گی۔ اگست کی انیس کو دورہ شروع ہو گا اور چالیس دن مسلسل رہے گا۔



ایک اور مکتوب

منارہ کا دورہ تین جولائی سے 8 اگست تک مقرر کر دیا گیا ہے۔ آپ کو جتنا وقت ملے وہ نکال کر اس وقت کو غنیمت سمجھنا اور منارہ قیام کرنا کہ آپ کی تکمیل ہو۔

28-1-80

عزیز صوفی مختار صاحب! کابل کے مسلمانوں اور خاص کر مجاہدین کے لئے ہر نماز اور ذکر کے بعد دعا طلب کرنا۔ یہی حکم دربار رسالت سے معلوم ہوا۔ باقی آپ کی تحریر سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمہ تن مجاہدین کی طرف متوجہ ہیں۔ اور روحانی کمک بدستور ان کی امداد کے لئے بھیج رہے ہیں۔ لہذا خاص کر ہماری جماعت کا فرض ہے کہ وہ دعا کی امداد کریں۔

تصوف کے بارے میں 'لوگوں میں کئی طرح کی کہانیاں' پر اسرار واقعات اور عقل و فہم سے ماور باتیں مشہور تھیں 'لوگ تصوف کو کبھی فلسفہ' کبھی اخلاقیات' کبھی نفسیات' کبھی بے عملی اور زندگی سے گریز کا رویہ' کبھی کیونزیم کا اہمائی نمونہ اور کبھی ذہن کی پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کا طریقہ سمجھتے تھے۔ (حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں) بعض طاقتوں کی طرف سے بیعت اور تصوف کے سلسلوں کو دین سے خارج قرار دینے کی 'کوششیں جاری تھیں۔ انگریزوں نے مدراس میں جو تھیوسوفیکل سوسائٹی قائم کرائی تھی۔ اس کے بنیادی مقاصد میں سے یہ تھا کہ لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ روحانی مدارج حاصل کرنے کے لئے بیعت کی ضرورت نہیں۔

اس پس منظر میں حضرت اللہ یار خان کی پوری مساعی 'عوام الناس کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی ان تمام خرافات اور شکوک کے رد کے سلسلے میں جاری تھی 'آپ تقریروں' تحریروں' مکتوبات اور ارشادات کے ذریعے 'لوگوں کو تصوف کی اصل روح کے بارے میں بتاتے تھے۔ وہ راہ سلوک میں مجاہدات اور عبادات کے ذریعے 'اللہ کے بندوں کی جماعت تیار کر کے انہیں بارگاہ رسالت میں روحانی بیعت کے لئے پیش کرتے تھے!! انہوں نے ظاہری بیعت کی اس سلسلہ میں کبھی ضرورت محسوس نہیں کی 'مگر' ۷۷ء میں انہیں بارگاہ رسالت سے ظاہری بیعت لینے کا حکم جاری ہوا۔ جو ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

”میں آپ کو سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں بیعت کرتا ہوں اور اس کی نسبت آپ کا عطا کرتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی ظاہری بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ تمام پرانے ماضی، ارکان سلسلہ عالیہ، جو فانی الرسول ہو کر روحانی بیعت سے مشرف ہو چکے تھے، ظاہری بیعت سے سرفراز ہو گئے۔

اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دینے کا نام ”بیعت“ ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ یہ بیعت ہمیشہ اس بے گزیدہ شخص کی وساطت سے عمل میں آتا ہے جو اس سنجیدہ اور مستقیم بالشان معاملہ میں وسیلہ بننے کا مجاز ہو۔ یہ بیعت جب کہ صحیح شخص کے ہاتھ پر پورے آداب و شرائط کے ساتھ کی جاتی ہے، وہ سلسلہ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ اور اصل باللہ تک جا کر منتہی ہوتی ہے۔

صوفیاء میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو خود بڑے پائے کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں اللہ درجات بھی دیتا ہے۔ لیکن انہیں آگے تقسیم کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کو اس لئے نہیں بتاتے کہ وہ خلل سے کام لیتے ہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ان کو تقسیم کرنے کی استعداد ہی نہیں دی جاتی۔ بڑے قبل وہ ہوتے ہیں۔ جنہیں تقسیم پر لگا دیا جاتا ہے۔ خیر القرون کے بعد نبی علیہ السلام کا عہد، پھر صحابہ کرام کا عہد، پھر تابعین اور تبع تابعین کا ان تین صدیوں کے بعد جتنے بھی ولی اللہ ہوئے ہیں ان میں بڑے بڑے اعلیٰ نام ہیں۔ انہوں نے بھی رات و ناز میں پانچ دس خاص آدمیوں کو ذکر اذکار کرایا، باقی اگر چار یا پانچ لاکھ یہ بھی ان کا مرید ہو تا تھا، تو زبانی اذکار بتاتے تھے۔

شاید ہر عہد کی ایک اپنی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے جب حضرت کو فیض نام کا حکم ملا تو آپ نے ہر آنے والے کو خواہ وہ بدھ تھا یا لی لی، چھ تھا یا یوزجا۔ امیر تھا یا

فریب نہ چڑھا لکھا تھا یا ان پڑھ۔ اور یہ چودہ سو سال میں پہلی دفعہ ہوا۔

حضرت جی فرماتے ہیں۔ میرے ذاتی مشاہدے میں یہ بات ہے کہ حضرت اللہ یار ذات کی ذات سے اللہ کریم نے یہ کام لیا کہ وہاں ہر آنے والا صوفی ہے۔ مسجد کے حوض میں جو پانی بھرنے والا ہے وہ بھی فنا فی الرسول ہے۔ جو ملاقاتی بھی آیا اسے صرف زبانی و ظائف یا اصلاح پر نہیں رکھا بلکہ اسے کیفیات قلبی دیں تو اس پائے کے جو لوگ ہوتے ہیں ان کی ہر ادا میں انفرادیت ہوتی ہے۔ ایک بندے کو اللہ نے ایسی فضیلت سے نوازا ہے کہ کئی صدیوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی اس شعبہ میں۔ جو ایسا سلیکٹ ہند ہوتا ہے اسکی ہر ادا میں ایک دلنوازی یا دل فریبی کی بات ہوتی ہے بندہ اس میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ میں تو ان کی ذات میں ایسا ڈوبا کہ اپنے آپ کو الگ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی میری کوئی حیثیت ہے اگر سوچوں تو حضرت کے علاوہ میرا نہ ہونا ہی میرے پاس رہ جاتا ہے۔

زندگی کے اندر ڈالتے اور کیفیت بدلتے رہتے ہیں۔ شیخ آپ کی کیفیت کے اندر رہنے والے احساس کا نام ہے۔ یہی خیال آپ کو زندگی کے تذبذب کے لمحوں سے چلتا ہے تصور شیخ زندگی میں لمحہ لمحہ رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ کہ کیا کرتا ہے۔ تصور شیخ فارموا بھی ہے کوشش بھی ہے۔ عطا بھی ہے شیخ کا تصور انسان کے دل سے ہر نقش محو کر دیتا ہے۔ سب پریشانیاں دور کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو باقی ہر تصور سے آزاد کر دیتا ہے۔ نہ کوئی خیال نہ کوئی وہم۔ شیخ نے آزاد کر دیا اور آزادی میں امیری عطا کر دی کہ اسی تصور میں رہے گا۔ اسی خیال میں رہے گا۔ اسی احساس میں رہے گا۔ یہ امیری ہی نجات ہے کہ آدمی لغزش سے محفوظ ہو گیا۔

حضرت اللہ یار خان کے ساتھ زندگی ایک مسلسل مجاہدے اور ریاضت میں گزری۔ مزدوری بھی کی زمینداری بھی کی دوستیوں اور دشمنیوں کے درمیان حد

اعتدال کے ساتھ دنیا داری بھی کی اور اس کے ساتھ ساتھ جماعت سازی میں بھی جو خدمت اللہ کریم نے نصیب کی، حسب توفیق کچھ چاکر نہ رکھا۔ حضرت اس بات پر بہت خوش تھے، اللہ کریم نے مجھ پر خاص احسان فرمایا، بہت نوازا مجھے۔ بارگاہِ نبویؐ میں خادم کی حیثیت سے قبول کیا اور راہِ سلوک کے مسافروں کی خدمت کے لئے بھی منتخب کیا۔

علم قرآن کے بارے میں یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جس طرح کی زندگی ماضی میں میں نے گزاری تھی، اس میں پے در پے حادثات کی وجہ سے اعلیٰ دینی اور دنیاوی علوم حاصل کرنے کا مجھے موقع نہ مل سکا، یہی وجہ تھی کہ سوائے حضرت کے زیر سایہ رہنے اور قلبی و باطنی تربیت کے میرے پاس اس ضمن میں کچھ نہ تھا۔ حضرت جی کو تفسیر قرآن کریم کے لئے فرصت میسر نہ آئی، آپؐ نے صرف ”تفسیر آیات اربعہ لکھی۔ (لہذا یہ کام روحانی طور پر آپؐ کے جانشین کے سپرد ہوا) میں نے ان دنوں حضرت جی کی ہمراہی میں بیت اللہ شریف پر حاضری دی، تو پہلی نگاہ بیت اللہ شریف پر ڈالتے وقت اپنے لئے ”علم لدنی“ کی دعا کی، جو قبول ہوئی اور اللہ کریم نے مجھے فہم قرآن عطا فرمادیا۔ جو اسرار التزیل کی دس جلدوں کی صورت سب کے سامنے ہے۔

یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے، میں حضرت جی کے ہمراہ تھا، روضہ اطہر سے رخصت کا وقت تھا۔ حضرت سر جھکائے دست بستہ پر گاہ کی طرح لرزاں کھڑے تھے اور اس شدت سے رو رہے تھے کہ جسے زار و قطار کما جائے تو غالباً مفہوم ادا نہ ہو۔ اس قدر مضبوط اور عظیم انسان، جس نے مردانہ وار ہر اس طاقت کو لاکاراجو اسلام کے خلاف ابھری اور زندگی بھر عصمت رسول ﷺ اور عصمت صحابہ کی پاسداری کی، جسے میں نے مفرد حنفی میں ہنگاموں اور اجتماعات میں تمنا کی و علیحدگی میں چٹان سے بھی

منہبوط پایا اس ہستی کو اس طرح ٹوٹتے بکھرتے اور قدموں پر ٹٹار ہوتے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ آپ کی یہ آخری حاضری ہے۔ اور پھر شاید اس مادی جسم کے ساتھ حاضر نہ ہوں۔ اس کے بعد کتنے پروگرام عمرہ کے لئے، حرمین شریفین کی حاضری کے لئے مگر حضرت وہاں حاضر نہیں ہوئے!

پھر لنگر مخدوم کے پروگرام پر حضرت جی نے سلسلہ عالیہ کے لئے خصوصی احکامات و ہدایات ارشاد فرمائیں 'انہوں نے فرمایا' مجھے لگتا ہے شاید اگلے اجتماع میں 'میں آپ کے ساتھ نہیں آسکوں گا۔ وہیں حضرت جی نے مجھے اپنے جانشین کے طور پر نامزد کیا۔ جس پر میں نے عرض کیا تھا کہ جماعت کی ذمہ داری دینا ہے تو میرے علاوہ کسی کو دیجئے گا۔ چونکہ میں آپ کے پاس پیر بننے یا گدی نشینی کیلئے نہیں آیا، میں اپنی اصلاح کے لئے آیا تھا۔ وہ ہوئی یا نہیں، مجھے منزل ملی یا نہیں، میری عمر یہاں اسکی جستجو میں لگ گئی اور میں الحمد للہ اس پر خوش ہوں۔ مگر یہ پیری اور یہ کام میرے کرنے کا نہیں ہے، آپ بے شک جسے مناسب سمجھیں اس کے ذمے لگا دیں، میں اس کے ساتھ بھی اسی طرح تعاون کرتا رہوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ آپ نے اس کے باوجود یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی، دو ساتھی اور بھی آپ نے نامزد کئے اور فرمایا کہ یہ جو ہیں انہیں بھی میں مقرر کرتا ہوں، لیکن یہ فانی الرسول میں بیعت نہیں کرا سکیں گے۔ یہ منصب ایک ہی آدمی کا ہو گا، جسے یہ بھی تیار کریں گے، بیعت کے لئے اسی ایک بندے کے پاس لے جانا پڑے گا۔

پھر 1984ء فردری اٹھارہ کو حضرت جی اس جہاں فانی سے پردہ فرما گئے۔ (ان کے وصال اور تدفین کے حالات اس کتاب میں ان کے متعلق مولانا محمد اکرم اعوان کے تحریر کردہ مضمون میں درج ہیں)۔

یاد رہے کہ جب بھی کوئی عظیم انسان دنیا سے اٹھتا ہے، تو اگرچہ اس کی خالی کردہ

جگہ پر نہیں کی جاسکتی۔ مگر اسے ہر کس و ناکس کے لئے خالی بھی نہیں چھوڑا جاسکتا ورنہ جس قدر عظیم فوائد حاصل ہو رہے ہوتے ہیں ان سے بڑے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ حضرت دار دنیا سے پردہ فرما گئے۔ مگر وہ سلسلہ نقشبندیہ اولیہ کے اس دور کے بانی شیخ تھے، ہیں اور رہیں گے۔ نسبت اولیہ روح سے روح کے مستفید ہونے کا نام ہے۔ اور دنیا و مافیہ زرخ روخ سے استفادہ یکساں ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص خدمت عالیہ میں حاضر ہو سکتا تھا۔ اور زرخ میں کسی ایسے آدمی کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ جو زرخ تک اس کی رہنمائی کرے اور وہاں تک آدمی کو پہنچائے۔ اور ایسا وہی شخص کر سکتا ہے جو ان حضرات کا خادم یا نمائندہ ہو۔ فیض انہی کا ہوتا ہے۔ مگر اس کی تقسیم اس ایک وجود کے ذریعے ہوتی ہے۔ اسی کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔

خلیفہ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو اس کا قائم مقام ہو اس کی جگہ پر کام کرے اور وہ شخص اسی عزت و احترام کا مستحق ہوتا ہے۔ جو اس کے شیخ کے لئے ضروری ہے کہ یہ عزت اس کی ذات کی نہیں بلکہ اسکے منصب اور مقام کی ہوتی ہے۔ خلیفہ ایک دم سے نہیں بنتا اس کی پیچھے کڑی ریاضت، مجاہدے اور تربیت کی بہشتی ہوتی ہے جس سے راہ سلوک کے اس طالب نے کندن بن کر ٹکٹنا ہوتا ہے۔ سلاسل کی قیادت نصیب ہونا آسان نہیں۔ رحمت خداوندی۔ اتباع رسول اور توجہ شیخ کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ یہاں توجہ اور درپردہ تربیت کے بارے میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

یہ 1962/63ء کی بات ہے کہ ہم حضرت اللہ یار خانؒ کے ساتھ موہڑہ کور چشم میں مقیم تھے۔ غالباً ہفتہ عشرہ کا اجتماع تھا۔ صبح وشام حضرت خود معمول کراتے تھے۔ وہاں حضرت حافظ صاحب، غلام جیلانی صاحب وغیرہ اس وقت کے ساتھی

موجود تھے۔ وہاں کے ایک ساتھی تھے۔ جن کا نام غلام سرور تھا وہ حضرت کے  
 جی کے ساتھیوں میں سے بھی تھے۔ ایک دن ذکر کے بعد حضرت سے عرض کی کہ  
 معرفت ذکر میں جس قدر انوار آپ پر وارد ہوتے ہیں۔ سارے اس شخص (حضرت  
 مہ اکرم اعوان صاحب) پر جاتے ہیں اور پھر اس سے تقسیم ہو کر باقی ساتھیوں پر  
 پہنچتے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا ہاں ایسا ہی ہوتا ہے تم نے صحیح دیکھا ہے اس وقت  
 بیات وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ بائیس برس بعد یہی گناہگار حضرت اور طالبین کے  
 درمیان واسطہ رو جائے گا۔

حضرت اللہ یار خانؒ نے جیسا کہ حضرت جی کو لکھ گئے اپنے خطوط میں فرمایا تھا:  
 آپ کو خیال ہونا چاہئے آپ کو خدا اور رسولؐ اور مشائخؒ کی طرف سے زنجیر  
 زلی کر جی پر لے جایا جا رہا ہے سوچیں۔ آپ کو غالباً بلکہ یقیناً آسمان و زمین کا ستونی  
 منصب ملنے والا ہے۔ مگر اس امر کو دل میں رکھیں کسی سے اظہار نہ کرنا۔ میں نے  
 کافی عرصے سے اس منصب کے بارے میں آپ کا نام نامی پیش کیا تھا۔ یہ منصب  
 امانت اللہ اور رسولؐ کی وساطت سے اور مشائخؒ کی جوتیوں کی دھوڑ کو سرمہ ہٹانے  
 سے ملتا ہے۔ اور خود ذات العالمین اس ہمہ میں استعداد بھی ودیعت فرماتے ہیں۔  
 ایک اور خط میں فرماتے ہیں۔

— آپ اپنی ذمہ داری کو سنبھالتے ہوئے کن فی الظاہر جسمانی و فی الباطن  
 روحانیات پر عمل کرتے ہوئے جو کام بھی مطابق شریعت کر گئے۔ وہ ذکر الہی میں داخل  
 ہو کر نماز کی باوقت پابندی۔ کوشش جماعت کی کرنی۔ نوافل تہجد کا خیال۔ ذکر و  
 انبات میں مشغول ہونا۔ توجہ رفقاء میں سستی نہ کرنا اپنی ذمہ داری سے خبردار  
 رہنا آپ کا وجود بے فائدہ تخلیق نہیں ہوا۔ خدا تعالیٰ جو اس وجود سے کام اپنی یاد و  
 دنیا کا لینا چاہتا ہے اسکو ادا کریں۔ آپ کو میں اپنا مخلص و محبوب روحانی چاہتا



ہوں۔ دل کو تسلی ہوتی ہے تو آپ کا وجود ہی خوشی کا سبب بنتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یقیناً منصب "قلب المراری" پر فائز المرام نہ ہوتے جو "ستون جہاں" ہے۔ میں کیا پوری جماعت کو اگر سہارا ہے تو آپ کا وجود ہے۔ آپ جماعت کے جرنیل ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو، آپ کے وجود سے خدا تعالیٰ نے دین کا کام لینا ہے۔ لے لے اور لے رہا ہے!

ایک اہم بات جو حضرت جی کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہے اسے عرض کرتی چلوں۔ آپ نے 70ء میں منارہ 'دوسری شادی کی؟ اس بارے میں حضرت جی فرماتے ہیں '72ء سے میری دونوں بیویاں میرے بزنس میں دوستی و دشمنی میں اور جماعت کے کاموں میں سو فیصد میری معاون رہی ہیں۔ میں نے بڑا خرچ کیا 'جماعت سازی پر چونکہ ہمارے ہاں چندے کا کوئی Concept نہیں تھا۔ اس لئے 62ء سے لے کر 80ء تک جماعت کا جتنا لوڈ ہوتا تھا وہ مجھے اکیلے پر ہی ہوتا تھا۔ ان دنوں میری جتنی آمدن بھی تھی 'اس میں سے کچھ پس انداز نہیں ہوتا تھا' ساری اللہ کی راہ میں خرچ ہو جاتی تھی 'میری دونوں بیویوں میں سے کبھی کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا تھا کہ یہ پیسے ادھر کیوں جاتے ہیں 'بلکہ وہ خوش ہوتی تھیں کہ اچھی جگہ پر پیسہ صرف ہو رہا ہے۔ یہ مجھ پر اللہ کا احسان ہے۔ دونوں بیویوں سے چار چار بچے ہیں 'ان میں کوئی تفریق نہیں کہ وہ ادھر سے ہیں 'یا ادھر سے 'الحمد للہ بچے بھی ذکر کرتے ہیں اور چھیاں بھی ذکر کرتی ہیں۔ باقاعدگی سے اجتماعات میں شریک ہوتی ہیں۔ میری فیملی میرے مشن اور سلسلے میں میری پوری معاون ہے۔

صوفی کو لوگوں کی تعریف یا تنقیص سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے 'خصوصاً ان حضرات کو جن کو فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیب ہو جائے۔ ان کا حق یہ ہے کہ کسی بھی کام کا معیار حضور کی پسند ہو 'لوگوں کی پسند نہ ہو۔ کیونکہ لوگ وہاں

ہیں نہیں پہنچتے، جہاں تک وہ پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ لوگوں کو وہاں حاضر نہیں ہونا ہوتا ہے۔  
 شام کو جہاں اسکو جا کر کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ لوگوں سے اس درجہ کی پوچھ گچھ نہیں ہو  
 گی جس معیار کی اس سے ہوگی۔

کوئی شخص جسے یہ منصب نصیب ہو جائے اس پر اللہ کی نعمتیں تمام ہوتی ہیں اس  
 سے زیادہ اتمامِ نعمت کی عملی صورت کیا ہوگی؟

کوئی بھی نعمت جو کائنات میں بقسطی ہے وہ اللہ کی رحمت ہے۔ اور رحمت مجسم  
 ہیں محمد رسول اللہ ﷺ، اولین کے لئے بھی، آخرین کے لئے بھی۔ اللہ کے سوا  
 ساری کائنات کے لئے رحمت مجسم ہیں۔ دو عالم کو ان کے نقش کف پا پر قربان کر  
 دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ دنیا تو بڑی حقیر سی شے ہے اور اس نے چھوٹ جانا  
 ہے۔ ہر ایک سے چھین گئی ہمارے پاس کب رہے گی۔ دنیا کو اگر حضور کے ارشادات  
 پر قربان کیا تو کیا کمال کیا۔ یہ تو ویسے ہی ضائع ہونے والی نعمت تھی۔ یہ سمجھے کہ میں  
 نے قربانی دی اور دنیا کی راحتیں حضور پر قربان کر دیں۔ تو اتنا یاد رکھیے، یہ نعمتیں  
 ہمیشہ پاس رہنے والی تھیں کب۔ مزہ تو جب ہے کہ اپنی پسند ہی کو قربان کر دے۔ اپنا  
 کچھ باقی نہ ہو۔ کسی چیز کی ضرورت نہ ہو، نام و نمائش کی تمنا نہ ہو، اپنی کسی خولی اور  
 صفت کے ساتھ متعصب ہونے کی ضرورت نہ ہو۔ نہ بڑا ہٹنے کی خواہش ہو۔ نہ پیری  
 کی خواہش ہو۔ نہ فقیر کھلوانا چاہئے۔ نہ کوئی اقتدار کا شوق ہو۔ نہ دولت کی ہوس  
 ہو۔ بس اسکے پاس جو کچھ ہو، انہی کا ہو، انہی کے لئے ہو۔

نہ آوردم از خانہ چیزے نخست

من ہرچہ دادی ہماں چیزے تست

تصوف اور سلوک کا حاصل یہی ہے۔

اللہ جل شانہ کی عطا تھی اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کرم کہ بے شمار لوگوں کو انعامات سے نوازا گیا، آنے والا کوئی بھی فرد خالی نہ رہا۔ جو نعمتیں لوگوں نے عمر میں صرف کر کے حاصل کی تھیں یہاں لکھوں میں لوگوں کو نصیب ہوئیں۔ لوگ کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں انبیاء طہیم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کوئی شخص معصوم نہیں ہوتا۔ ہر شخص سے غلطی کے مصادر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ منور القلوب ہوتے ہیں ان کے ساتھ شیطان زیادہ محنت کرتا ہے۔ تصوف و سلوک کی غایت یہ ہے کہ انسان کو اپنا کوئی کمال بھی نظر نہ آئے، بھر ہر کمال میں ذات باری کی عطا نظر آئے۔ اور اس کا احسان۔ یہیں پر شیطان مداخلت کرتا ہے اس کا طریقہ واردات بھی بے اندازہ ہوتا ہے۔ پھر یہ انسان کے دل میں لوگوں کو یہ ائی دکھانے کی خواہش پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ وہم ڈال دیتا ہے کہ وہ دوسروں سے مدتر ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔

اللہ جل شانہ کی عطا کسی کے مشورے کی محتاج نہیں ہے۔ بہت آگے نکل جانے والے لوگ بعض لغزشوں کی وجہ سے بہت نیچے گر جاتے ہیں۔ بہت نیچے نیچے ہوئے لوگ بعض اوقات ایک نگاہ میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اس راستے میں یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ زندگی بھر شیخ کو تلاش کرتے رہے اور دنیا سے گزر گئے۔ مقامات کا حاصل کرنا تو دوسری بات ہے کوئی بتانے والا بھی نہ مل سکا۔ لیکن ان کی طلب ایسی صادق تھی کہ وفات کے سالوں بعد اور بعض اوقات صدیوں بعد کوئی ایسی ہستی انکے مزار سے گزری، ملاقات کسی ایسے انسان سے ہوئی کہ جس کے فضیل انہیں مددِ غ میں بھی منازل بالا بلکہ عالم امر تک کے مقامات نصیب ہوئے اب یہ رب کی مرضی کون جانے کہ کس کو کس وقت کیا بخش دے۔

حضرت جی فرماتے ہیں۔

سلسلہ عالیہ کی قیادت کی ذمہ داری مجھ پر آئی تو میں نے اپنی پوری کوشش کی کہ اسے پورے خلوص اور دیانتداری سے نبھاؤں۔ اللہ کریم کا احسان ہے کہ میں حمد اللہ مطمئن ہوں کہ مجھ سے جو ممکن تھا وہ میں نے کیا اور کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں انسان کا اپنا ضمیر ہی بہترین جج ہوتا ہے۔ کیونکہ باہر سے دیکھنے والے لوگ کسی کو اس طرح نہیں جان سکتے۔ جس طرح سے وہ خود جان سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ عقیدت میں آکر کارکردگی سے زیادہ نمبر دے جاتے ہیں اور بعض جن کو عقیدت نہیں ہوتی وہ ایک دم سے انسان کی کارکردگی کو صفر قرار دے دیتے ہیں۔ ایسے میں ضمیر بہترین منصف کارول ادا کرتا ہے۔ تو الحمد للہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ مجھے اللہ کے فضل سے جماعت کی ترویج، ذکر کی تلقین اور اتباع سنت رسول کے پیغام کو پورے روئے زمین پر پہنچانے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ ہر طبقہ فکر تک میں نے ذکر الہی کو پہنچایا ہے۔ کفار کو دعوت اسلام دی ہے اور ذکر پر لگا کر انہیں مشرف باسلام کیا ہے۔ پھر علمی اعتبار سے جتنا کام اس صدی میں تصوف پر ہوا ہے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ المرشد کی بنیاد حضرت نے رکھی تھی۔ جو اس وقت سے لے کر اب تک باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ اسکے علاوہ دیگر تصانیف تفسیر اور تبلیغ کے حوالے سے خدائے برتر نے مجھ سے اتنا کام لیا ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سلسلہ عالیہ کی تعلیمات اور مقاصد کو اگر تین درجوں میں تقسیم کروں تو شکل کچھ ایسی بنتی ہے۔

پہلا درجہ: کہ اللہ اللہ کر کے فرد کی ذات کی اصلاح کی جائے۔

دوسرا درجہ: اللہ اللہ کو پھیلایا جائے اور افراد کو جمع کر کے ایک جماعت بنائی

جائے۔ جماعت بھی ایسی جو اصلاح یافتہ ہو۔

تیسرا درجہ: جو 90ء میں شروع ہوا کہ اب معاشرے میں اصلاح ہونی چاہیے  
یہی سنت نبویؐ ہے کہ حضورؐ نے مکہ میں افراد کو اپنی تربیت پر لگایا کہ وہ "اپنی اصلاح  
کریں دوسرے جو کچھ بھی کرتے ہیں۔ انہیں کچھ مت کہیں جو ظلم بھی ہوتا ہے اسکو  
ستے رہیں۔ مگر اپنے آپ کو ظلم میں شریک نہ کریں۔ یہ پسلا درجہ تھا۔

مدینہ منورہ میں دوسرے درجے کا آغاز ہوا۔

ریاست بن گنی سسٹم Establish ہو گیا 'انسٹی ٹیوشن بن گیا۔

پھر تیسرے درجے میں۔ آپؐ نے فرمایا۔ معاشرے میں جو لوگوں پر ظلم ہو رہا  
ہے۔ اسے روکا جائے۔ دین کی تبلیغ کی جائے۔ اور اس کے لئے جہاد کا اعلان کیا  
جائے۔

تو اب ہماری وہی صورت حال ہے۔ ہم اس وقت اپنے مشن کے اس درجے میں  
ہیں جہاں نفاذ اسلام ہماری ضرورت ہی نہیں مجبوری بھی ہے۔

تصوف دراصل تزکیہ نفس کا نام ہے۔ زبان سے مانی ہوئی بات کو دل کی گہرائی  
سے تسلیم کرنا تصوف ہے۔ عقیدے پر قلبی رغبت کا نام تصوف ہے۔

یہ تصوف کا ابتدائی درجہ ہے۔ اس کے بعد عقیدے کو منوانے کے لئے تبلیغ  
کرنا اور..... تصوف کا عظیم درجہ یہ ہے کہ ظلم کے خلاف جہاد کیا جائے۔ حضورؐ نے  
جتنے جہاد کئے ظلم کو مٹانے کے لئے کئے۔ تصوف کے مختلف درجات ہیں کہ کوئی  
کہاں تک پہنچتا ہے۔ مثلاً ایک صوفی نے لوگوں کو اللہ اللہ کرنا شروع کیا۔ دوسرے  
نے اسے آگے بڑھایا۔ جس طرح پرائمری کے بعد ہائی سکول پھر کالج اور یونیورسٹی  
اسی طرح ہم نے لوگوں کو درجہ بدرجہ اللہ کے دین کی طرف بلایا۔ لوگوں کو گناہوں  
کی دلدل سے نکالا 'انہیں مسجدوں میں لا کر اللہ کے روبرو کھڑا کیا۔ اب اللہ کریم نے  
توفیق دی ہے کہ تصوف کے درجہ کمال کے مطابق ظلم کے خلاف کھڑے

ہو جائیں۔ یہ سنت رسول کا حقیقی اتباع ہے۔

سلسلہ تصوف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت معین الدین اجمیرؒ شاہ ولی اللہؒ سید احمد شہید اور ممدی سوڈانی کی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اسے روکنے کے لئے عملی طور پر میدان میں اترے۔ اب اللہ کریم ہمیں اس مرحلے پر لے آئے ہیں۔ ہر آنے والے دن وہ تہدیلی آ رہی ہے جس کی ہم توقع کرتے ہیں۔ پھر واضح کر دوں کہ ہمارا مقصد حکومت چھیننا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد اصلاح احوال ہے۔

یہ ہیں حضرت ملک محمد اکرم اعوانؒ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ! جو کبھی گھر سے نکلے تھے اک وحشت بھری تلاش لے کر ڈھونڈتے ڈھانڈتے انہیں دھوپ کے راستے پر وہ شجر سایہ دار نظر آ گیا۔ جس کے سائے میں انہوں نے تلاش کی تحنن اور سفر کی وحشت کو زمین کا بار کیا۔ اور خود بے فکری سے اس ٹھنڈی چھاؤں میں سستانے لگے جو دھوپ کے راستے میں دیوار بنی کھڑی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ انہیں اس چھاؤں سے محبت ہو گئی۔

کچھ یوں کہ محبت، محبت سے راضی ہو گئی۔

دل نے دل کو پہچان گیا۔

روح نے روح کو جان لیا۔

..... پھر باقی کیا چاہا!!!

بزرگ کہتے ہیں ہر شے انتخاب پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر ذکر اور خدمت لامنتہی ہیں۔

اہل خدمت جو ہوتے ہیں ان کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ اپنا ہی ڈھنگ ہوتا ہے وہ ادھر دیکھتے ہیں نہ ادھر، بس ان کی نگاہ زمین و آسمان کے ہر اس جز پر ہوتی ہے جسے

کل کی تلاش ہے۔ وہ ذروں کے سینے میں دھڑکنے والی صادق طلب اور جستجو میں ہے۔  
قرار پھرنے والی پاگل ہوا سے بھی پورے باخبر ہوتے ہیں۔

وہ تو درحقیقت ایسے مزدور ہوتے ہیں جنہیں مزدوری کے صلے سے  
ذرا بڑا بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ ان کی نگاہیں آسمان پر اور دل زمینوں کے  
اندر نمو کی طرح دھڑکنے والے کائناتی سچ کی طرف لگا ہوتا ہے۔ جو خدمت خدمت  
اور خدمت پکار رہا ہوتا ہے۔

یہ اہل خدمت ہی تو دراصل اہل صفائیں۔ بزرگ کہتے ہیں۔ جب ہم دے کو اللہ  
اپنے کاموں کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں پھر وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ اور یہ  
انتخاب ہمہ دلوں پر الہی انتخاب کی حد ہوتی ہے۔

شب بیداری 'دل بیداری کا ایک باب ہے۔

جہاں سے کھولو جہاں دیکھو 'اندر عطا ہی عطا ہی سخا ہی سخا۔

شب بیداری کی پیشانی پر تڑپتے ہوئے مجدے 'زمین کا نہیں' عرش عظیم کا زیور  
ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ خدمت لی جاتی ہے 'کی نہیں جاتی۔ یہ تو لینے والے کا کرم  
کہ اسے منتخب کر لیا۔ چن لیا۔ انہوں میں سے ایک کو چن لیا۔ اسی لئے اہل خدمت کا  
شمار چنیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے۔ پھر ان چنیدہ ہستیوں میں کام کی استعداد اور قابلیت  
بھی ڈال دی جاتی ہے کہ اللہ کی رہنمائی معروف و مستقیم ہوتی ہے۔

اور شاید انہی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مخلوق کا خیر خواہ ہمہ دلوں سے چنا ہوا  
ہوتا ہے۔ چنے ہوئے ہمہ دے مادر زاد ہوتے ہیں۔

اور فطرت کے مقلد ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی ہے کہ چنے ہوئے کاموں کے لئے منتخب ہمہ دے ہی مامور کئے جاتے  
ہیں۔ یہ ہر کس و نا کس کا کام نہیں اور ان چنے ہوئے ہمہ دلوں کی عمدہ خصلت یہ ہوتی

ہے کہ جب تک وہ اپنے کام کو جس کے لئے انہیں چنا جاتا ہے۔ نہایت ہی خوش  
 اسلوب سے پورا نہیں کر لیتے، کبھی آرام نہیں کرتے۔  
 اہل اللہ کہتے ہیں۔

کام کا نام مقام ہے، جتنا اونچا کام، اتنا اونچا مقام، کرامت کوئی چیز نہیں۔ کام پہ  
 اشتقاق ہی کا اصطلاحی نام ہے۔ کرامت کے خیال سے بے نیاز ہو کر کام میں  
 مصروف ہو کر کام کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہ رہے۔ یہ بہترین کرامت ہے!!



## اس مضمون کی تیاری میں!

- ۱۔ حضرت جی سے گفتگو اور ان کی یادداشتیں
- ۲۔ ارشاد السالکین
- ۳۔ حضرت اللہ یار خانؒ کے مکتوبات
- ۴۔ قومی ڈائجسٹ
- ۵۔ روزنامہ پاکستان۔ سنڈے میگزین
- ۶۔ روزنامہ اساس

## بہضرت مولانا اللہ یار خانؒ

آپ کی پیدائش ۱۹۰۴ء میں اپنے آبائی گاؤں موضع چکڑالہ ضلع میانوالی میں ہوئی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم چک ۱۰ ملی ضلع سرگودھا میں حاصل کی اور دورہ حدیث مدرسہ امینیہ دہلی ۱۹۳۳ء میں زیر سرپرستی مفتی کفایت اللہ مرحوم مکمل کیا۔ یوہانی طب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر درس و تدریس شروع فرمایا۔ ۱۹۳۶ء میں آپ نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا اور ۲۴ برس کی مسلسل کاوشوں سے اس میں کمال حاصل کیا۔

۱۹۶۲ء میں آپ نے سالکین کی تربیت بمسلکہ نقشبندیہ اویسیہ شروع فرمائی۔ آپ کے تربیت یافتہ آج دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سیکڑوں صاحب کشف و کرامت بھی ہیں اور اس کتاب کی تعلیمات کی منہ بولتی تصویر بھی۔

آپ کی پوری زندگی مذاہب باطلہ کے رد میں گزری۔ آپ چوٹی کے مناظر رہے اور باطل فرقوں کو بے نقاب کرنے میں اپنی تقریر و تحریر کا بے دریغ استعمال

فرمایا۔ عبد اللہ چکڑالوی کے باطل مذہب کی شے کئی بھی آپ ہی کے حصہ میں آئی۔  
 اس ضمن میں آپ نے تحذیر المسلمین، عن الکید الکاذبین، الدین الفاضل اور  
 ایمان بالقرآن جیسی معرکہ آرا کتب تصنیف فرما کر امت مرحومہ کو کسی مزید تحقیق  
 سے رہتی دنیا تک بے نیاز فرما دیا۔ تصوف کے موضوع پر قلم اٹھایا تو دلائل  
 السلوک۔ حیات برزخیہ۔ حیات انبیاء اور اسرار البحر میں جیسے گوہر ہائے نایاب سائنس  
 کے ہاتھ آئے۔

یہی مشاغل دم آخر تک آپ کی مبارک زندگی کا جزو لا ینفک بنے رہے حتیٰ کہ  
 ۱۸۔ فروری ۱۹۸۳ء کو تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں آپ نے اسلام آباد میں دار الفنا  
 کو خیر باد کہا اور ۱۹ فروری ۱۹۸۳ء غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کا  
 یہ بحرِ دیکر اس اپنے جملہ کمالات کے ساتھ ظاہری نظر سے اوچھل ہو کر اپنی آخری  
 آرام گاہ موضع مرشد آباد داخل چکڑالہ میں موجزن ہوا۔

انا لله وانا الیہ راجعون

○.....○.....○

## بابِ تلاش

## تعارف و حالاتِ زندگی

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم  
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم و علی آلہ و صحبہ و علی  
من تبعہم اجمعین

تصوف اور صوفیائے کرام کے متعلق عوام بہم علماء کے دلوں میں بھی کچھ  
شبہات پائے جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات وہ حضرات اس قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہو  
جاتے ہیں کہ طریقت اور شریعت دو الگ چیزیں ہیں یا اسلامی تصوف عجمی سریت اور  
باطنیت کے مترادف ہے۔ یا یہ کہ تصوف تکلیفات شرعیہ سے آزادی کا نام ہے ان  
غلط فہمیوں کے ازالہ اور عوام و خواص کی علمی تشفی کی خاطر اللہ رب العزت نے یہ  
رسالہ تحریر کرنے کی توفیق عنایت فرمائی ہے۔

اگرچہ میری زندگی کا اکثر حصہ مشکمین کے بیچ پر اسلام کی حقانیت کے اثبات  
اور فرقہ باطلہ کی تردید میں گزرا ہے اور کلامی مباحث اور تصوف و سلوک میں بظاہر

تقائیر اور اُردہ نظر آتا ہے، لیکن احقاق حق کے لئے علم کلام سے کام لینے اور تصوف کے ذریعے ایمان و یقین کی کیفیت پیدا کرنے میں فرق صرف دلیل سمعی اور دلیل ذوقی کا ہے۔ مگر بایں ہمہ لوگ یہ سن کر حیران ضرور ہوتے ہیں کہ وہ شخص جسے کل تک ہم ایک مناظر اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے جانتے تھے آج تصوف ذکر، مراقبہ ذکر، تزکیہ نفوس اور منازل سلوک پر اظہار خیال ہی نہیں کر رہا بلکہ اپنا باطنی رشتہ صوفیائے کرام سے جوڑ رہا ہے مگر ان کی حیرت پر تعجب ہوتا ہے کہ

اہم یقسمون رَحْمَتِ رَبِّكَ      کیا وہی آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں۔

اور اس کا جواب اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء      یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تبلیغ و اشاعت دین کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس کا کام انبیاء علیہم السلام سے لیا جاتا رہا۔ مگر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آخری امت میں اس کی ذمہ داری علمائے ربانین پر عائد ہوتی ہے۔ جو ورثہ الانبیاء ہیں اور ہر الحادی اور لاحادی دور کی تاریکیوں میں روشن چراغ کی مانند ہوتے ہیں موجودہ دور پر فتن میں اس ذمہ داری کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس دور میں اسلام کی زیوں حالی اور مسلمانوں کی دینی بہتری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ایمانی اور روحانی تعلق بڑے نام نہی رہ گیا ہے ان کی اعتقادی خرابیوں اور عملی بے اعتدالیوں اور بد عنوانیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی اللہ کا مدد و انصاف اس قدر نہ

سے نکال کر اور اس خواب غفلت سے جگا کر شریعت مطہرہ کے ابتلا، تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی طرف توجہ دلاتا ہے تو اسکی آواز پر لبیک کہنے کے بجائے الٹا اپنے آپ کو لوہام و تکلیک کی وادیوں میں دھکیل دیتے ہیں اور :-

معلومات بعضہا فوق بعض      تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں

کی صورت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حق کی حفاظت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اس کی رحمت یہ کب گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو گمراہی کی وادیوں میں بیٹھکنا چھوڑ دے۔ چنانچہ ہر دور میں وہ اپنے خاص بندوں کے ذریعے حق کی حمایت اور اصلاح خلق کی خدمت لیتا رہا۔ اور صوفیائے کرام نے جس خلوص اور لگن سے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

صوفیائے کرام کے ہاں تعلیم و ارشاد اور تزکیہ و اصلاح باطن کا طریقہ القائی اور انکاسی ہے اور یہ تصوف کا عملی پہلو ہے۔ جس کا انحصار صحبت شیخ پر ہے۔ بقول امام ربائی مجدد الف ثانی، تصوف کا تعلق احوال سے ہے زبان سے بیان کرنے کی چیز نہیں، مگر جہاں تک تصوف کے عملی پہلو کا تعلق ہے صحیح اسلامی تصوف کے خدو خال کا تعین اور اس کی حقیقت سے علمی حلقوں کو روشناس کرانا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ آجکل جس چیز کو تصوف کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پیش کیا جاتا ہے اسے تصوف اسلامی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح اسلامی تصوف کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ عامۃ المسلمین کو صحیح اسلامی تصوف سے روشناس کرایا جائے جس کی اساس کتاب و سنت پر

ہے تاکہ اس کی روشنی میں اپنی فکری اور عملی اصلاح کر کے ابدی فلاح حاصل کر سکیں۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب۔

انڈیار خان۔ چٹڑالہ (ضلع میانوالی)

یکم شعبان ۱۳۸۵ء

○.....○.....○



## زندگی کو ڈھونڈنے نکلے تھے ہم!

۲۳۔ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ (غائب) مارچ ۷۷ء کی ۱۳ تاریخ بعد نماز عصر۔۔۔۔۔ یہ چند سطور 'مسجد الحرام' میں بیٹھا لکھ رہا ہوں ہر چند کہ لکھنے کا سلیقہ نہیں پھر بھی لکھ رہا ہوں بے علم و بے عمل 'انتہائی تہی دست' صرف اس علیم و خبیر اور عزیز و حکیم کے بھر دے پر قلم ہاتھ میں لیا ہے کہ (الذی علم بالقلم) خیال ہے کہ یہ سطور باز خوانی کا کام دیں گی۔

چل مرے خامے بسم اللہ :

سمند خیال زندگی کے اس دور کو جا پہنچا "جب آتش جواں تھا" "دور جوانی چنانکہ اللہ دانی نہ فکر فردانہ غم دوراں 'دنیا اور اسکی رعنائیاں احباب کی محفلیں' قہقہے اور خوش گپیاں 'جوانی' قوت بازو 'دنیوی غرور' اور خدا تعالیٰ سے بلا تعلقی اور محرومی نے مل کر فرعون بنا دیا تھا۔

کے خیال تھا کعبۃ اللہ کی زیارت کا اور کس کے دل میں اس کی عظمت تھی۔ عظمت تھی شرف تھا کرامت تھی تو عند اللہ تھی میرے سینے میں تو صرف

اور صرف یہ بات تھی کہ اس عالم رنگ و رو کی زینت میں ہی ہوں اور پھر کیا ہوا۔  
 ارے ہونا کیا تھا ایک مذہبی جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کہاں میں اور کہاں  
 مذہبی جلسہ کیوں گیا یہ ایک لمبی داستان ہے صرف اتنا عرض کروں کہ میں نے اپنے  
 رات دن اپنی جوانی اپنی قوت اور اپنی تمام کوششیں اور اپنی صلاحیتیں دنیا کی خدمت  
 کے لئے وقف کر دی تھیں لیکن دنیا نے ایسا پلٹا کھایا کہ اپنے بھی دشمن بن گئے ایک ہی  
 جھپٹکے میں منہ کے بل گرا۔ تکبر اور غرور کی عمارت متزلزل ہو گئی پستول جو میری  
 اندھیری راتوں کا ساتھی تھا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ انسانیت پر چوٹ پڑی اور انہی  
 کہ چور ہو گئی 'خود کو ایک دور ابے پر پایا۔ ایک راستہ پھر دنیا میں گم ہو جانے کا تھا بائیں  
 خیال کہ اگر ایک مرتبہ دھوکا دیا تو پھر وفا کرے گی اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ اس سے  
 وفا کی امید نہیں جس کی خاطر تو نے اپنا سب کچھ قربان کیا 'اور بڑے وفائی کے کچھ  
 حاصل نہ ہوا۔ اب کس بھروسے پہ اس سے وفا کا طالب ہے یہ تہذیب دین کی طرف  
 لے گیا اور پھر کیا دیکھا بڑے بڑے درویش نماد نیا دار 'جن میں بعض نیک بھی پھنسے  
 ہوئے تھے مگر محض اپنی سادگی کی وجہ سے جانتے وہ بھی کچھ نہ تھے اور کثرت منصف  
 اول کی تھی۔ اللہ اللہ کیا کروں کہاں جاؤں :

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

آج چشم تصور سے اس "یاسیت" کے دور کو دیکھ رہا ہوں جب کئی کئی دن کھانے  
 کو طبیعت ہی نہ چاہتی تھی اسی منکبر جسم پر چیتھڑے بھی پہنے لباس کی الفت مٹ گئی  
 تھی 'نیند میں مزانہ رہا احباب سے تعلق ٹوٹ گیا اور پھر میں کیا تھا ایک جیتی جاگتی  
 لاش 'ہاں ایک بات ضرور ہوئی۔

جب دیارِ پنجابوں نے تو خدا یاد آیا

ہر طرف کی مایوسی نے اللہ کا دروازہ دکھا دیا۔ (امن عجیب المضطر اذاعادہ و

یعنی (السماء) اور میری راتیں اس کے در پر بسر ہونے لگیں۔۔۔۔۔ ایک امید پر  
 کہ اس کی رحمت بے پایاں ہے ضرور دیکھیری فرمائے گا۔ اور یہی ہوا۔ یہی امید مجھے  
 کساں کساں جلسوں میں و مظلوموں میں اور مسجدوں میں لے جاتی :  
 لیکن مایوس ہی ہوتا۔۔۔۔۔ !

اور پھر ایک دن رحمت باری جوش میں آئی :

زندگی کو ڈھونڈنے نکلے تھے ہم دفعتاً اک موڑ پر تم مل گئے

موضع پد حرا کے ایک جلسہ میں حضرت الاستاذ مولانا اللہ یار خان (مدظلہ  
 العالی) کو دیکھا، وہی ایک نگاہ سرمایہ حیات ہے :

آپ تشریف لائے تو میں ایک آدمی کے پاس کھڑا تھا۔ چھوٹی چھوٹی سفید  
 داڑھی اس نے رکھی ہوئی تھی ساتھ کے گاؤں پد حرا کا تھا۔ یہی بندہ لایا تھا حضرت  
 کو۔ اور شیعہ حضرات نے مولوی اسماعیل صاحب کو دعوت دے رکھی تھی۔ مولوی  
 اسماعیل شیعہ کی نظیر نہیں ملتی ہے بلکہ متقدمین سے بہت زیادہ اچھے عالم تھے اور  
 شیعہ حضرات کے پاس شاید پھر اس پائے کا عالم پیدا نہیں ہوا۔ بہت وسیع المطالعہ اور  
 بہت ذہین عادت یہ تھی کہ جہاں جایا کرتے تھے بہت زور دار انداز میں تنقید کیا  
 کرتے تھے اور عام اہلسنت کے عالم ان کے سامنے نہیں ٹھہرتے تھے۔ بڑا وسیع  
 مطالعہ تھا پھر عربی زبان پہ عبور تھا تو اکثر جہاں مولوی اسماعیل کو بلایا جاتا تھا تو پھر  
 لوگ وہاں حضرت کو دعوت دیتے تھے۔ تو حضرت وہاں تشریف لائے ہوئے  
 تھے۔ آپ کا پروگرام تھا تین دن کا پتہ چلا تو ہم بھی گئے۔ وہاں بے شمار لوگوں سے  
 ملاقات رہتی تھی، لیکن میں نے حضرت کو شخص طور پر بہت مختلف پایا۔ دوسرے  
 لوگوں سے 'سادہ لباس' 'سادہ غذا' 'سادہ انداز' میں وہاں گیا تو خیال آیا پہلے مولانا سے  
 مل لیا جائے، تو پتہ چلا وہ آرام فرما رہے ہیں۔

وہ ایسا دور تھا کہ تقریباً ہر جلسہ ہی ایک مناظرانہ رنگ لئے ہوئے ہوتا تھا۔ شیعہ کے پاس ان دنوں بہت سے عالم تھے مولوی بشیر صاحب ٹیکسلا والے تھے مولوی اسماعیل، اور بھی کئی تھے مجھے ان کی فنو ست یاد نہیں۔ اہلسنت کے پاس جواب دینے کے لئے دو چار حضرات تھے مولانا دوست محمد قریشی مرحوم حضرت عبدالستار تونسوی سید احمد شاہ خاری تو یہ چار پانچ حضرات تھے اور یہ ایک رواج بن گیا تھا کہ بڑے چار حانہ انداز میں شیعہ علماء بات کرتے پھر اہلسنت بھی جواب دینا چاہتے اور ایک طرح کا مناظرانہ رنگ ہی ہوتا تھا اور جلسے اکثر ہی ہوتے تھے کامرہ کے علاقے میں بہت ہوئے، کیمبل پور انک کے علاقے میں 'ہمارے اس علاقے سون میں اس طرح چو آسیدن شاہ کی طرف پھر نیچے دریائے جہلم کے علاقے میں ساتھ ساتھ جھنگ میں ملتان تک تو یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن ہوتا یہ تھا کہ جہاں مولوی اسماعیل پہنچتے وہاں پر لوگ حضرت کو بلاتے تھے۔

اب بعض لوگ کہتے ہیں مناظر صوفی نہیں ہو سکتا، مگر ایسا نہیں ہے دراصل مناظر کی تعریف یہ ہے کہ دلائل سے حق کو ثابت کیا جائے، جب کہ فاسد دلائل سے ایک آدمی لوگوں کی گمراہی کا سبب بن رہا ہے تو واجب ہو جاتا ہے عالم آدمی پر کہ وہ دلائل دے کر لوگوں کو گمراہی میں بھٹکنے سے چائے حق کو واضح کرے مقابل کو ہر انا رواج ہے لیکن یہ شرعی مناظرہ نہیں ہوتا۔ دین کسی کی فتح اور شکست کا نام نہیں دین حق کا نام ہے اور صوفی جو ہوتا ہے اگر سادہ الفاظ میں ترجمہ کریں تو ہوتا ہے بہتر انسان۔ مسلمان عقیدے کے اعتبار سے عمل کے اعتبار سے اخلاق کے اعتبار سے علم کے اعتبار سے غیر مسلم سے بہر طور بہتر ہوتا ہے اور پھر صوفی بہترین مسلمان ہونے کو کہتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی جو بہت اچھا ہو وہ صوفی کہلاتا ہے کہ یہ جو شرعی مناظر ہیں خواہ عبادات کے باب میں ہوں تبلیغ کے باب میں ہوں جہاد کے

باب میں ہوں صوفی زیادہ محسوس کرتا ہے اس پر زیادہ محنت اور مجاہدہ کرتا ہے اور اس پر زیادہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

استدلال دونوں طرح سے ہر موقع پر دینا پڑتا ہے۔ علمی دلائل بھی اور عقلی بھی۔ قرآن حکیم کا انداز بھی یہی ہے۔ آپ جہاں دیکھیں دلائل عقلیہ کو بھی قرآن حکیم نے کبھی فراموش نہیں کیا سورج چاند تاروں کی روش ان کی تپش روئیدگی حقوق کا پیدا ہونا ان کو دلیل، نانا یہ سارے عقلی دلائل ہیں اور علمی دلائل قرآن کے مذہبہ قوموں کے کردار پر بحث اسکے نتائج پر بحث لوگوں کے اعمال اور عقائد پر بحث یہ ساری علمی باتیں ہیں یہ سارے علمی اور عقلی دلائل مل کر کسی ہمدے کو متاثر کر سکتے ہیں۔؟ آپ علمی دلائل دے دیں وہ logically ہمدے کے ذہن میں نہ آئے تو وہ چپ ہو سکتا ہے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ آپ عقلی دلیل دے دیں لیکن علمی طور پر وہ ثابت نہ ہو سکے تو آپ ہمدے کو چپ کرادیں گے مطمئن نہیں۔ مطمئن کرنے کے لئے آپ کو علمی دلیل بھی دینی پڑے گی اور اس انداز میں دینی پڑے گی کہ اس میں logic بھی ہو اور عقل سلیم بھی اسے تسلیم کرے۔

حضرت ”کوہ صغیر میں جس قدر مذاہب باطلہ تھے تقریباً سب پر عبور حاصل تھا۔ سب کی کتابیں زیر نظر رہتیں سب کے عقائد پر عبور تھا۔ ہندوؤں کے، بدھ مت کے، سکھوں کے، ہمد صغیر کے، مسلمانوں کے جوئے نئے فرقے نئے، یہود و نصاریٰ کے ان کی کتابیں حضرت جی کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ آپ کا انداز عموماً یہ ہوتا تھا۔ زیادہ مناظرے اس زمانے میں شیعہ سے ہوتے تھے ملک تقسیم ہو چکا تھا تو ہندو سکھ کی بات ختم ہو چکی تھی۔ تو آپ پہلے مقابل کی کتابوں سے دلیل دیتے کہ تمہارے فلاں عالم نے تمہارے فلاں محقق نے تمہارے فلاں مفسر نے فلاں کتاب میں یہ بات کی اور پھر مصنف کا سن پیدائش سن وفات اسکی ساری تصانیف کی فہرست

جس کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں اسکا صفحہ نمبر اور سطر از سر رہتا تھا حضرت کو، مجھے یاد ہے ایک مولانا گنتے رہے انہوں نے ایک گننے کی مجلس میں ۷۰ معصومین اور ان کی کتابوں کے حوالے دیئے اور سب زبانی دیئے ان کا سن پیدائش سن وفات ان کی باقی تصنیفات اور جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ کون سے صفحے پر کون سے Chapter میں اور آپ کے دلائل کا انداز جو ہوتا تھا وہ بہت مضبوط بہت Solid اور ایک حد تک بڑا چار حانہ ہوتا تھا جواب کر دیتا تھا۔

حضرت کے سامنے جو ہم نے مجاہدات کئے ان کا حال بڑا ہی مختلف تھا۔ تصوف میں دراصل بہت سارا دار و مدار شیخ کے مزاج پر ہوتا ہے، حضرت کا مزاج بہت انتہا پسندانہ تھا یعنی آپ جس کام کو بھی کرنا چاہتے اسکو اس حد تک کرتے کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس اعتبار سے حضرت خود بھی بہت سخت مجاہدے کرتے تھے۔ مطالعہ بھی کرتے تھے بہت کم سوتے تھے غذا بھی بہت کم ہوتی تھی اور ہم جب آئے تو چار پانچ غیر معروف قسم کے ساتھی ذکر کرتے تھے۔ جن میں سے ایک آدھ ابھی ہیں باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے اور مجاہدے کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شاید ہمارا کوئی لمحہ بھی مجاہدے کے سوا نہیں ہوتا تھا۔ لباس میں کھانے میں سونے میں آنے جانے میں فجر تک کے لطائف میں ساری ساری رات لگ جاتی۔ اس وقت سفید سفید گھڑیاں ہوتی تھیں Radium لگا ہوتا تھا۔ اس زمانے کی گھڑیاں تھیں تو ہم نے منٹوں کی سوئیاں نکال دی تھیں کہ منٹوں کو کون گنے تو دوسری عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں کشف کرامات یا مشاہدات سے شغف نہیں ہوتا تھا بلکہ ہمارا خیال تھا اپنی سوچ اور عملی زندگی میں کیا اثر پڑ رہا ہے اس کے کیا نتائج نکل رہے ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں یہ ہوتا تھا، اور ساتھ ساتھ کشف بھی ہوتا تھا لیکن اس کی ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ کشف ہو گیا یا نہ ہو گیا اس کی ہم پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک

عجیب بات ہے جو میں نہیں سمجھتا کہ اب ساتھیوں کو کیوں محسوس نہیں ہوتی۔  
 میں اگلے دن بھی یہ تجزیہ کر رہا تھا اپنے آپ میں بیٹھا ہوا کہ کیوں لوگ مکہ مکرمہ  
 میں اتنے تبدیل ہو گئے وہ لوگ بت پرست تھے شرابی معاشرے کے لوگ تھے  
 قاحل تھے فاسق و فاجر لوگ تھے۔ لیکن وہ ایک دم اتنے بدل گئے پورے کفر کے لئے  
 شعلہ جوالہ بن گئے۔ ناقابلِ تسخیر ہو گئے ہم پوری محنت کرتے ہیں زور لگاتے ہیں  
 تقریریں جیسے شور شرابہ لوگ بدلتے نہیں اگر بدلتے بھی ہیں تو بہت تھوڑا۔ گناہ  
 کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرات نہیں رہتی، اگر گناہ سے باز بھی آجائیں۔ تو  
 میں محسوس کرتا ہوں یہ کئی ہم میں ہے مذہبی رہنماؤں میں ہے جو لیڈر بنے ہوئے  
 ہیں، اور وہ کمال نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں تھا لوگوں کا نہیں کہ جب آپ صلی اللہ  
 علیہ وسلم توجہ فرماتے تو وہ سو فیصد بلکہ ایک سو دس فیصد بدل گئے اور ہم سارا زور  
 لگاتے ہیں تو ہم دس فیصد بھی نہیں بدلتے۔ میرا پنا ذاتی تجزیہ ہے۔ تو حضرتؑ کے  
 پاس ٹھہرتے ایک ذکر نصیب ہوتا، دو تین نصیب ہوتے تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا  
 جیسے کسی خالی ٹینک میں پٹرول بھر دیا گیا ہو یا کوئی خالی میٹر چارج کر دی گئی ہو اور پھر  
 ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر جاتا تو ہمیں محسوس ہوتا کہ ابھی اثر باقی ہے۔ پھر ایک لمحہ آتا کہ  
 ہمیں محسوس ہوتا کہ ملنے کے لئے جانا چاہئے۔ جس طرح کھانے کے لئے بھوک لگتی  
 ہے پانی کی پیاس لگتی ہے اسی طرح شیخ کو ملنے کی پیاس پیدا ہو جاتی تھی وہ کیفیت گھنٹی  
 تھی تو پھر ایک ایسی کیفیت جسے آپ دیوانگی کہہ لیں کوئی دورہ کہہ لیں اسے کوئی نام  
 دے لیں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہمدہ کہتا کہ جناب جس طرح پیاسا  
 جب تک پانی نہ پی لے جب تک ملاقات نہ ہو جائے بات نہیں بنتی تھی تو پھر  
 جب ہم ملتے تو تسلی ہو جاتی۔ ملاقات ہو جاتی تو اطمینان ہو جاتا میٹر چارج ہو  
 جاتی۔ سکون مل جاتا۔

جماعت کی جو بنیاد بنی عام ساتھیوں کو لینے کی۔ مجھ سے بھی بہت بعد میں بنی۔ اور اس میں حضرتؒ نے اعلان بھی فرمایا تھا۔ اس میں آپ Selected لوگوں کو یاد دو تین لوگوں کو لیتے تھے۔ پھر بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد ہوا کہ چونکہ گمراہی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے آپ اس نعمت کو عام کریں چونکہ یاد الہی ذکر اذکار تو گمراہی کو روکنے کا ایک آلہ ہے تو جتنی گمراہی بڑھ رہی ہے اسے بھی عام کیا جائے تو حضرتؒ نے بنیاد رکھی جماعت کی تو پھر بہت سے لوگ آئے ان میں سادہ بھی تھے ان پڑھ بھی تھے غریب بھی تھے فقیر بھی تھے لیکن ہم سب کو اپنا ہم سبق اور مطالب سمجھتے تھے ہمارے ساتھ ایک بابا دوست محمد ہوتے تھے فقیر سے غریب سے آدمی تھے پھر ان کو مشاہدات ہو گئے فنا تک ان کے اسباق چلے گئے۔ تو میں نے حضرت سے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو جتنے دن ہم آپ سے جدا رہتے ہیں اتنے دن یہ ہمیں ذکر کراتے رہیں تو آپ نے فرمایا یہ تو سادہ سے آدمی ہیں اور تمہارے ہم سبق بھی، تو ذکر کرانے کے لئے جو مدد ہوتا ہے وہ شیخ کا نمائندہ ہوتا ہے تو اس کا بھی ادب شیخ کی طرح کرنا پڑتا ہے تو تم شاید اس کا ادب نہ کر سکو۔ میں نے کہا ایسی تو کوئی بات نہیں جب اللہ نے اسے نوازا ہے تو ہم اس سے استفادہ کریں گے۔ تو پھر وہ رہے ہم نے ان سے بھی سیکھا انہوں نے بھی ہمیں محنت کرائی تو کسی کو کشف کی وہ اہمیت نہیں ہوتی تھی جتنی عملی زندگی یا اس کے اسباق کی ہوتی تھی۔

بات یہ ہے کہ حقیقتاً یاد اقتصا پیری مریدی کیا چیز ہے۔ ہمارے ہاں اس کا کوئی تصور نہیں رہا تھا۔ سارا کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا اور بات ہی یہ تھی کہ پیر صاحبان کوئی جنات مسخر کرتا۔ کوئی مدے مسخر کرتا وظیفے کرتے لوگ شیرینیاں دیتے۔ بس اسی کو پیری مریدی کہا جاتا تھا۔ میں بنیادی طور پر دوسرے Way of life کا مدد تھا۔ عملی زندگی کا آدمی تھا۔ جب پیروں کے قریب گئے تو تجربہ یہ ہوا کہ کوئی پیر اس



چلکا ہوا ہے کہ کشتہ، ناؤ تو سونا بن جاتا ہے۔ تانبے سے بن جاتا ہے۔ چاندی سے بن جاتا ہے۔ کوئی جنات کو مسخر کرنے پر لگا ہوا ہے کوئی دوسرا مہدوں کی تسخیر پر لگا ہوا ہے کوئی وظیفوں پہ لگا ہوا ہے تو میں نے دو چار دفعہ یہ مشکل وظیفے جنات کے پڑھے اور وہ بھی میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ہے کیا لیکن اللہ کی شان ہے کہ نہ میرے پاس کوئی جن آیا نہ کسی نے مجھے پریشان کیا نہ کوئی تجربہ ہوا۔ دراصل مجھے ان چیزوں سے بھلی طور پر ہی نفرت ہو گئی تھی کہ اگر دین بھی حصول دنیا ہی کا ذریعہ ہے تو پھر ہم دنیا مختلف ذرائع سے لے لیتے ہیں تو پھر اس میں وظیفے پڑھنے کی یا چلے کاٹنے کی کوئی تک نہیں یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو کسی دوسرے طریقے سے پیسہ نہیں کما سکتے تو وہ پھر چلہ کاٹ لیں یا ایسا ہی کچھ کر لیں تو مجھے یہ چیز پسند نہ آئی۔ اس کے بعد جب اس مرد قلندر نے مجھ شکستہ دل کو سہارا دیا، ساتھ رکھا، بنایا سنوارا پتہ نہیں کیا رنگ چڑھایا اب حیران ہوں کہ لوگ مجھ رو سیاہ کی زیارت کرنے آتے ہیں۔ شاید جمال شمس کا کرشمہ ہے :

دگر نہ من ہاں خاکم کہ ہستم

اور آج اسی شمس فلک ولایت کے صدقے مسجد الحرام میں بیٹھا یہ تاثرات قلمبند

کر رہا ہوں ورنہ :

کہاں میں اور کہاں یہ رحمت خاص

کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

قبل ازیں ۷۴-۷۳ء میں حضرت کے خادموں میں حج بیت اللہ نصیب ہوا

اور آج پھر انہی کے صدقے عمرہ کی سعادت !

(یہ پس منظر کی ایک جھلک تھی)

## سرور سوز مشتاقی

تو فرمودی رہ لہجی گر فہیم  
وگر نہ جز تو مارا منزلے نیست

سحر کا پر نور وقت اور عرب کی مقدس سر زمین 'فضائل' محبوب سے مہک رہی  
تھی کہ طیارے کے پیوں نے زمین کو چھوا۔ نماز فجر جدہ ایئر پورٹ پر ادا کی  
حضرت استاذنا المکرم کے اکثر خدام جدہ میں، ہیں جناب کرنل مطلوب گئے اور  
عزیزی زاہد امین کو تلاش کر لائے ناشنہ سے فراغت کے بعد گاڑیاں لیں اور مکہ مکرمہ  
کا رخ کیا۔ شاید دل نے بھی اپنا قبلہ راست کر لیا

(انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض الخ)



اندھا کر رکھا ہے، اس اندھے پن کا شکار باوجود اندھا ہونے کے نہ کسی سے راستہ پوچھتا ہے اور نہ کسی کے ہٹانے سے راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں میں سفر عمرہ کی چند یادیں دہراؤں گا۔ ان میں ایک نہ بھولنے والی یاد دہرانے پر رب کریم اور اس مہربان ہستی کے لئے بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے جو اس سعادت کا باعث تھی۔

میں بیت اللہ شریف کے سامنے کھڑا ہوں دروازہ مبارک کھلا۔ سخت مزاج سپاہی مستعد کھڑے ہیں کہ کوئی اندر جانے نہ پائے مگر لوگ ہیں کہ اس طرح ٹوٹ کر گر جاتے ہیں کہ ان سے روکے نہیں رکھتے مار کھاتے دھکے برداشت کرتے اور سپاہیوں کی سخت کلامی برداشت کرتے ہوئے اندر چلے ہی جاتے ہیں مگر سب نہیں صرف وہ جو کچھ ہمت رکھتے ہیں یہ حالات دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ جھگڑا کر کے صرف اندر تو جایا جاسکتا ہے مگر ادب کعبہ کہاں اور احترام بیت اللہ کدھر، دراصل عبادت کی جگہ رسومات نے لے لی ہے اور یہی اس امت کی سب سے بڑی بے نصیبی ہے لیکن حمد اللہ اس سب ہنگامہ ہاؤ ہو میں جس قدر احباب اندر جانے کی سعادت سے سرفراز ہوئے انہیں جھگڑا کرنے کی نوبت نہیں آئی، شاید یہ اس حکم کا اثر ہے جو حضور اکرم ﷺ نے حاضری کے لئے صادر فرمایا۔ دنیا عالم اسباب ہے اور سنت اللہ یہی ہے کہ تا تو خود ہے مگر چشم ظاہرین کے لئے سبب کو آزماتا ہے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا تو فرمایا یہ اظہار قدرت تھا، مگر ترک سبب نہ فرمایا جبرئیل علیہ السلام کی پھونک کو سبب بنادیا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کو مصر بھیجا مگر قافلہ والوں کو سبب ظاہری بنادیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کلام کے لئے بلایا گیا مگر طلب ہار کو سبب ظاہری بنادیا۔ غرض ہر کام کی تکمیل کے لئے اس عالم اسباب میں کبھی سبب کو ترک نہ فرمایا۔ سبحان اللہ و حمدہ سبحان اللہ العظیم۔

کچھ احباب کرام تو پہلے حاضر ہوئے آج یہاں قیام کا آخری دن تھا تو مجھ رو سیاہ

کی باری بھی آگنی دروازہ کھلا تھا سپاہی اندر میں جانے دے رہے تھے اور میں کھڑا حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو اندر جاتا بھی تھا لڑتا بھڑکتا دھکے دیتا اور دھکے کھاتا، مگر یہ ادب کے خلاف تھا۔ اچانک سبب الاسباب نے سبب اندر جانے کا پید افرمایا ایک بہت بڑا الو ہے کا جنگلا اٹھائے ہوئے مزدور آئے تو میں بھی دیوانہ وار ان میں شامل ہو گیا، در اقدس سے اونچا کر کے اندر والوں کو پکڑایا کیونکہ بیت اللہ شریف کا دروازہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ کے قریب اونچا ہو گا اب حال یہ ہے کہ جنگلا دروازے کے اندر سے لوگوں نے پکڑ رکھا ہے اور میں باہر ایک نگیزی کے جنگلے پر کھڑا حسرت سے دیکھ رہا ہوں کہ نیچے سے سپاہی کہتے ہیں کہ بس اب اتر آؤ واپس آجاؤ اسی کشمکش میں تھا کہ جنگلا اس قدر اونچا الجھا ہوا تھا کہ کوئی بھی وہاں تک دسترس نہ رکھتا تھا الحمد للہ درازی قامت بھی کام دے ہی گئی اور میں بچوں کے بل کھڑا ہو کے اسے چھڑانے لگا وہ تو گویا اس بات کا منتظر تھا، جنگلا بھی باسانی اندر پہنچ گیا اور یہ رویہ بھی اس دوران ایک صاحب بھی اندر چلے گئے۔

”اندرون“ کو چشم حسرت دیکھا کئی مناظر نگاہوں میں گھوم گئے کوئی وقت تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالی ماگی تونہ دی گئی اور پھر وہ منظر آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضور اس دروازے میں کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: لا تریب علیکم الیوم ”اندرون بیت بھی باہر کی مانند سنگ مرمر کی طرح کے سفید پتھر سے مزین ہے اور تمام دیواریں بھی مکاش سب کچھ بدل دیتے مگر اندر کو چھوڑ دیتے کہ ان ذرات کی زیارت ہو جاتی جنہوں نے قدوم اقدس کو بوسے دیئے تھے مگر شاید تمام آثار اس دور کے مادہ پرست انسان سے پردہ کرتے جا رہے ہیں۔ اندر تین ستون ہیں درمیانی ستون کے ساتھ دو گانہ ادا کیا پھر ہر چہار طرف کے ستونوں میں دو گانے ادا کئے اور درمیانی ستون سے لپٹ گیا۔ حضرت فرماتے تھے اس میں عجیب اثرات

ہیں۔ شاید نبھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹا ہو۔ دیکھا تو تقریباً چار فٹ تک ستون بھی لکڑی کے تختوں میں لپٹا ہوا ہے..... بچوں کے بل کھڑے ہو کر قلب کو ستون سے لگایا شاید اللہ کریم اسی سبب دل کی سیاہی دور فرمادے۔ مسبب الاسباب نے ایک اور سبب پیدا فرمایا شاید باہر لوگوں کا رش ہوا سپاہیوں نے دروازہ بند کر دیا اور مجھ بالائق کو مراقبہ کا وقت میسر آ گیا۔

اب یہاں حضرت جی کا تعارف حیثیت ایک صوفی کے کرادینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس لئے کسی حد تک مقامات تصوف و سلوک بیان کرنا ہوں گے۔ تو اس راہ میں ابتدا یا اجد فنا و بقا ہے۔ مراقبات فنا فی اللہ اور بقا باللہ والا اس قابل ہو جاتا ہے کہ راہ سلوک پر قدم رکھے۔ آگے کی پہلی منزل سالک المجذوبی ہے، جس کی سات منازل ہیں اور ان سات میں تقریباً سو الاکھ نورانی حجابات ہیں جو سالک کو طے کرنے پڑتے ہیں اور پھر دریائے رحمت عبور کر کے پہلے عرش کی منازل میں داخل ہو جاتا ہے پہلے عرش کے اندر تقریباً سو الاکھ منازل ہیں اور یہ شمار حتی نہیں ہے۔ بلکہ ہم نے اندازہ اسی طرح لگایا تھا کہ حضرت جی نے فرمایا۔ میں نے ایک سال پہلے عرش کی منازل شمار کیں تو اول سے لے کر سولہ ہزار تک طے کر سکا۔ پھر تین سال اور لگے تب جا کر عرش طے ہوا۔ یاد رہے کہ جوں جوں روح آگے بڑھتی ہے اس کی قوت اور رفتار بڑھتی چلی جاتی ہے کوئی صاحب حساب کے قاعدوں میں نہ بھنسیں۔ بلکہ مجھ بے نوا پر ہی بھروسہ کریں کہ میں نے حضرت جی کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف چیزوں کا جائزہ لے کر حساب جوڑا تھا تو اندازاً سو الاکھ شمار ہوا تھا۔ ان منازل کے درمیان فاصلہ اس قدر ہے کہ ہر نیچے والی منزل سے اوپر والی منزل اس قدر بلند ہے کہ اگر نگاہ کی جائے تو یوں لگتا ہے جیسے زمین پر سے کوئی اتنا دور ستارہ جو معمولی غنمٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اب پورے عرش کی اندرونی وسعت کا خیال خود کر لیں کہ

ہند عقل یہاں تھک تھک کر گرتا ہے۔

عرش کی تعداد ۹ ہے

آئندہ آمدن فلک معراج اور انبیاء و اولیاء محتاج اور

پہلے اور دوسرے عرش کے درمیان کا فاصلہ عرش اول کی موٹائی سے زیادہ ہے پھر دوسرے عرش کی موٹائی اس فاصلے اور خلاء سے زیادہ علیٰ ہذا ہر عرش کے بعد خلاء بھی ہے اور اسی نسبت سے خلاء اور عرش کی موٹائی بڑھتی بھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نویں عرش کی انتہا عالم امر کی ابتداء ہے جسے عالم حیرت بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں سے دواڑے شروع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک ایک کی وسعت میں جہان گم ہو سکتا ہے۔ اور ہوتا رہا ہے، اول تو بے شمار طالبوں کے نزدیک فنا بقا ہی انتہائے سلوک ہے، لیکن بعض خوش نصیب جو اس سے آگے چلے سالک المجذوب بمشکل عن پائے۔ پھر عرش کی وسعتوں میں خلق خدا سرگرداں رہی۔ ان میں بے صغیر کے بھی ایسے نامور حضرات شامل ہیں جن کا نام اس غرض سے نہیں گنا سکتا کہ نا اہل یہ کہیں گے کہ یہ اپنے آپ کو ان سے اعلیٰ شمار کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز مقصد نہیں۔ میں اپنے کو ان کی خاک پا جانتا ہوں۔ پھر وہ اپنی منزل کو پا گئے اور ہم عالم ابتلاء کے گرداب میں ہیں۔ اللہ ہمیں بعافیت ان کے پاس پہنچائے۔ آمین!

ان دواڑوں کی تعداد ۳۶ ہے اور ان کی وسعت بے کراں پہلا دواڑہ مقام تقرب ہے، جس کی پناہیوں کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ نو عرش اور دنیا و مافیہا اسکے مقابلہ میں اس طرح ہیں جیسے کسی صحرا میں ایک مندری۔ اس دواڑے میں علی ہجویریؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات ہوئی۔ یہاں سے آگے کے بعض دواڑوں کی بات حضرت مجدد صاحب نے ارشاد فرمائی ہے مگر وہ سیر نظری ہے جہاں

تک ان کی نگاہ نے کام کیا۔ بہر حال چوتھا دائرہ مقام سلیم ہے۔ جہاں مقامات ولایت اولیاء کی انتہا ہے۔ اس دائرے میں ایک ایسی ہستی ملتی ہے جو بحیرہ میں دفن ہیں اپنے زمانے کے غوث تھے ظلماً شہید کئے گئے۔ اب ان کے اوپر آبادی ہے اور مکان بنے ہوئے ہیں۔ یہ بے نوا ایک بار کسی کام سے بحیرہ گیا، تو ملاقات اور حاضری نصیب ہوئی۔ فرماتے تھے کہ ان مکانوں کے رہنے والے اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ان کی عورتیں بدکار ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت نشاندہی ہو جائے تو ممکن ہے کہ لوگ جگہ خالی کر دیں تو فرمایا میں ہر صاحب کشف کو بھی اپنی جگہ دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر نشاندہی ہو گئی تو دنیا بھر کے بدکار یہاں جمع ہوں گے۔ اس سے یہ چند بہتر ہیں۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ اس سے آگے ولایت انبیاء شروع ہوتی ہیں۔ جو نبی کو وہی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ اور قبل نبوت بھی حاصل ہوتی ہے جس میں امتی صرف اتباع پیغمبر کی وجہ سے باریاب ہوتا ہے۔ ورنہ یہ منازل امتی کے لئے نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے شاہی محل میں بادشاہ کے ساتھ خدام بھی رہتے ہیں۔

یہاں سے چھ دائرے عبور کرنے کے بعد ساتواں دائرہ مقام رضا ہے جس کے آخر میں ایک ایسی ہستی ہے جو سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے خلیفہ اول تھے اور یہاں سے آگے پانچواں دائرہ حقیقت رسالت کا ہے۔ جس کی ابتدا میں حضرت سیدنا زید علی شاہ صاحب (ان کا مدفن کشمیر میں ہے۔ اور غیر معروف ہے) کی وفات ہوئی اور اس دائرہ کی انتہا میں شیخ عبدالقادر جیلانی عالم بقاء کو سدھارے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

اور بے شمار ہستیاں ہوں گی۔ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اس گزرگاہ میں نقش کف پائے حبیب ﷺ پہ سے دیتے چودہ صد سال بیت چکے ہیں۔ میں نے صرف ایک دو نام تمبر کاغذوں کی جہالت کی ہے۔



آگے چمنادائرہ مقام افراد ہے۔ جس میں اکثر صحابہ کرامؓ عظیم اجمعین ملے ہیں۔ یہاں ایک بات یاد رہے کہ یہ بہت نازک مقام ہے۔ حضرت مجددؑ نے جب بات کی تو ان پر فتویٰ لگا تھا کہ یہ اپنے آپ کو صدیق اکبرؑ سے افضل جانتا ہے لیکن یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب نبی ان مقامات سے گزرتا ہے تو حیثیت نبی کے گزرتا ہے صحابی گزرتا ہے تو حیثیت صحابی کے گزرتا ہے اور ولی گزرتا ہے تو ان کا کشف و ادب ہو کر۔ ورنہ قرون ثلاثہ مشہود لہما بالخیر کا مرتبہ شان ولایت کی رسائی سے بالاتر ہے۔ رہی بات فتوؤں کی تو وہ لوگوں کا مزاج بن چکا ہے۔ جب معاملہ عند اللہ درست ہو تو فکر کی بات نہیں۔ ممکن ہے فتویٰ لگانے والے بھی خلوص سے کام لے رہے ہوں مگر حالات کو نہ سمجھ سکے کی وجہ سے معذور ہوں۔ اللہ کریم ہم سب کو ہدایت پر رکھے۔ آمین!

اس کا اگلا دائرہ قطب وحدت کا ہے اور اسکے بارے میں مناسب ہو گا کہ میں حضرت جی کے مبارک الفاظ نقل کر دوں۔

”یہ وسیع دائرہ ہے۔ ڈیڑھ سال مدہ اسمیں سرگرداں رہا۔“

اس مبارک روح کی قوت پر داز اور رفتار کا اندازہ کر کے اس دائرے کی وسعت کا خیال کیا جائے تو بات حسب و شمار کی حدود کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

اگلا مقام دائرہ صدیقیت ہے اور پھر قرب نبوت، قرب رسالت، قرب اولو العزمی قرب محمدی، وصال محمدی، رضائے الہی، قرب الہی، وصال الہی، قرب رحمت بحر رحمت، خزانہ رحمت اور منبع رحمت یہ بارہ دائرے ہیں جن کی وسعتیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

یہاں حضرت جی فرمایا کرتے تھے کہ تقریباً ایک چوتھائی سلوک یہاں طے ہو جاتا ہے۔ میری ناقص رائے میں جو اصحاب یہ لکھ دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے

سلوک مکمل طے کر لیا۔ شاید وہ کچھ اندازہ کر سکیں۔

اس سے آگے حجابات الوہیت ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ یہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ حضرتؑ جی نے فرمایا تھا کہ ”یہ بدکار سوم حجاب میں ہے۔“

میں نے یہاں بھی حضرتؑ جی کے الفاظ نقل کرنے کی جرأت کی ہے۔ حجابات الوہیت ختم ہو کر قرب الہی شروع ہوتا ہے۔ وہاں مقامات و منازل کی تعین نہیں ہو پاتی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ حضرتؑ کا دو سال ۱۸ فروری ۱۹۸۴ء کو ہوا۔ یعنی سترہ سال چار ماہ اور نو روز بعد ان ساڑھے سترہ برسوں میں اس مسافر کو رب ذوالجلال نے جس قدر باندی منازل طے کرائی یہ بات وہ خود ہی جانتا ہے۔

اب اس کا دوسرا پہلو مناصب کا ہے۔ اقطاب غوث وغیرہ اور یاد رہے کہ غوث روئے زمین پر ایک وقت میں ایک ہوتا ہے گا ہے ترقی پا کر قیوم بنتا ہے اور پھر فرد۔ اگر اس سے ترقی نصیب ہو تو پھر قطب وحدت اور قطب وحدت اگر ترقی کرے تو صدیق بنتا ہے۔

خدا کے لئے ان الفاظ کو خار زار افت میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ یہ اسماء ہیں مراتب ولایت کے اور مناصب اولیاء اللہ کے نام ہیں۔

پھر میں عرض کر دوں کہ نبی کے مناصب و منازل حیثیت نبیؐ صحابی کے حیثیت صحابی اور ولی کے حیثیت ولی ہوتے ہیں۔

منصب صدیقیت کی آخر ایک اور صرف ایک مقام ہے یا منصب ہے۔ جسے قرب عبدیت کہتے ہیں اور وہ حضرتؑ (جی اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں برسائے) کو نصیب تھا۔ والحمد للہ علی ذالک۔

یہ جملہ امور دلائل ذوقیہ سے متعلق ہیں اور صرف صاحب ذوق و احوال حضرات ہی جان سکتے ہیں یا پھر اعتماد ہو بیان کرنے والے پر۔ مگر ایک دلیل ایسی بھی

پیش کرنا چاہوں گا جسے ہر صاحب عقل بھی سمجھ سکے اور وہ یہ کہ برکات نبویؐ میں ایک کمال یہ تھا کہ ہر آنے والا صحابیؓ جن جاتا تھا۔ مرد، عورت، چھ، نو، زحما، عالم، جاہل، شری یا بدوی، گور، یا کالہ۔ ہر آنے والا ایک نگاہ میں درجہ صحابیت حاصل کر لیتا تھا۔ پھر خود صحابہ کرامؓ کے اندر جو مدارج ہیں وہ علیحدہ بات ہے۔ صحابہؓ میں بھی یہ کمال منعکس اور منتقل ہوا کہ ان کی صحبت اور زیارت سے مشرف ہو نیو والا تابعیؓ جن جاتا تھا۔ تابعین کو بھی یہ کمال حاصل ہوا کہ ان کی نگاہ شفقت تبع تابعیؓ، نادیتی ہے۔ خیر القرون کے بعد امت مرحومہ میں بیشمار جلیل القدر ہستیاں آئیں اور اللہ نے ہر دور اور ہر ملک میں بہت اعلیٰ مدارج کے حامل اولیاء اللہ پیدا فرمائے۔ لیکن ساری تاریخ میں کوئی ایسی ہستی نہیں مل سکتی جس کے پاس حاضر ہونے والے تمام آدمیوں کے دل منور ہو جائیں۔ لطائف روشن ہو جائیں اور ولایت خاصہ سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے۔ بلکہ بے شمار افراد آئے جن میں سے مخصوص چند حضرات ایسے خوش نصیب ہوئے جو سینہ روشن لے کر جاتے۔ باقی سب لوگ ظاہر ایعت اور تعلیمات ہی تک رسائی پاتے اور بس۔

یہ حقیقت کسی ایک یا دو یا چند حضرات کے بارے میں عرض نہیں کر رہا۔ بلکہ چودہ صدیوں پہ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور جب اس کے ساتھ نگاہ قلم فیض، بحر العلوم، حامل قرب عبدیت حضرت استاذی المکرم و محترم کی جانب انھیں ہے تو وہی بہار لٹتی نظر آتی ہے یعنی خدمت میں آنے والے ہر آدمی کا سینہ منور ہو جاتا ہے۔ ایک نگاہ میں لطائف چمکنے لگتے ہیں کوئی بھی فیوض و برکات و روحانی و قلبی سے محروم نہیں رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ جس کا جتنا ظرف ہے یا جتنا نصیب ہے اتنا ہی پاسکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ ”لائشغی جلیبر“ اور اس گئے گزرے دور میں بارگاہ نبویؐ میں شفا اور روحانی طور پر باریاب ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک

بڑھ جاتی ہے۔ سبحان اللہ۔

یہ چند -طور بطور تعارف لکھ دی ہیں کہ احباب کو کسی حد تک اپنے شیخ کی عظمت کا اندازہ نصیب ہو۔ اب وصال کے حالات درج کرتا ہوں۔

وما تولىبقى الا بالله العلى العظيم

یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے جب میں حضرت جی کے ہمراہ کاب تھا تو روزہ الطہر سے رخصت ہونے کا منظر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت سر جھکانے دست بستہ پرکاو کی طرح لرزاں کھڑے تھے اور اس شدت سے رو رہے تھے کہ نت زار و قطار کہا جائے تو غالباً مضموم ادا نہ ہو۔ حضرت ٹوٹ کے بہتے اور ہلکے ہلکے کر روئے۔ اس قدر مضبوط اور عظیم انسان جس نے مردانہ وار ہر اس طاقت کو لاکار اجو اسلام کے خلاف اٹھری۔ اور زندگی بھر عصمت رسول ﷺ اور عصمت صحابہ کی پاسداری کی جسے میں نے سفر و حضر میں ہنگاموں اور اجتماعات میں اور تنہائی و خلجہ گئی میں ہر حال میں ایک چٹان کی طرح بچھ اس سے کہیں زیادہ مضبوط پایا۔ اس ہستی کو اس طرح ٹوٹتے بکھرتے اور قدموں پر شمار ہوتے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ آپ کی یہ آخری حاضری ہے اور پھر شاید اس مادی جسم کے ساتھ حاضر نہ ہوں۔

اس کے بعد کتنے پروگرام عمرہ کے لئے حرمین شریفین کی حاضری کے لئے۔ ہر بار میں نے جناب کر نل مطلوب حسین صاحب سے یہی عرض کیا کہ میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اب حضرت وہاں حاضر نہیں ہو رہے اور ہر بار وہی ہوا لیکن اس میں ایک بات تھی۔ یہ کھٹکانہ تھا کہ حضرت کا فوراً وصال ہو جائے گا۔ صرف یہ تھا کہ اب شاید دوبارہ حرمین شریفین میں حاضر نہ ہوں۔

پھر احباب کو یاد ہو گا کہ جب لنگر مخدوم کے پروگرام پر حضرت جی نے سلسلہ عالیہ کے لئے خصوصی احکام و ہدایات ارشاد فرمائیں تو جناب کر نل قریشی صاحب

مرحوم 'مدہ کے پاس تشریف لائے اور مبارک باد دی کہ تمہیں حضرت نے بہت نوازا ہے اور اللہ کا بڑا احسان ہے۔ تو انہیں یاد ہو گا کہ میری آنکھیں جل تھل تھیں اور میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مجھے اس میں حضرت کے وصال کی خبر نظر آتی ہے۔

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ حضرتؒ کی خدمت میں حاضری اور معمولات جاری رہے کہ اس سال جنوری میں مجھے اوکاڑہ ایک سیر پکا نفرنس پہ جانا پڑا۔ جو چھاؤنی میں منعقد ہوئی تھی۔ واپس آکر میں نے حضرتؒ جی کی خدمت عالیہ میں حاضری دی۔ بہت دیر تک جلسہ کی کارروائی کا پوچھتے رہے۔ بہت خوش ہوئے اور پھر احباب سے بھی بار بار اس کا تذکرہ فرماتے رہے۔

اس دن حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے کچھ تکلیف ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ غالباً کوئی دوائی ایسی کھالی ہے۔ جس سے منہ اور زبان خشک ہے۔ یہ تکلیف بڑھتی رہی تا آنکہ دہن مبارک اندر سے پھٹنے لگا اور خون رشنا شروع ہو گیا۔ کھانا تو درکنار کوئی چیز پینا بھی مشکل ہو گیا۔ راولپنڈی اطلاع ہو گئی اور کرل محمد بشیر کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ حضرتؒ کی زندگی کے آخری سفر میں ہرکاب تھے۔

اسلام آباد میں جناب فضل کریم صاحب کے گھر میں حضرتؒ جی کا علیحدہ کمرہ ہے آپ وہاں تشریف لے گئے۔ دوسرے دن 'مدہ بھی حاضر ہوا۔ احباب جمع تھے۔ علاج شروع ہوا اور حمد اللہ جس حد تک ممکن تھا علاج ہوا۔ احباب نے جی بھر کے خدمت کی اور جھولیاں بھر بھر کر انوار و کیفیات کو لوٹا۔ دور دراز سے احباب حاضر خدمت ہوتے رہے اور دیدار پر انوار سے دل و نگاہ کو روشن کرتے رہے۔ تکلیف بڑھتی گئی۔ غذا تو درکنار حضرتؒ بات کرنے سے بھی عاجز تھے۔ لکھ کر ارشاد فرماتے تھے کاپی اور پنسل میز پر رکھی رہتی پھر مزید تکلیف بڑھی تو ملٹری

ہسپتال میں حضرت کو لایا گیا۔ ایک خصوصی کمرہ حضرت کے لئے تھا اور ڈاکٹروں کا x-ray یہ سلسلہ کافی دنوں چلا کہ طبیعت سنبھل گئی۔ ڈاکٹر شب و روز بارگاہ عالی میں حاضر تھے۔ مگر تے بھی لوگ آتے تھے اور شرف ملاقات حاصل کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ نیز حضرت بہت تسلی دیتے تھے اور سب کو ہمت اور حوصلے کی تاکید فرماتے کہ مددہ ایک شام کو حاضر ہوا۔ بہت سے احباب تھے اور حضرت مختلف صاحب نظر خدام کو مشائخ سے رابطہ کراتے اور حالات کے بارے سوال فرماتے۔ جس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مشائخ سے پوچھو میں کس روز گھر جا رہا ہوں۔ اس روز جمعرات تھی تو جو بابا ارشاد ہوا کہ اگلے اتوار کو آپ گھر تشریف لے جائیں گے کہ مددہ سے مخاطب ہوئے تو اور باتوں کے علاوہ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا چلہ پورا ہو چکا ہے۔ میری ناقص رائے میں آپ کی آخری منازل کا تقاضا تھا کہ من جانب اللہ آپ سے مجاہدہ کرایا گیا، خوراک ختم، بات کرنا ختم اور آنکھ جھپکنا ختم ہو گیا۔ یعنی قلت طعام قلت کلام اور قلت منام کا وہ کڑا معیار پورا کر لیا گیا۔ جو صرف ان ہی کا حصہ بھی تھا اور حوصلہ بھی کہ کسی نے آپ کے لب مبارک سے اف تک نہ سنی۔ نماز ادا فرماتے تو مشکل اشارے کے ساتھ اور پھر احباب کو رخصت فرما رہے ہیں۔ غالباً اہل فہم نے محسوس بھی کیا ہو گا اور گھر سے بھی جب خود رخصت ہوئے تو بالکل فارغ ہو کر تمام مسائل کا حل عطا کر کے کہ میرے بعد کیا کرنا ہو گا۔ جائیداد کا کیا ہو گا اور کس آدمی کو کیا فریضہ سونپا جائے گا۔ میری قبر کہاں ہو گی۔ اور اس کے ساتھ کیا کچھ تعمیرات کی جائیں۔ سلسلہ عالیہ کے احباب کس طرح اپنا کام جاری رکھیں گے۔ غرض ہر طرح سے مکمل ہدایات دیں اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ کے وصال کے بعد کوئی ایسا سوال موجود نہیں جس کا جواب حضرت عطا نہ فرما گئے ہوں۔ خیر جو بات میں نے منازل کے بارے میں عرض کی تھی دراصل تو وہ بھی

وصال کی خبر تھی کہ جہاں تک منازل طے فرمانے تھے۔ حمد اللہ پورے ہوئے۔ بندہ نے دوسرے روز جمعہ پنڈی پڑھایا اور واپس آگیا۔ حضرت اسلام آباد تشریف لے گئے۔ ہماری دور ہونے لگی تا آنکہ اکثر لوگوں نے علاج ختم کر دیا۔ بندہ حاضر ہوتا رہا اور آخری بار جمعرات حاضر ہوا مختلف باتیں مختصر ارشاد فرمائیں اور واپسی کی اجازت بخشیں۔

جمعہ منارہ پڑھا۔ بھٹے کے روز طبیعت بے چین سی تھی تو بندہ گھر سے نکلا۔ راستے میں عزیزم خدا بخش کو لیا اور ذوال محمد یوسف صاحب کے پاس چلا گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ دل کو قرار نہ تھا۔

اٹائے راہ میں عزیزم خدا بخش سے بات بھی کی کہ حضرت کی طرف سے دل بہت مشکوک ہے اور باوجود اسکے کہ حضرت رو بھرت ہیں۔ مجھے حضرت کے صحت یاب ہو کر واپس آنے کی امید نہیں۔ پھر محمد یوسف صاحب سے پنڈی جانے کا پروگرام بنا اور واپس آگئے۔ اب میں وہ بات عرض کروں جس کی خاطر یہ تمہید عرض کی ہے۔

میں نے مغرب کی نماز ادا کی تو انوار کی بارش نے گھیر لیا۔ حتیٰ کہ میرے لئے بیٹھا محال ہو گیا۔ میں ہسٹر پر لیٹا تو استغراق طاری ہو گیا۔ استغراق راہ سلوک کی ایک کیفیت ہے۔ جس میں ظاہر بدن بے حس ہو جاتا ہے اور روح پوری طرح متوجہ الی اللہ بھی ہوتی ہے جسم کی حالت سے باخبر بھی یہاں تک کہ لوگوں کی باتیں سنائی دیتی ہیں۔ جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔

یہ ساڑھے چھ بجے شام کا وقت تھا کہ بارگاہ نبوتؐ بھی تھی۔ مجھے تقریباً پچیس سال ہوئے ہیں کہ میں بارگاہ نبوتؐ کی حاضری سے مشرف ہوں۔ الحمد للہ مجھے بے نوا پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ شیخ کامل کو وسیلہ بنا کر میری جوانی کی طویل راتوں کو محفل نبویؐ سے چہ اغاں کر دیا۔ غالباً یہ شعر اگر میں اپنے شیخ کے لئے عرض کروں تو سب سے زیادہ مناسب ہو گا۔

جزاک اللہ کہ ہنرمند باز کردی

مرا با جان جاں ہمارا کردی

میں نے اس طویل حاضری میں اس طرح کا اجتماع نہ دیکھا تھا۔ خصوصاً شیخین کریمین امیر المؤمنین سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور سیدنا عمر فاروقؓ کو بہت زیادہ متوجہ پایا اور خصوصی اہتمام میں حضرتؓ جی کو گھر پایا۔ میں بے نوا ہر کاب تھا۔ بہت شاندار اور عجیب طرح کا لباس حضرتؓ کے زیب تن تھا۔ سر پر تاج جگمگا رہا تھا۔ خصوصی نشست بنی تھی۔ اور نبی رحمت ﷺ تبسم کنناں اور رحمت بر سارے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ عزت افزائی جو ایک بالکل انوکھی طرز پر ہے۔ غالباً حضرتؓ جی کو کوئی بہت ہی خاص منصب عطا ہو رہا ہے اور یہ کیفیت ساز ہے چہ بچے سے بچے کر پونے آٹھ بجے تک رہی۔ میں نے حضرتؓ جی سے بار بار سنا تھا کہ مراقبہ فنا فی الرسول ﷺ اگر مضبوط ہو تو ایسے لوگوں کی ارواح قبض کر کے پہنچائی نہیں جاتیں بلکہ روح تو دربار نبویؐ میں حاضر ہوتی ہے اور ملک الموت جسم سے دنیوی زندگی والا تعلق ختم کر دیتا ہے لیکن اسکا مشاہدہ اس روز ہوا اور حضرتؓ جی کے وصال پہ ہوا کہ جن مبارک ارواح کو حضوری حاصل ہوتی ہے۔ انہیں کس طرح شرف باریابی حاصل ہوتا ہے۔ ساری کیفیات کو نقل کرنا محال ہے۔ اگر احباب میں سے کسی کو شوق ہو تو صاحب کشف احباب کو انشاء اللہ ایک نگاہ میں ساری کیفیات دکھائی جاسکتی ہیں اور دوسروں کو اگر شوق ہو تو محنت کریں کہ باطن روشن ہو جائے۔ و ما توفیقی الا باللہ۔

میں اسی طرح ان کیفیات میں مستغرق تھا کہ عزیزم کر عل محمد اکرم صاحب کی طرف سے ٹیلیفون پر اطلاع پا کر ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور حضرتؓ کے وصال کی خبر دی میں اگرچہ بڑی شدت سے اپنی کیفیات میں مستغرق تھا۔ مگر صحن میں یہ آواز کہ حضرتؓ کا وصال ہو گیا ہے سن کر استغراق ختم ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ گاڑی نکالی اور راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ جسد مبارک اپنے کمرے میں محو استراحت تھا اور روح مبارک اعلیٰ علیین میں متوجہ الی اللہ۔ احباب پروانہ وار پنچھار ہو رہے تھے۔ پشاور سے لاہور تک آنے والے آرہے تھے کہ دو بجے رات حضرت کے جسد



مبارک کو غسل دیا گیا۔ زاہد صاحب، 'معموصی خدمت پر مقرر تھے اور باقی جماعہ احباب بھی اپنا اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ سحری کو تین بجے وہاں سے نکلے۔ میں زندگی میں آخری بار حضرت جی کی موٹر چار باتھا۔ فجر کی نماز دارالعرفان میں ادا کی اور یہاں میں نے روح پر فتوح کو دارالعرفان کی طرف متوجہ پایا۔ برادرم کر عل مطلوب حسین صاحب مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ حضرت جی سے اجازت کیوں نہیں حاصل کرتے کہ جسد مبارک کو دارالعرفان میں دفن کیا جائے میں نے پوری کوشش کی۔ عرض کیا کہ حضرت آپ کے اہل خانہ کو یہاں گھر بنا کر پیش کر دیں گے اور ہر طرح سے آرام میں ہوں گے انشاء اللہ۔ مگر نہیں۔ فرمایا۔ زندگی میں بے شمار افراد کو مجھ پر بھروسہ تھا اور اللہ نے مجھے ان کا آسرا دیا تھا۔ تم سب کو یہاں نہیں لا سکتے۔ اب میری قبر ان کے لئے ایسا ہی آسرا ہوگی۔ جس طرح زندگی میں میری ذات تھی اور آپ نے حرف حق ارشاد فرمایا۔ سبحان اللہ کیا بچا ل لوگ تھے اللہ ان پر کروڑوں کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

میں حالات دنیوی اور دفن کے ارکان کی تکمیل عرض کرنا نہیں چاہتا۔ کیفیات عرض کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ پچھلے پیر جنازہ اٹھا۔ پہلے عصر کی نماز اور پھر نماز جنازہ مجھ بے نوائے پڑھائی۔ لحد میں اتارا۔ ایک ہجوم ناشتال تھا جسے سنبھالنا میرے بس سے نکل نکل رہا تھا۔

اپنا دل درد سے پھٹنے کو آگیا تھا۔ لیکن مجبور تھا کہ مجھے بے شمار قیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا تھا اگرچہ میں خود یتیم ہو چکا تھا۔ مگر حمد اللہ بالغ تھا۔ مگر مجھ سے چھوٹے میرے ساتھ لپٹ رہے تھے۔ تمام مراحل طے ہوئے اور یہی اتوار کی شام تھی جس کے بارے میں مشائخ کرامؒ نے اطلاع دی تھی کہ آپ گھر پہنچ جائیں گے۔ اس سے مراد دنیا کا گھر تھا۔ تو ابھی اور مد زخ کا مکان تھا تو ابھی دونوں طرح سے درست ثابت ہوئی۔

میں ذرا سخت مزاج اور مضبوط قسم کا آدمی ہوں۔ مجھ پر مگر یہ طاری نہیں ہوا کرتا۔ یہاں تک کہ بیت اللہ شریف کے سامنے لوگوں کو دو حائیں مارنا دیکھ کر جی

چاہتا کہ میں بھی روؤں لیکن کیسے؟

اور پھر دوسری مرتبہ حضرتؒ جی کے ہمراہ عمرہ کے لئے حاضری انصیب ہوئی۔ تو مدینہ منورہ میں روزنہ اطہر کے قریب عشاء کے وقت ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو حضور اکرمؐ کے مدنی حیات مبارکہ کے مختلف حالات و مناظر منکشف ہوتا شروع ہوئے۔ جب بات وصال نبویؐ پر پہنچی۔ حضور کا سفر آخرت منکشف ہوا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا کس طرح محبوب کو لحد میں اتار رہے ہیں۔ اور کس دل سے قبر اطہر پر مٹی ڈال رہے ہیں تو دل پھٹ پڑا۔ رونا آیا اور یوں آیا کہ آج تک نہیں تھا۔ خود ہی بیان کر رہا ہوتا ہوں اور خود ہی رو بھی رہا ہوتا ہوں اور پھر رہی سہی کی حضرتؒ جی کے سفر آخرت نے پوری کر دی۔

میں نے خود قبر کو سنوارا۔ خود پتھر اپنی گاڑی پر لاد کر ڈھوئے۔ حضرتؒ کا جنازہ پڑھایا اور اپنے شیخ اپنے بزرگ، اپنے مرئی اور اپنے استاد کو لحد میں اتروایا۔ وجود مبارک، زاہد صاحب اور کرئل سلطان کے ہاتھوں میں تھموا یا۔ کیا کڑی آزمائش تھی کہ کرئل سلطان جیسا مضبوط آدمی چٹلک پڑا۔ اور جسد مبارک سے چٹ گیا۔ پھر مٹی ڈالی اور قبر مٹادی۔

تو میں نے جو احباب بھرت مجھے مل سکے۔ سب کو جمع کر کے قبر شریف کے پاس بٹھایا کہ جو سمجھ آئے مجھے بھی اطلاع کرنا۔ لیکن واللہ باللہ جیسے قبر پہ مٹی ڈالی گئی تو ایک جھلی تھی ایک جلوہ تھا ایک چمک تھی جو ایک آن میں لپکی اور حضرتؒ بھی اسی کے ساتھ منازل بالا کو تشریف لے گئے۔ اگر فرشتے تھے تو اسی چمک میں تھے اور اگر سوال جواب ہوئے تو اسی میں ہوئے ہوں گے۔ اگر بارگاہ رب العزت کی پیشی ہوئی تو اسی میں ہوئی ہوگی۔ ہم ناکارہ تو اس سے آگے کچھ نہ دیکھ سکے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا، یہ الگ بات ہے۔ ہاں اتنا عرض کروں کہ حضرتؒ جی نے دو باتیں ارشاد فرمائیں تھیں۔ ایک یہ کہ پوری توجہ اور محنت سے جماعت کو چلاؤ انشاء اللہ کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اگر کوئی اختلاف کر کے جانا چاہے تو اسے پیچھے سے آواز

دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تمہیں کسی کا محتاج نہیں رکھے گا۔ ممکن ہے الفاظ کچھ حد تک بدل گئے ہوں۔ مضموم یہی تھا اس ارشاد نبویؐ کا جس سے اسی شام حضور ﷺ نے اس بے نوا کو نوازا۔ دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ فضل کریم ہت صاحب نے میری بہت خدمت کی ہے۔ جماعت کے دنیاوی امور میں ان سے مشورہ لیا کرنا۔ ان کی تعمیل میں میں نے انہیں ناظم انجمن صاحب کا مشیر مقرر کیا ہے۔ جملہ احباب کو اطلاع رہے۔ تیسری بات آپ کے گھر کے بارے میں تھی۔ یہ جملہ احباب حلقہ اور اصحاب ذوق حضرات کے لئے ہیں۔

نہ کسی کو مخاطب کیا ہے نہ کسی سے غرض۔ ایک کیفیت بطور امانت تھی جو نقل کر دی۔ میرے خیال میں اس پر کسی کو فتویٰ صادر کرنے کا تکلف نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی نہ ہی رہے تو اپنا شوق پورا کر لے۔ میں سب کے لئے صرف دعا کروں گا۔ تاکہ اللہ جملہ مسلمانان عالم کو استقامت علی الدین نصیب فرمائے۔ خصوصاً احباب حلقہ کو بہت واستقامت اور بلندی درجات عطا کرے۔ مجھ بے نوا کو دین کی خدمت کی توفیق ارزاں فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے اور برزخ اور آخرت میں شیخ المکرم کے ساتھ بارگاہ نبویؐ میں باریاب رہنے کی توفیق ارزاں رکھے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین

فقیر بے نوا دعا گوئے عالم

محمد اکرم اعوان

(منارہ ضلع چکوال)

## حوالہ جات

- ۱- دیار حبیب میں چند روز
- ۲- ارشاد السالکین
- ۳- حضرت جی کا انٹرویو

خطوط بنام حضرت محمد اکرم اعوان صاحب



## خدمت عزیزم ملک محمد اکرم صاحب

السلام علیکم۔ اچھا یہ کہ آپ آج رات کو چلرالہ آجائیں۔ لاہور  
 سے واپس کار لانے والا آدمی اور خدا بخش علی البیہ تھا ۱۹ کو  
 پتوال خاں ہوں رہنا معمولی دو کھیل و عینہ ہمراہ کا رہا  
 لائیں دن باکوں چھوٹے ہیں آپ اگر مارہ سے ۱۹ صبح  
 صبح کو چلیں تو لاہور جانے میں بڑی دیر ہو جائے گی آپ  
 آج ہی ۱۸ شام کو کار شاہین پاسا جمعہ کر جائیں  
 تاہم عرض سے مبلغ ۵۰۰ روپیہ میرا خدا بخش کے پاس  
 ہے ان سے کہنا کہ وہ ضروری۔ بطرح ہو۔ ہمراہ چکوال  
 لئے اور 200 میں ہمراہ لاؤنگا۔ یہ ایک ہزار روپیہ مولانا  
 سلیمان صاحب کی امداد ہوگی۔ تاہم۔ اگر مولوی صاحب  
 رہ جائیں تو یقیناً صبح فاص کہ دربار بنوت؟ جو چیزیں  
 موی ہیں۔ ان میں سخت نقصان ہو۔ ~~مکتوبہ کو مستحق قرار دیا~~  
 کڑوں۔ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 اور مشائخ۔ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 ہے بیوچیں۔ آپ کو غائبانہ تکلیف۔ نقصان۔ نقصان۔ نقصان  
 تویٰ منصب۔ علی والا ہے مگر اس امر کو دل میں کوئیں کسی  
 سے زکریا نہ کرنا۔ میں نے کافی عرصے سے اس منصب کے  
 بائیں میں آپ کے علم کا ہی بہت کچھ ہے۔ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 الامت باللہ اور ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 جتنی کہ دھوڑا کو سرور سے ملتا ہے۔ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 ذات العالمین میں ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 فرماتے ہیں۔ آپ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 میں سنتی۔ نوافل کی کمی۔ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 ہر وہ شخص جو ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~  
 بنایا جائے۔ آپ ~~مکتوبہ کو ضائع ہو جائے۔ مکتوبہ کو ضائع ہو جائے~~

پیر طہنہ کرنا جیسا جویم آباد بشیر کے متعلق کہا کہ یہ عمل  
 اعلیٰ صائب کہہ دیتے۔۔۔ خا میں موت میں ہیں۔ اس  
 دن اس بات کا۔۔۔ یہ بیاہتی کو رہے۔ آپ سے یہ افضل  
 و اعلیٰ خیال کر لیں۔ خواہ وہ آپ کی شان و عظمت  
 کے سامنے ایک چوکیدار ہیں۔ یہ تو یقینی امر ہے کہ اگر  
 سے زاہد آپ کے منصب کے سامنے چہرہ ایسی ہیں جس  
 خودی رب کو نہ ہوتا نہیں ہے۔۔۔ یہ جان۔۔۔ یہ بیاہتی کو رہے  
 ہوگی۔ اس صفت میں۔۔۔ یہ بیاہتی کو رہے۔۔۔ یہ بیاہتی کو رہے  
 ہوگی خیال کرنا۔۔۔ باقی رقم بشیر کو میں نے دی تھی اس  
 میں میری ذات رقم ۱۲ ہزار تھی تین ہزار کا یہ سود لے  
 کہ آیا ہے وہ اب ملنی شکل۔ میں نے خود بھی معاف  
 کیا۔ سال تک بٹایا۔ کتب ہزار۔ جو وہی صائب کی امداد  
 ہوگی۔ صد خدا بخش کر مرضی کننا کہ دے۔ خواہ صائب  
 سے قرض لے۔ سات ہزار اور کچھ زاہد چ کے یہ اور  
 خرچ گھر کیے۔ اور بٹایا امانتیں تھیں وہ تمام واپس  
 کر دی کہ زندگی موت کی علم نہیں ہے۔ شکیل نے ٹھونٹ  
 اور سال کر دیا ہے۔۔۔ بشیر کے ہاتھ امانتیں واپس کر دینا  
 اور کر دی ہیں۔ میں آج تمام ختم کر دینا۔ فقط۔ بہر حال  
 آپ ۱۸ شام کو چلے الہ آباد جائیں۔ سستی نہ کریں  
 اللہ تبار









ایک ترکیب میں



تقریر کا ایک انداز

[illegible]

L 14

ع 13

محدث مسریم محمد اکرم صاحب اسلام علیکم  
 مگر ہی نام ملا کا شرف حال ہوا - آپ کو خیال گزرا کہ شاید  
 شیخ کو ناراضگی ہو مگر نہیں ہے - برائیانی میری تو آپ  
 کو آئندہ ہی نہایت تکلیف دے گی خواہ کسی عذر کی  
 وجہ سے ہو - ابو جہ گہرا تعلق کے - آخری منزل - و  
 آپ کا پاس وہ نسیب جناب کے احکام شرعی  
 میں تسامح بڑی مجالس ، منحوس غداروں میں نہ  
 میری وجہ سے - آپ کو میں رہنا خلع و محبوب  
 روحانی یکم جانتا ہوں - خدا جانتا ہے عبد الرؤف  
 کی ناراضگی کے بعد اگر دل کو تسلی ہو رہی ہے تو آپ  
 کا وجود میں خوشی کا سبب بننا ہے یا بشر - جسے  
 کو یہ بھی یقین ہے میرے بعد بھی آپ کلثوم و منورگی  
 کی سرپرستی کیا کرو گے وہ بھی آپ کی بھینس میں  
 ہیں آپ کو اس شہر کا صدقات جانتا ہوں

من تو شدم تو من بشدی  
 من تن شرم تو جان بشدی  
 تا کیں یہ گوید بعد از این  
 من دیگرم تو دیگر کی

میں آپ کو رہنا روحانی یکم خیال کرتا ہوں  
 آپ کی بیویوں کو رہنی بیٹیاں - لڑائے آپ کی اولاد  
 کو رہنی اولاد - آپ کی عزت ہو رہنی عزت  
 آپ کی تکلیف ہو رہنی تکلیف - یہ یہ یہ یہ یہ

تو بھینٹنے طلب امداد کی۔ پھر قابضہ المزام نے پہنچے  
 جو سینوں جہاں نے۔ میں کھانا پوری جماعت کو  
 اگر بسیار ہے۔ تو آپ کا وجود اور صوبی بیمار  
 صاحب کا وجود ہے۔ ان کی نگاہ میں بھی آپ

آپ دونوں پر میں آپ جماعت کے فضل میں

خدا تعالیٰ آپ کا حافظہ و سر پرست ہے۔ آپ کے وجود  
 سے خدا تعالیٰ نے دین کا کام لینا ہے۔ اللہ بیگناہ

کے رب سے۔ رب رحمتہ رحمہ کا وہ مہینے اس  
 بنا پر کھانا تھا۔ کہ گھر بھلو خرچہ حد سے بڑھا ہوا

ہے آمدن قاری کوئی تین ہے۔ جماعت کی

آمد و رفت حد سے بڑھ گئی ہے خرچہ ہر ماہ ۱۵۰۰

کھنچے ۱۲۰۰ کبھی ۱۳۰۰ آجاتا ہے باقی ضروریات بھی

تو سیرت میں دیکھ سکتے ہیں گناہوں سے بھرا ہوا

تباہی پر عرض کی تھی کہ رقم بند نہ رہے۔ آپ رب

سوال مائتوں کا اگر ان میں اس کو خدا تعالیٰ

کا بیانی عطا فرمائے۔ تو دین میں کچھ نہ رہے

دین میں گناہ دیں۔ اگر بالفرض کچھ بیانی کی ضرورت

نہ نہ آئے۔ تو پھر خود کسی اچھے کام میں لگا کر

کام کریں۔ ہندہ پابن آگئی۔ تو خرچہ ہو جائے گا

پھر صحت کی ہے۔ ان کا مرض نہیں پیر ہو گیا جو اپنی

سے اس کی توفیر ہے۔ اللہ جل جلالہ کا بوجھ سر

پر ہو گا۔ پھر حال آپ میں پہنچے۔ عین میں گناہیں

پاکشی اور معمول کردی و ابے کام میں گناہیں۔

وہ آپ کی مرضی پر ہو گیا۔ ہندہ کو گھر پر خاص









[illegible]

آپ دروں کے ہم مولانا اکرام الحق صاحب حافظہ  
 عہدہ اسزاق ہیں۔ یہ چار اشخاص شاخ کے مقرر کردہ  
 میں نہ صرف لادریک مقرر کردہ مولانا عبدالحق جوہر آباد  
 لادریک صاحب ہیں۔ بلکہ مشورہ شاخ کے۔ یہ دونوں آپ  
 لوگوں کے ہم پلہ یک ہو سکتے ہیں۔ جملہ شاخ میں شاخ کا مقرر  
 کردہ ہوں۔ آپ چاہیں مقرر کردہ شاخ میں۔ مقرر یہ  
 ہے آپ۔ بالواسطہ ہیں۔ بلا واسطہ ہیں۔ مقرر ہیں۔  
 چلانے میں شاخ نے آپ کو بھی میرا شریک بنا دیا ہے  
 کیا آپ نے میری اس تقریر کو سمجھا ہے۔ میں نے کوئی مقرر  
 یہ کی ہے اس میں ہیں۔ آپ خدا پرستوں کی۔ یہ مقرر  
 مقرر کے ذریعہ دار الفکر ہیں۔ اس ذریعہ کو ذرا اچھے  
 مقرر ہیں۔ دنیا کی چیزیں۔ دنیا کی چیزیں۔  
 چیزیں نہیں۔ دنیا کی چیزیں۔ دنیا کی چیزیں۔  
 کرام میں تین چیزیں۔ دنیا کی چیزیں۔ دنیا کی چیزیں۔  
 خاص مولانا حضرت محمد بن عباس وقت دنات  
 ۹۰ ارب سونا کی اشرافی کا مالک تھا۔ یہ بھی ٹیک  
 سے اولیاء اللہ سے حضرت عبداللہ اصرار بہت بڑے  
 رئیس تھے۔ مگر خلیفہ الافطاب بھی تھے۔ جن کی  
 مدح و ثناء مولانا جامی فرماتے ہیں۔  
 جوں فقر اندر قیاد شاہی آمد  
 ز تدبیر عبداللہ  
 اور فرماتے ہیں  
 اثر تیرد نفور چین است

نگہد فرمن آہ خوشم چین است  
 مگر دن کو خدا کی اور یاد خدا سے کبھی چین  
 غافل نہیں کیا تھا۔ حضرت سیما ن علیہ السلام

والسلام کی تین بیویاں تھیں۔ سنا کہ اب لاہور کی طرف روئے۔  
 زمین کی حکومت کے مالک تھے، جگر خدا سے کسی چیز  
 غافل نہیں کیا۔ آپ ایسا نہ ہو بلکہ دنیا کے نشے تین  
 آکر خدا سے غافل ہو جائیں ایسا نہ ہو بلکہ کوئلہ میں  
 تین (تین) رہے جسم کو تین بنایا، کبر غفلت میں  
 دل کو کوئلہ بنا دیں، قرآن کی امن آیت پر بھل کرنا۔  
 رَجَالٌ لَا تُلِيقُهُمْ بِجَارَةٍ وَلَا يَنْفَعُ كُنْزَ اللَّهِ  
 وَاقَاتِمِ الْعَقْلُ

لہذا شفر

کئی وقت است شونہ خواب بیدار

دل انداز باز بند و دست پر کار

آپ اپنی دیر داری کو سنہا لیتے ہوئے لیکن فی العلم  
 صبا بیا رہی اللہ ان روحانیا پر عمل کرتے ہوئے  
 جو کام تھے حیا لائق، شریف کر گئے، وہ ذکر الہی میں  
 داخل ہو گا، اللہ جو بھی بیویاں بچوں کو کھلا دے وہ  
 فطرت ہوئے ملیم السلام کی والدہ کے حکم میں برگ  
 منجواہ فرعون سے وصول ہوئی، رد و جد رہے، بچے کو  
 دیا، آپ پیر و رکن رہے بچوں کی تربیت کے ثواب  
 خدا سے ملے گا، آپ بزرگ فیالہن، بدعت الی  
 اللہ مخلوق و موصوفین، جس میں شکر ہے، بخشش میں  
 علم نہ ہوئے پائے، شریک کے بعد (شاء اللہ) ملاقات  
 ہوگی، نماز کے وقت پابندی کوشش، جماعت کی  
 نگرانی، ہوا میں ہلکا ہلکا، خیریت، حیرت میں  
 مشغول ہوئے، تو فیہ مدقق، جس میں شکر ہے، اپنی  
 دیر داری سے خبردار رہا، آپ کا وجود یہ فائدہ



تخلص نہیں ہوا۔ خراج تہائی جو اس نے جوڑا ہے وہاں سے کہیں نہیں  
 یاد ہے۔ دین کا لینا چاہتا ہے اس کو اور اس کے  
 آپ کی تیزی انوارات کی وجہ اصل میں - جب  
 آپ پر مقدم بنا تو میری عفو ہم تن توجہ جتا کے  
 صرف مبدل ہوگی اس وجہ سے تمام رتقاء سے بھی دما  
 کرتا تھا اور خود بھی بعد معمول و بعد ادائے مرض نماز  
 کے بعد معمول نے اور معمول کے وقت آپ کا گھر بھی  
 میرا تھا۔ رزق غائبی توجہ کا صورت بھی۔ یہی ہے کہ مرید  
 کا صورت شکل شیخ سافے رکھ کر اس میں پیر القاد کرے  
 اس طرح ضیاء القلوب میں حاجی امداد اللہ صاحب رکھی  
 نے بھی مٹایا ہے۔ اور میرا گھر کرنا تو جعفر صاحب  
 کی وجہ سے تھا کہ بوجہ آپ کی تکلیف کا دل پر  
 اثر تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اولاد کی تکلیف آخر والہ  
 کے قلوب پر اثر انداز ہوتی ہے اس توجہ دائمی نے آپ  
 کے قلب میں انوار لا تعداد جمع کر دیئے تھے۔ پھر  
 خبر نکات اشک زیارت نے آگ لگا دی تھی جس سے  
 کچھ چکاسوں کہ آپ لار مولانا بہان صاحب حصہ  
 بعد پر باقری عبد الرزاق لار مولانا اکرام الحق  
 صاحب مشائخ کی بالہ است روحانی اولاد ہیں آگے  
 گد بشیر صاحب سون گد وہ پیرا روحانی بیٹا ہے  
 یا مولوی عبد الحق صاحب بیٹوں  
 آپ کے بھائی کو مشائخ کے نزدیک وہ  
 بیٹا کا حکم رکھتے ہیں نہ بیٹا کا۔۔۔  
 ہر حال گزر وقت تھا پھر جواب خط بند  
 کو مل جائے تو جواب بخیر نہ کہ تمہاری سیر جائے۔  
 اللہ وار

# صوفی محکم فی تفسیر تفسیر

صد و شصت و شصت طبعی کیٹی، نورث سندھین

نور خدام

تایم

۷۱

عالم نمبر

۷۱

نہایت غریب ملک مشرق وسطیٰ : اس میں سکیم بندہ کو بہت بیکار ہیں خالصتاً معیہ حبیب دنیا کو کر  
 دے کے دیو سگور کا اور ہی کو اراک سے دل میں پریشان ہے سوار اور جو کما دے روز کے پھر دے و بنا  
 قسم اردن سکیم کو کون سکیم اور اس کے بعد عابہ ایک تو یہ خدا کا ایک کو بہا کر گیا دنیا کے عبادت خدا کے  
 پرکرت اور نہایت تو عبادت سے عبادت عبادت کے دشتی خود عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 اعدوں قسطنطین بر محل پرور عالم سے یہ کو کر اور : اور خدا کا عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 سلطان عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے  
 عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت عبادت کے دشتی سے بیکار عبادت کے

## تصوف و سلوک اسلامی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں انحطاط و زوال کے آثار نظر آرہے ہیں، خصوصاً ان کی زندگی کا دینی پہلو اس عمومی انحطاط سے زیادہ متاثر ہوا ہے، جس امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سونپی گئی، دنیا بھر کی رہنمائی اور امامت کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور خیر الامم کا عظیم الشان لقب عطا ہوا، وہی امت آج مادہ پرستی کا شکار ہو کر دنیا کی رہنمائی تو درکنار خود اپنی اصلاح سے بیگانہ محض ہے، اس امت میں شریعت مطہرہ کی حقیقی روح کا پایا جانا تو درکنار اس کے ظاہری احکام پر عمل بھی مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

تصوف و سلوک اسلامی، دین کی اصل اور روح ہے سارے سلسلہ ہائے تصوف کا مقصود اصلی اسی روح دین یعنی تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کا حصول تھا، مگر مرور زمانہ سے آج ان سلاسل کے متوسلین (الاما شاء اللہ) اپنے مقصد اور طریق کار سے اتنی دور جا چکے ہیں کہ ابتدائی پاکیزہ زندگی سے ان کی کوئی نسبت ہی نظر نہیں آتی۔ نتیجہ یہ کہ عوام و خواص یا تو سرے سے حقیقی تصوف کے منکر ہیں یا بیگانہ محض،



حالانکہ صحیح اسلامی تصوف نہ کوئی شجر ممنوعہ ہے اور نہ کوئی انوکھی اور ان سنی چیز۔ یہ تو اس دور کی پیداوار ہے 'جب حضور اکرم ﷺ غار حرا میں بیٹھ کر ذکر الہی میں مصروف رہا کرتے تھے' اس غار میں بیٹھ کر تصوف کا جو مقدس پودا لگایا وہ حضور ﷺ کی مقدس تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا ہوا ایک تناور درخت بن کر صبر، شکر، عزیمت، استقامت، اخلاص، لائیت، اطاعت الہی، اتباع نبوی ﷺ کی صورت میں برگ و بار لانے لگا۔ اور اس عظیم الشان درخت کی ٹھنڈی گھنٹی چھاؤں میں ہزاروں بلخہ لاکھوں انسانوں کو سکون میسر آیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے ایک علیحدہ اور مستقل حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ "احسان" کے نام سے دین کے ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر جس طرح علوم دین کے دیگر شعبے مثلاً حدیث، فقہ، کلام، اصول وغیرہ عہد رسالت کے بعد ہی مستقل اور علیحدہ فن کی صورت میں معرض وجود میں آئے۔ اسی طرح تصوف و سلوک کے مروجہ اعمال و اذکار اشغال کی تدوین بھی اس وقت ہوئی جب مخلص اور بلند مرتبہ بزرگان دین نے محسوس کیا کہ خیر القرون کے بعد مدے اور خدا کے درمیان جو بُعد اور دوری ہوتی جا رہی ہے اسے کم کرنا اور مدے کو خدا کے قریب لانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے چنانچہ ان اکابر دین نے قرآن و سنت کے روشن چراغ ہاتھ میں لے کر ان وسائل و ذرائع کا کھوج لگایا جو اس بعد کو قرب سے بدلنے میں اور مدوں کے لئے اپنے مالک کے احکام پر رغبت شوق اور اخلاص سے مکمل ہونے میں مدد ثابت ہو سکتے تھے۔

موجودہ دور میں اس کی ضرورت کا احساس شدید تر ہو گیا ہے کہ امت مسلمہ کے بکھے ہوئے راہی اپنی منزل سے بے خبر اور مقصد حیات سے یکسر نا آشنا ہو چکے ہیں اسلئے ان کی فکری اور عملی اصلاح کرنی چاہئے۔ آج ہمارے گرد و پیش۔ مفلالت، الحاد، بے دینی، بدعات، فواحش اور بے عملی کے گھناؤپ اندھیرے چھائے ہوئے ہیں،

قرآن و سنت سے ہمارا تعلق روز بہ روز ٹوٹتا چلا جا رہا ہے۔ قلوب و اذہان پر مادہ پرستی کا غلبہ ہے۔ محبت الہی اور محاسبہ اخروی کا احساس ناپید ہے اس پر طرہ یہ کہ متاع کارواں کے یوں کھو جانے کے باوجود ہمارے اندر احساس زیاں نام کو بھی نہیں پایا جاتا ہم اپنی اس دینی اور اخلاقی تہمتی دستی پر کفِ افسوس ملنے کی بجائے اٹنے خوش ہیں کہ ہم نے ترقی کا راز پالیا ہے۔ حالانکہ مسلمان کی ترقی کا راز صرف نبی آخر الزماں ﷺ کی لازوال شریعت کی اتباع میں مضمر ہے۔

ان حالات میں اس امر کی سخت ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو ان کا بھلا اجداد سبق پھر سے یاد کرایا جائے اور انہیں شریعت مطہرہ کے ظاہری اور باطنی سرمایہ کی طرف دعوت دی جائے اسی اہم مقصد کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس میں حضرت مصنف مدظلہ العالی نے طالبین حق کے لئے صحیح اسلامی تصوف پیش کیا ہے قرآن و سنت کی روشنی میں سلف صالحین کے ذریعہ تصوف و سلوک کی عملی صورت ہم تک پہنچائی ہے۔

ہمارے ہاں جمہور مسلمانوں میں تصوف و سلوک کے وجود اور اس کی ضرورت سے انکار تو بہت کم پایا جاتا ہے البتہ تصوف و سلوک کے ناقص اور جھوٹے دعویداروں کے عقائد اعمال، اخلاق اور معاملات نے لوگوں میں نفس تصوف و سلوک کے متعلق بدگمانی پیدا کر دی ہے۔ آج بھی آپ کو کثرت سے ایسے افراد ملیں گے جو سلوک کی طلب و جستجو میں مدت سے سرگرداں ہیں اور عرصہ سے کسی نہ کسی ”شریف“ سے منسلک ہیں مگر انہیں کوئی ایسا مردِ راہِ داں نہیں ملا جو انہیں سلوک کی ابتدائی منازل طے کرانا تو درکنار صرف اتنا ہی بتا دے کہ تصوف و سلوک کیا ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت کیا ہے اور اسکے حصول کا طریقہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ عوام تو کیا خواص نے بھی یہ سمجھ رکھا ہے کہ تصوف و سلوک اگلے وقتوں کی چیز

ہے۔ موجودہ دور کے مسلمان اس قابل نہیں کہ اولیاء اللہ کی ہتائی ہوئی تدابیر کو نمایاں اختیار کر کے منازل سلوک طے کر سکیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی ولی اللہ نے وفات کے وقت سلوک کے دروازے مقفل کر کے یہ وصیت کی تھی کہ خیر وار آنے والی نسلیں اس کے قریب نہ جائیں۔ یا کسی نے یہ وصیت کی تھی کہ آنے والی نسلوں کا کام صرف اتنا ہے کہ حسن بصری، جنید بغدادی، شیخ شہاب الدین سرور دہلی، خواجہ نقشبند، شیخ عبدالقادر جیلانی، معین الدین چشتی، مجدد سرہندی اور دیگر اولیائے کرام کا نام لے لیا کریں مگر ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی جسارت نہ کریں ظاہر ہے کہ سچ نے کسی ایسے وصیت نامے کی نشاندہی نہیں کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ نفس اور اصلاح قلب کی ضرورت پہلے زمانہ کے لوگوں کی نسبت ہمیں بہت زیادہ ہے بلکہ اسکی ضرورت کا اعلان تو ابہ آباد تک کے لئے ان الفاظ میں ہو چکا ہے کہ

قد افلح من زکیہا اور یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من

اتى الله بقلب سلیم۔

یہ ابدی اور عالمگیر حقائق ہیں اور معتقدین صوفیہ اور متاخرین علمائے حق نے اسی تزکیہ کے ذریعہ ظاہری شریعت کی پابندی کرنے اور فلاح اخروی حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ شریعت حقہ کی پابندی کے بغیر نجات ممکن نہیں مگر جس طرح جسمانی بیماری کی صورت میں انسان کوئی جسمانی نوعیت کا کام صحیح طور نہیں کر سکتا اسی طرح قلبی بیماری کی صورت میں شریعت کے احکام پر بھی کما حقہ عمل نہیں ہو سکتا۔ جسم انسانی میں قلب کی مرکزی حیثیت اور اسکے عملی کردار سے ہر ذی علم واقف ہے۔ اگر یہ سلطان بدن ہوا ہو س کا شکار ہو جائے تو سارا جسم اور تمام جسمانی صلاحیتیں گناہ اور فسادت، شرک اور بدعت، فحاشی اور بے حیائی کے لئے وقف ہو کر



بڑی عقیدت سے اور نیک نام سے یاد کرتے ہیں۔ ذکر و اشغال کی یہی تدابیر اختیار کر کے منازل سلوک طے کئے تو آج ہمارے لئے اس راہ پر چلنا کیوں ممنوع قرار پایا؟ وہ راہ ہمارے لئے مسدود کیوں ہو گئی؟

کیا ان بزرگوں کی اس موضوع پر لکھی ہوئی سینکڑوں تصانیف محض ورق گردانی اور قصہ گوئی کے لئے ہیں؟ کیا ان کے بیش قیمت ارشادات عملی جامہ پہنانے کے لئے نہیں ہیں؟

جب محبت الہی اور اتباع سنت کی ضرورت آج بھی ایسی ہی ہے جیسے پہلے تھی تو پھر اس کے حصول کے حقیقی راستہ پر گامزن ہونے میں تردد اور تامل کیوں؟ ضرورت ایسے مرد حق نگاہ کی ہے جو تصوف و سلوک کی حقیقت سے آشنا کر کے اولیاء اللہ کی راہ پر چلائے اور جس کی رہنمائی میں ہم عملاً ان مقامات سلوک تک پہنچ سکیں جو عشق سے بھی بلند تر اور حسن سے بھی لطیف تر ہیں۔

حافظ محمد شریف



## تعلیمات شیخ

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ فلاح کا دار و مدار تزکیہ پر ہے۔ قد افلح من تزکی۔ (وہ فلاح پا گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا)۔ تصوف و سلوک کے چاروں مشہور مروج سلسلہ دراصل تریقہ گاہیں ہیں جہاں تزکیہ باطن کے اصول بتائے جاتے ہیں اور عملی طور پر اس کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ تصوف کے تین سلسلوں میں اسکی ترتیب یہ ہے کہ ہر نئے سالک کو پہلے ذکر لسانی کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے، آخر میں ذکر خفی، قلبی کر لیا جاتا ہے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں اول و آخر ذکر قلبی ہی کر لیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے :

اول ما آخر ہر غنمی

یعنی ہماری ابتدا وہ ہے جو دوسروں کی اختتام ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں اتباع سنت کا اہتمام سختی سے کیا جاتا ہے۔ جس کی بدولت سالک کو جلد ہی اور زیادہ ترقی ہوتی ہے پھر نقشبندیہ کے دو طریقے ہیں۔۔۔۔۔ نقشبندیہ مجددیہ اور نقشبندیہ اویسیہ۔۔۔۔۔ ہمارا طریقہ نقشبندیہ اویسیہ ہے جس میں اللہ کریم مہربانی فرمادے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر روحانی دولت کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

## شجرہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

- ۱ الہی بحر مت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ
  - ۲ الہی بحر مت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
  - ۳ الہی بحر مت حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ
  - ۴ الہی بحر مت حضرت داؤد ظانی رحمۃ اللہ علیہ
  - ۵ الہی بحر مت حضرت جہید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
  - ۶ الہی بحر مت حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ
  - ۷ الہی بحر مت حضرت مولانا عبد الرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ
  - ۸ الہی بحر مت حضرت ابو ایوب محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ
  - ۹ الہی بحر مت حضرت سلطان العارفین خواجہ اللہ دین مدنی رحمۃ اللہ علیہ
  - ۱۰ الہی بحر مت حضرت مولانا عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ
  - ۱۱ الہی بحر مت قلام فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ
  - ۱۲ الہی بحر مت ختم خواجگان خاتمہ من و خاتمہ حضرت مولانا محمد اکرم
- خفیہ گردان (اس شجرہ کو زبانی یاد کر لیں اور روزانہ مجلس ذکر کے بعد دعا میں اسے شامل کر لیا کریں۔)

آپ کو اس سلسلہ عالیہ  
میں داخل ہونا مبارک ہو  
اس بات کو نہ بھولنے کہ  
آپ کا مقصد صرف تزکیہ باطن ہے  
جس کا

واحد ذریعہ ذکر الہی کی  
مداومت ہے



## ذکر الہی کی ضرورت و اہمیت

انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ روح اور جسم مل کر انسان کہلاتا ہے دونوں کی تخلیق جداگانہ ہے۔ جسم مادی ہے اس کی اصل منی ہے روح عالم امر سے ہے اور پر تو صفات باری ہے اب حیات انسانی کا نظام ایسا ہے کہ اسے مسلسل غذا یا انرجی کی ضرورت درپیش ہے اس میں اُتر بگڑ آجائے تو یہ بیمار پڑ جاتا ہے اگر غذا مکمل روک دی جائے تو اسکی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس طرح غذا جسم کی ایک اہم ضرورت ہے اسی طرح یہ روح کی ضرورت بھی ہے مگر، دونوں کی غذا جداگانہ ہے۔ دونوں کی غذا بھی جداگانہ ہے جسم کی غذا بھی مادی ہے جس کا جزو اعظم منی ہے اور روح کی غذا تجلیات باری ہیں جو اسے عالم امر اور بالائے عالم امر سے نصیب ہوتی ہے۔ غذائے مادی کی تعمیر میں جو مقام سورج کو حاصل ہے کہ بتائے عالم کا سبب ہے تمام عناصر کو اسکی گرمی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ یہی مقام روحانی طور پر آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا ہے جس کی طرف قرآن حکیم سراجا منیرا

فرما کر نشانہ ہی کرتا ہے۔ مادی غذا کا جزو اعظم تو منی ہے مگر پانی نبو اکرمیؑ سرمدی وغیرہ مل کر منی سے مختلف چیزیں صورت پذیر ہوتی ہیں۔ بوہن کی غذا کا بھی اور دوا کا بھی کام کرتی ہیں ایسا ہی نظام روحانی بھی ہے اصل برکات حضور اکرم ﷺ کی ہیں مگر اولوالعزم رسول ان انوارات کو روح تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں جو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرتے ہیں۔ ان انوارات کے بغیر مثبت تبدیلی ہونا محال ہے ورنہ زبانی بھی اور تحریری بھی تبلیغ میں تو کوئی کسر باقی نہیں مگر یاد رہے کہ ان انوارات و کیفیات جنہیں برکات نبوت کہہ لیجئے ان سے دل بدل جاتا ہے اور عملی زندگی میں انسان گناہ سے نیکی کی طرف سفر شروع کر دیتا ہے جو اسکو مکمل نیکی تک پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ یہی اس نئی پہچان بھی ہے کہ اگر اصل کیفیات نہ ہوں گی محض دعویٰ ہو گا تو وہ عملی زندگی کو مثبت کی بجائے مزید منفی اور ناروا رویہ دے گا۔

## لطائف کیا ہیں؟

جس طرح جسم میں معدہ، جگر، دل و دماغ یعنی اعضاء و ریسہ ہیں جو غذا کو تحلیل کر کے جزو بدن بناتے ہیں، اسی طرح انسانی روح میں جو اعضاء و ریسہ ہیں انہیں اصطلاحاً لطائف کہا جاتا ہے جو لطیفہ کی جمع ہے اور اپنی اس لطافت کی وجہ سے جو اسے حاصل ہے، لطیفہ کہا جاتا ہے۔ محققین صوفیاء نے جسم انسانی میں اس کی نشاندہی کی ہے جس میں مختلف سلاسل تصوف میں اختلاف بھی ہے مگر سلسلہ مالکیہ نقشبندیہ اویسیہ میں ان کی تعین مندرجہ ذیل ہے:

اول قلب: یہ دل کا مقام ہے جس کی دھڑکن سے ہم سب واقف ہیں

دوم روح: اس کے مقابل دائیں طرف

سوم سری: یہ قلب کے اوپر ہے

چہارم خفی: دوم کے اوپر اس کے مقابلے میں

پنجم اخفا: ان کے درمیان ہے

عشتم نفس : پیشانی جو سجدہ کے وقت زمین پر لگتی ہے

ہفتم سلطان الاذکار : جو سارے بدن کو شامل ہے کہ برہنہ موت اللہ کا

ذکر جاری ہو جائے۔

اولو المعزم رسول پانچ ہیں : حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہم السلام۔ ان کی ذوات عالیہ کا تعلق الطائف سے اس طرح ہے کہ لطیفہ اول پر برکات و انوارات حضرت آدمؑ علیہ السلام سے آتے ہیں یہ پہلے آسمان سے آتے ہیں اور اگر مشاہدہ نصیب ہو تو ان کا رنگ زرد نظر آتا ہے آسمان اول بھی نظر آسکتا ہے اور آدمؑ علیہ السلام کی زیارت ہو نا بھی محال نہیں۔ دوسرے لطیفہ کا تعلق حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ علیہما السلام سے ہے اس کے انوارات دوسرے آسمان سے آتے ہیں اور ان کی رنگت سنہری مائل سرخ ہوتی ہے تیسرے لطیفہ پر جو انوارات آتے ہیں ان کا تعلق حضرت موسیٰؑ علیہ السلام سے ہے اور ان کا رنگ صاف شفاف سفید ہوتا ہے یہ تیسرے آسمان سے آتے ہیں چوتھے لطیفہ پر حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے انوارات چوتھے آسمان سے آتے ہیں رنگ گہرا بنیاد ہوتا ہے۔ پانچویں لطیفہ کا تعلق آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے۔ اس کے انوارات کا رنگ سبز ہوتا ہے پانچویں آسمان سے آتے ہیں اور پانچوں طائفوں پر چھا جاتے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں لطیفہ پر تجلیات باری ہوتی ہیں جن کی رنگت یا کیفیت و کیفیت کچھ بھی متعین نہیں کی جاسکتی۔ بس جیسے بجلی چمک جاتی ہے اور کچھ سمجھ نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ آنکھیں چند حیا جاتی ہیں کچھ اسی طرح کا حال ہے۔ اللہ کریم اگر چشم ابھرت عطا کر دیں تو یہ سب کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ مومنا شروع شروع میں تعین ذرا مشکل ہوتی ہے رنگ گندہ نظر آتے ہیں مگر رفتہ رفتہ قوت مشاہدہ میں چلتی آتی جائے تو ہر چیز صاف ہوتی جاتی ہے۔

ذکر قلبی کا طریقہ -

اس طریقے کا اصطلاحی نام پاس انفاس ہے یعنی اپنے سانسوں کی گہرائی کرنا۔ بعض نادانوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ سانس سے ذکر کیا ممکن ہو یہ نہیں جانتے کہ ذکر دل سے کیا جاتا ہے سانس صرف ایک خاص ترکیب سے لی جاتی ہے اور اس۔ اگر اس طرح اور ارادی طور پر قوت سے سانس نہ لی جائے تو جو کام ایک دن کا ہے اس پر دو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ سو قبلہ رو فیضیہ کر اور متوجہ الی اللہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ منہ بند ہو۔ تعوذ تسمیہ کے بعد سانس لینا شروع کریں اور خیال کریں کہ جب سانس اندر کھینچی جاتی ہے تو لفظ اللہ دل کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ جب سانس پھوڑتے ہیں تو لفظ "ہ" خارج ہوتا ہے اور "ہ" کی چوٹ دل پر یا اس لطیفہ پر لگے جس پر آپ ذکر کر رہے ہیں سو اس طرح اپنا وقت، کیجے کہ ہر لطیفہ پر من سب دیر تک ذکر کیا جائے اور کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سانس نہ ٹوٹے اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے چنانچہ ساتوں احائف پر ذکر کرنے کے بعد پھر سے ساری توجہ پہلے لطیفہ پر آتے ہیں جو قلب ہے اور تھوڑی دیر ذکر کر کے مگر سانس لینا بند کر دے بہن کا خیال یکسر چھوڑ دے اور سانسوں کو طبعی طور پر چلنے دے ساتھ دل پر گہرائی کرے یہ کہ اللہ کا لفظ دل سے نکلے اور "ہ" کی فکر غرض تعلیم سے جا کر نکلے۔ یہ پہلا سبق ہے اس رابطہ کہتے ہیں یہ جب مضبوط ہو جائے تو اس کے مراقبات یا مقامات کرائے جاسکتے ہیں۔

ضرورت شیخ

یاد رہے کہ معاملہ از خود نہیں ہو پاتا اس لئے شیخ کی توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ یہ جملہ کیفیات انکاسی طور پر آگے تقسیم ہوتی ہیں جس طرح آپ صلی اللہ

ملیہ و مسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونے والا مومن ہی شرف صحابیت سے سرفراز ہوا۔ صحابہؓ کی صحبت میں حاضری دینے والا تابعی، بنا اور ان کی خدمت میں تبع تابعین نے ان سے مشائخ عظام نے یہ دولت حاصل کی اور نسا بعد نسا، سیدہ سیدہ منتقل ہوتی رہی اور انشاء اللہ ہوتی رہے گی۔ یاد رہے کہ ہر مومن اسے حاصل کر سکتا ہے۔ مرد ہو یا عورت عالم ہو یا ان پڑھ، امیر ہو یا غریب۔ بس اس کے لئے صرف ایمان شرط ہے اور صحبت شیخ خلوص کے ساتھ۔ کبھی شیخ کے ساتھ خلوص قلبی میں فرق آجائے تو یہ دولت ہیک آن چھن جاتی ہے۔



## وصیت !!

### حضرت المکرم اللہ یار خانؒ

حیات و ستور !!

حضرت المکرم حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی وصیت مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۸۲ء و ستور العمل سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ کے لئے بنیادی و ستاویز ہے۔ وصیت مذکورہ میں حضرت المکرم نے جو اصول طے فرمادیئے ہیں۔ انہیں بطور حتمی و دائمی کلیات دستور ہذا حضرت المکرمؒ کے اپنے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے

الف : مقصد

”حافظہ ذکر سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کا انتظام دائمی طور پر چلانے کے لئے حکم اللہ اور اتباع سنت رسول اللہ ﷺ میں نے اپنی زندگی کے بعد ہدایات بطور وصیت نامہ چھوڑنا اسلئے ضروری سمجھا ہے کہ سلسلہ نظم و ضبط کے ساتھ ہمیشہ ذکر الہی جاری

رکھے۔ میں اللہ تعالیٰ سے جہاں دعا کرتا ہوں وہاں متوقع ہوں کہ میری زندگی کے بعد یہ سلسلہ پھیلے پھولے گا اور صدیوں پر محیط ہو گا۔ سنت محمدی ﷺ کی عمل اتباع کرتے ہوئے صحیح العقیدہ مسلمان صوفی۔ مبلغ زندگی سے ہر شعبے میں صابہ و شائرا اور طالب اسلام سے کام کرنے والے افراد پیدا کرے گا اور اس لئے اعلیٰ مرکزیت کا قائم کرنا ضروری سمجھا گیا۔

ب۔ مرکز

”میں نے موجودہ اور آئندہ حالات کے پیش نظر اپنی عقل و بصیرت اور تائیدِ نبوی کی روشنی میں منارہ نسلِ جہلم کے مضافات میں جگہ حاصل کر کے ”دارالعرفان“ کے نام سے مرکز سلسلہ کی تعمیر کا منصوبہ اپنے متوسلین کو پیش کیا۔“

۲۔ ”دارالعرفان منارہ کی حیثیت مرکزی ہوئی اور اس کے ذیلی مراکز تعمیر کئے جائیں اور انشاء اللہ ہوتے رہیں گے جو مرکز کے تابع ہوں گے۔“

۳۔ ”دارالعرفان چونکہ میرے متوسلین کی ذاتی کوشش اور قربانی سے تعمیر ہوا ہے اور اس کے ذیلی مراکز بھی اسی طرح متوسلین کی کوشش کا نتیجہ ہوں گے۔ اس لئے میرے عزیز و اقارب یا ورثاء یا میرے کسی روحانی جانشین کے ورثاء دارالعرفان یا دارالعرفان سے منسلک کسی ادارہ کی جانیوار کے وارث نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کا کوئی واسطہ یا استحقاق ہو گا اور یہ



خالص سلسلہ کے زیر انتظام اور ملکیت ادارہ نقشبندیہ اویسیہ ہو  
گی۔“

ن جانشین

۱- ”چونکہ یہ سلسلہ حسب و نسب سے بالا قدر اور مروجہ چیری  
مریدی سے ہٹ کر دنیوی مفادات اور مصلحتوں سے مختلف ہے  
اس لئے سلسلے میں میرا جانشین صرف وہی شخص ہو گا جس کی  
روحانی اہلیت سب سے زیادہ ہو گی۔ میں اپنی زندگی میں ملک  
محمد اکرم صاحب کو اپنا روحانی جانشین مقرر کرتا ہوں کیونکہ  
اس وقت سلسلہ میں میرے بعد سب سے زیادہ روحانی اہلیت  
وہی رکھتے ہیں جنہوں نے اپنے غلوں اور جا ثاری سے اب تک  
سلسلہ کے تقاضوں اور میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے  
آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا۔ اور ہر جانشین اسی اصول پر تازہ  
کیا جائے گا۔“

۲- ”ہر جانشین اپنی زندگی میں اپنا ایسا جانشین تازہ کرے گا  
جس کی روحانی اہلیت سب سے زیادہ ہو گی۔ جانشین کا تقرر  
مجلس منتظرہ کی منظوری کے تابع ہو گا۔ اگر کوئی جانشین اپنا  
جانشین مقرر یا تازہ کیے بغیر فوت ہو جائے یا خود جانشین  
طرف کیا جائے تو اس صورت میں مجلس منتظرہ میرا جانشین  
تازہ کرنے کی مجاز ہو گی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔“

۳- ”میرے بعد سلسلہ میں ہر جانشین کے لئے مندرجہ ذیل  
ہدایات پر عمل پیرا بننا لازمی ہو گا جن سے انحراف جانشینی سے

محرومی کا باعث متصور ہو گا۔

(۱) شریعت مطہرہ پر استقامت یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی۔

(ب) سنت خیر الانام ﷺ کا کامل اتباع۔

(ج) بدعات سے مکمل اجتناب۔

(د) دوام ذکر و شغل مع اللہ سبحانہ۔

(ر) اعراض عن الخلق اور رجاء من اللہ صبر توکل اور قناعت کے ساتھ۔

(س) کثرت ذکر کے ساتھ مراقبات سلسلہ۔

(ط) سلسلہ کے اذکار و مراقبات کی حفاظت بطور امانت

کرنا۔ اپنی طرف سے کمی یا بیشی نہ کرے۔

(ع) ہر جائنشین کو مجلس منتظمہ کو با اختیار تسلیم کرنا ہو گا۔

# شیخ المکرم حضرت مولانا اللہ ديار خان

## فہرست تصانیف

- 1- تعارف اردو
- 2- تعارف انگریزی
- 3- دلائل السلوک اردو
- 4- دلائل السلوک انگریزی
- 5- حیات النبی ﷺ
- 6- حیات مرزخیہ اردو
- 7- حیات مرزخیہ انگلش
- 8- ابرار الحرمین
- 9- مکتوبات
- 10- علم و عرفان اردو
- 11- علم و عرفان انگلش
- 12- عقائد و کمالات علمائے دیوبند
- 13- سیف اویسیہ
- 14- تفسیر آیات اربعہ
- 15- الدین الخالص
- 16- ایمان بالقرآن

- 17- تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین
- 18- تحقیق حلال یا حرام
- 19- حرمت ماتم
- 20- ایجاد مذہب شیعہ
- 21- شکست اعدائے حسینؑ
- 22- داماد علی صلی اللہ علیہ وسلم
- 23- ہمت رسول اللہ علیہ وسلم
- 24- الجہال والکمال
- 25- نفاذ شریعت اور فقہ جعفریہ
- 26- فقہ جعفریہ کی تاریخی سرگزشت
- 27- فقہ جعفریہ کی تاریخ
- 28- عقیدہ امامت اور اس کی حقیقت
- 29- شیعہ مذہب کے بنیادی اصول

## دار العرفان منارہ

کر نل (ر) مطلوب حسین

1958ء میں جب حضرت مولانا محمد اکرام اعوان کو سلسلہ عالیہ میں داخل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو آپ کے شیخ قلم فیوضات و برکات حضرت العلام مولانا اللہ یار خان کا وادی و نمار میں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ عالیہ کی تجدید کا ابتدائی دور تھا اور کثرت کے چند احباب ان محافل ذکر میں شامل ہوتے تھے جو موجودہ دار العرفان کے شمال میں کوئی 6/7 میل کے فاصلہ پر واقع پہاڑ کے دامن میں ایک ڈھوک میں منعقد ہوا کرتی تھیں جہاں ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب بھی موسم گرما میں حضرت شیخ تشریف لاتے تو اس دور افتادہ علاقہ میں یہ ڈھوک مرکز نزول تجلیات باری تعالیٰ بن جاتی۔

1960ء کی دہائی کے آخری حصہ میں جب احباب کی تعداد قدرے بڑھ گئی اور دوسرے بلاد میں بھی سلسلہ عالیہ کی خوشبو پہنچی تو یہ حاضری اس ڈھوک سے منتقل ہو کر منارہ گاؤں کے ایک سکول میں آگئی۔ جو مولانا اکرم کے گھر کے قریب تھا اور

جن کے ذمہ ان خدائی مہمانوں کی میزبانی تھی۔ جب سالانہ تعطیلات کے لئے سکول بند ہو جاتا تو احباب ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک ماہ کے لئے منارہ کارخ کرتے۔ اس دہائی کے اوائل میں ہی حضرت شیخ کی شرہ آفاق تصنیف ”دلائل السلوک“ منظر نام پر آکر سلسلہ عالیہ کے اعارف کا ایک بڑا ذریعہ بنی اور جس نے بعض علمائے کرام کو ادھر متوجہ کیا۔

اس سکول میں میری پہلی حاضری 1974ء جولائی سالانہ اجتماع میں ہوئی جب میں ہندوستان سے جتنی قیدیوں کی رہائی کے بعد وطن واپس لوٹا۔ یہ وہ دور تھا جب منارہ گاؤں میں نہ چلی تھی اور نہ پانی۔ 17 میل دور کھار سے پانی ڈر موں میں بھر کر ٹرک کے ذریعہ لایا جاتا تھا جو زیر شدید مجاہدہ سالکین کے پیٹے اور وضو کے لئے افلاس کی حد تک ناکافی تھا۔ حتیٰ کہ 1978ء کے سالانہ اجتماع میں شیخ المکرم نے مستقل دارالعرفان تعمیر کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ جس کے لئے آپ نے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب نے اس مقصد کے لئے 11 کنال اراضی موجودہ دارالعرفان کی جگہ پر اپنے شیخ المکرم کی خدمت میں پیش کی جو آپ نے اپنی قیمتی زرعی زمین کے عوض حاصل کی۔ اس مقام پر ملحق 5 کنال اراضی میں حضرت مولانا صاحب کے کول مائیز کے دفاتر پہلے سے موجود تھے۔

چنانچہ دارالعرفان کی مجوزہ عمارت کی پلاننگ احباب سلسلہ نے کی۔ 30 جولائی 1978ء موجودہ باغچے لگایا گیا جو جامن۔ انار۔ امرود اور خوبانی کے درختوں پر مشتمل ہے۔ اسی رات قطبی ستارے کی مدد سے ہم نے قبلہ کا تعین کیا تاکہ دوسرے دن عصر کی نماز شیخ المکرم یہاں پڑھا کر باضابطہ افتتاح فرما دیں۔ صبح جناب قاضی صاحب لیٹن والے جو 12-31-97 کو 130 برس کی عمر میں فوت ہوئے اور جنہیں شیخ المکرم کے پہلے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے عبادت

قرآن کریم فرماتے ہوئے اچانک گویا ہوئے ”اوہ چو۔ جو تم نے رات قبلہ کی تعمین کی ہے وہ درست نہیں اور چونکہ یہ تمہارا امر کز امام ممدی کی آمد کے وقت موجود ہو گا اس لئے احتیاط کریں۔“ آپ ایک صاحب کشف بزرگ تھے۔

حسب پروگرام عصر کے وقت جب شیخ المکرم افتتاح کے لئے تشریف لائے جہاں کھلے میدان میں چھوٹے چھوٹے پتھر ترتیب دے کر عمارت کی نشاندہی کی گئی تھی اور مسجد کے محراب کی جگہ مصلیٰ اور پیچھے نہیں بٹھائی گئی تھیں۔ شیخ المکرم نے گاڑی سے اترتے ہی قاضی صاحب کو آگے آنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ وہ اب بیت اللہ شریف پر خیال کر کے ہائیں کہ تعمین شدہ قبلہ کی لائن کہاں سے گزر رہی ہے۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ حضرت یہ حطیم کے اوپر سے گزر رہی ہے اس پر حضرت مولانا اللہ یار خانؒ نے استفسار فرمایا کہ کیا حطیم بیت اللہ شریف کا حصہ نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے جواباً عرض کیا کہ ہاں حضرت مجھے غلطی لگی ہے۔ قبلہ کا تعمین درست ہے۔

اس کے بعد دارالعرفان کی تعمیر شروع ہوئی جو درج ذیل نمایاں خصوصیات کی حامل ہے :-

(۱) تعمیر کے جملہ اخراجات احباب سلسلہ عالیہ کے ذاتی عطیات سے ہوئے۔

(۲) معمار اور مزدور بھی سلسلہ عالیہ کے افراد تھے جس طرح مسجد نبویؐ صحابہؓ نے اپنے ہاتھوں تعمیر فرمائی تھی۔ دوران تعمیر چشم فلک نے میگزین ریکنگ کے انفران کو گارہ مٹی اٹھاتے دیکھا ہے۔

1986ء میں جب مقامہ نظام تعلیم کے لئے دارالعرفان کی چار دیواری کے اندر مقامہ اکیڈمی کے نام سے پابلیٹ پراجیکٹ شروع ہوا تو امیر محمد اکرم اعوان صاحب۔ (جواب شیخ سلسلہ اور حضرتؒ کے جانشین تھے) کے کول مائنز کے دفاتر

مرکز کے پار منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لہذا وہ جملہ دفاتر مگر اگر ان کا ملبہ صقارہ کے ڈائننگ ہال میں استعمال ہوا۔ اور 5 کنال مزید اراضی دارالعرفان میں شامل ہو گئی۔ 87-01-19 جب صدر پاکستان محمد ضیاء الحق شہید صقارہ اکیڈمی کے افتتاح کے لئے بذریعہ ہیلی کاپٹر تشریف لائے تو مذکورہ ڈائننگ ہال کی دیواریں اٹھ رہی تھیں اور چار دیواری کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔

دارالعرفان کی تعمیر کا عمل جاری و ساری ہے جیسا کہ مسجد کے مینار کی تازہ ترین تعمیر سے ظاہر ہے۔ اس مرکز کو چلانے کے لئے احباب حسب توفیق اعانت فرماتے ہیں لیکن وہ رقم کافی نہیں ہوتی۔ باقی حضرت امیر محمد اکرم اعوان دامت برکاتہم اپنے ذاتی وسائل سے اخراجات پورے کرتے رہتے ہیں۔

دارالعرفان منارہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ کا عالمی روحانی مرکز ہے جہاں تعلیم و تربیت کا سلسلہ پورا سال مستقل طور پر جاری و ساری رہتا ہے۔ تقریباً پانچ ہفتے ہر سالانہ اجتماع پر پوری دنیا سے ممبران تشریف لاتے ہیں حضور ﷺ کے دست اقدس پر روحانی بیعت اس مرکز میں ہوتی ہے نیز رمضان المبارک میں آخری عشرہ کے اعتکاف کی رونقیں دیکھنے لائق ہوتی ہیں۔ جس میں محققین کی تعداد ایک ہزار تک چلی جاتی ہے۔ ان دو عظیم سالانہ اجتماعات کے دوران لنگر کے اخراجات کے لئے کسی سے کوئی چندہ نہیں مانگا جاتا۔ گندم حضرت کی زمینوں سے آجاتی ہے اور باقی اخراجات وہ خاموشی اور خوش اسلوبی سے پورا کرتا رہتا ہے جس کے نام پر لنگر چلتا ہے۔

اللہ کریم سلسلہ عالیہ کے اس روحانی مرکز کو تاقیامت قائم و دائم رکھے اور اس سے فیوضات و برکات نبوی کے جو چشمے جاری ہیں ان سے چار دانگ عالم جملہ مسلمان خواتین و حضرات کو سیراب فرمائے۔ آمین



## تنظیم الاخوان کی روحانی درسگاہ دارالعرفان میں رمضان المبارک کے اعتکاف کے شب وروز

تنظیم الاخوان کے کارکن اپنی روحانی تربیت کی غرض سے ہر سال رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کی غرض سے روحانی درسگاہ دارالعرفان منارہ ضلع چکوال میں اکٹھے ہوتے ہیں جہاں امیر تنظیم مولانا محمد اکرم اعوان کارکنان کی روحانی تربیت کرتے ہیں۔ دارالعرفان کے شب وروز میں شامل ہو کر عاشقان رسول ﷺ یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم کے دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، کس طرح ایک مدد خدا رسول اللہ کا خادم اس مادی دور میں علم و عرفان کی مجلس قائم کئے ہوئے ہزاروں انسانوں کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور ہر آنے والے دل کو اللہ تعالیٰ سے آشنا کروادیتا ہے اس دور کی عظیم کرامات سے ہے ایسا لگتا ہے کہ ربوبیت الہی نے ایک نئی کروٹ لی ہے جب ہر انسان مادہ پرستی اور فغا نفسی کے عالم میں گم ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے جب ہر طرح کی وعظ و نصیحت کسی بھی معاشرے پر بے اثر ہے اور خود اسلامی معاشرہ اپنے اسلاف کی روایات کا مذاق اڑا رہا ہے سکون نامی کوئی شے

کسی بستی شہر ملک میں نہیں ہے مسلمان یقین محکم سے خالی ہو کر وہاںات پر زندگی بسر کر رہا ہے مسلم خلیفہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کے بجائے کفار کی تقلید کر رہا ہے دور جمالت کی تقلید کر رہا ہے پھر سے دور جمالت کی روایات عروج پر ہیں۔ انسانی اخلاق پستی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے برائی مساجد کے ترہ خانوں تک پہنچ گئی ہے تو اس دور میں انسانیت کو اللہ تعالیٰ سے آشنا کروانا اس میں رحمت باری تعالیٰ کی مرضی شامل ہے۔ پوری دنیا کے کونے کونے سے آنے والے مسلمان مرد مجاہد کی مجلس میں بیٹھ کر اپنے دلوں کے شیشے صاف کر رہے ہیں، کسی طبقاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر عدلیہ کے اعلیٰ جسٹس صاحبان سے لے کر عام جج اور وکیل صاحبان سے لے کر کچہری کے کلرک تک۔ پولیس کے سپاہی سے لے کر اعلیٰ عہدیداروں 'فوج کے تینوں' شعبوں کے سپاہی رینک سے اعلیٰ آفیسر تک تعلیم کے پرائمری سکول بچہ سے لے کر سیکرٹری تعلیم تک غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے والے عسکران 'علماء' صنعتکار 'کاشتکار مزدور' سیاستدان لوگ ترکیہ نفس کی غرض سے دارالعرفان پہنچتے ہیں، جولائی اگست میں ہر سال سالانہ اجتماع چالیس دن کا مقرر ہوتا ہے ہر دونی ممالک سے بھی ہزاروں افراد شامل ہوتے ہیں، مگر رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی رونق ہر مجالس پر نمایاں رہتی ہیں۔ ترکیہ نفس کے متلاشی خود کو ایک قائم نمیل کے تحت پابند کر لیتے ہیں جس میں ذکر الہی نماز باجماعت تعلیم بالغاں کے پروگرام کی طرح چوبیس گھنٹے کا قائم تیل تیار ہوتا ہے نماز تہجد کے لئے رات تین بجے کے قریب بیداری ہوتی ہے سحری کھانے کے بعد اجتماعی ذکر الہی کی مجلس منعقد ہوتی ہے۔ جو نماز فجر تک جاری رہتی ہے۔ نماز فجر سے اشراق تک قرآن خوانی درس حدیث اور اشراق کے نوافل ادا کرنے کے بعد ایک گھنٹہ آرام ہوتا ہے پھر آٹھ بجے دن کے قریب اجتماعی ذکر ہوتا ہے جو ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے پھر روحانی طور پر

حدیث اور اشراق کے نوافل ادا کرنے کے بعد ایک گھنٹہ آرام ہوتا ہے پھر آٹھ بجے دن کے قریب اجتماعی ذکر ہوتا ہے جو ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے پھر روحانی طور پر کلاس کا گروپ وار پروگرام شروع کرتے ہیں جو دس بجے تک انفرادی گروپ وار ذکر الہی ہوتا ہے دس سے گیارہ بجے تک دین متین کے اہمائی مسائل سیکھنے کا پروگرام رہتا ہے۔ گیارہ بجے سے نماز ظہر تک آرام ہوتا ہے نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد امیر تنظیم الاخوان اور شیخ سلسلہ نقشبندیہ اولیہ کا درس قرآن ہوتا ہے۔ پھر اجتماعی و انفرادی ذکر کی مجلس قائم ہوتی ہے۔ نماز عصر کے بعد قرآن خوانی اور صحبت شیخ کا پیڑہ جاری رہتا ہے۔ افطاری کے لئے محکمہ جمع ہوتے ہیں۔ افطاری کے بعد نماز مغرب کے بعد کھانا ہوتا ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد پھر اجتماعی ذکر الہی کی مجلس قائم ہوتی ہے جس کے آخر پر کچھ افراد کی روحانی بیعت بھی کرائی جاتی ہے اس طرح رات دس بجے کے بعد آرام ہوتا ہے جو تہجد تک جاری رہتا ہے ہر سال متخصّص کی تعداد کم و بیش ہزار کے قریب ہو جاتی ہے جس میں سنت و نفل اعتکاف والے شامل ہوتے ہیں۔ جمعہ اور ستائیسویں پر یہ تعداد بڑھ جاتی ہے نذر کا پروگرام ساتھی خود تیار کرتے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق نذر میں حصہ بھی ڈال دیتے ہیں جس شخص نے زندگی میں دارالعرفان کا اعتکاف کر لیا اسکی خواہش رہے گی کہ بقیہ زندگی میں بھی اسکو ضرور حاصل کرے 'ایک ہی اعتکاف تزکیہ نفس اس حد تک ضرور کر جاتا ہے کہ انسان کچھ نہ کرے نماز روزہ کا پابند تو ہو ہی جاتا ہے۔ سارے ساتھیوں کی کلاسیں لطائف والے ساتھی اور مراقبہ ثلاثہ سے مسجد نبوی تک مراقبات والی دوسری کلاس میں روحانی بیعت والے تیسری کلاس میں فناء و بقاء سے عرشی منازل تک یا منازل بالا تک چوتھی کلاس میں اپنے اپنے اساتذہ سے گروپ وار ترتیب دے لیتے ہیں یہی ترویج کارکنان تنظیم الاخوان کے عشق کو عملی میدان میں کام کرنے

کے لئے تازہ رکھتی ہے جس کو دودھ پراتے رہتے ہیں اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ حمد کئے ہوئے ہیں۔

پھر سے دغا الے تیرے ہوں گے جنوں میں جتا  
 روز کے رکھ دیں گے پیہ گردش ایام کا  
 پھر سے اس مغل کو تیرے نام سے چکائیں گے  
 اپنے سینے میں ہما کر یہ تجھ کو واپس لائیں گے  
 خون دے کر ہمایا تھا جن تیرے لئے  
 اس میں پالے تھے سبھی مرد و من تیرے لئے  
 تیرے ہی روشن قدم سے اس کو پھر چکائیں گے  
 پتے پتے پر تمہارا نام لکھتے جائیں گے  
 لا الہ کی تیغ کاٹے گی اندھیرے کا جگر  
 گنبد خضریٰ سے روشن ہو گی پھر اپنی سحر  
 اپنا خون سیما دے کر اتنا ہم کر جائیں گے  
 نام آقا کا جن میں پھر رقم کر جائیں گے

عبدالحمید چھینہ

حوالہ

ہفت روزہ ”صدائے امن“

22 مارچ 1994ء



## باب شخصیت

## جمالِ ذات

مختلف اخبارات و رسائل میں چھپنے والے تعارفی نوٹ جو انٹرویوز کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان سے ایک کا انتخاب۔

کسی "مولویانہ انداز" "عالمانہ شان" اور ہیروں جیسے جاہ و جلال کا تصور لئے ان سے ملنے جائیں تو آپ کو سخت مایوسی ہو گئی۔ ان کے ہاں کسی مصنوعی انداز کی جائے فطری سوز و گداز ہے۔ اظہارِ شان کی جائے جذبہ ایمان ہے۔ جاہ و جلال کی جائے احساسِ جمال ہے۔ کمرِ نخل کی جائے دہمکی ہے۔ سنیر یونائپ مصنوعی وعظ کی جائے دل کو دل سے ہم کلام کرنے والی سادہ سادہ گفتگو ہے۔

منہبوط قد کاٹھ کے دہقان جیسے جسم و قامت 'چشمے سے جھانکتی ہوئی فکر و تدبیر سے معمور آنکھوں 'کشادہ پیشانی 'مسنون دازحی سے مزین پرکشش نقوش بکے حامل مسکراتے ہوئے پروقار چہرے کے ساتھ سراپا ایسا کہ جس سے کسی جری اور شجاع قبیلے کے سردار کی تمکنت شجاعت اور وجاہت جھلکتی نظر آتی ہے۔ کسی تصنع مبادت اور رکھ رکھاؤ سے مبرا کھری کھری اور اجلی اجلی شخصیت..... یہ ہیں ہینٹھ سالہ مولانا محمد اکرم اعوان 'جو سلسلہ ادیبہ نقشبندیہ کے روحانی سربراہ بھی ہیں اور تنظیم الاخوان کے مرکزی امیر بھی !!!

## حضرت جی

انٹرویو حضرت محمد اکرم اعوان صاحب

سوال :- زندگی کیا ہے اسے گزارنے کا آسان طریقہ آپ کی نظر میں کیا ہے؟  
جواب :- زندگی ایک عطیہ خداوندی ہے۔ یہ اتنی قیمتی ہے کہ جب ختم ہو رہی ہوتی ہے تو اس کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آدمی ایک پل خرید نہیں سکتا۔ واپس نہیں لا سکتا۔ زندگی گزارنا نہیں ہوتی زندگی انجوائے کرنے کے لئے ہے اور زندگی انجوائے تب ہو سکتی ہے جب وہ ان حدود و قیود کے مطابق گزاری جائے جو اس کی اساس ہیں۔ اگر ان حدود و قیود سے گزر جائے۔ ان سے باہر چلی جائے ان کو توڑ دے تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔ قرآن کی اصطلاح میں خود زندگی موت ہو جاتی ہے۔ اور سارے مسائل کا سبب بفسقی ہے۔ اللہ کریم نے بڑا آسان اصول دیا ہے۔

ترجمہ :- "زمین پر جو کچھ ہے وہ تمہاری خاطر ہے۔ تمہارے استعمال کے لئے ہے۔ تم اسے استعمال کر سکتے ہو۔" اب ہر چیز حلال ہو گئی تب تک جب تک کسی چیز کا استعمال منع نہ ہو، اصل چیز یہ ہو گی دنیا کی ہر نعمت آپ استعمال کریں، پھر کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے روک دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کے لئے مفید نہیں



کچھ حدود بنادیں گئیں کہ ایک دوسرے کے لئے جو چیزیں ہیں۔ ان میں مداخلت نہ ہو اور ایک حسن ترتیب کے ساتھ ہر کوئی اپنی اپنی سطح پر زندگی کو انجوائے کرے اسلام جو آخرت کی بات کرتا ہے تو اس سارے کی بنیاد بھی یہی زندگی ہے۔ نبی پاکؐ نے فرمایا کہ یہ زندگی آخرت کی کھیتی ہے تم وہ کچھ وہاں وصول کرو گے وہ کانٹے جو یہاں لاؤ گے، یہاں کا اٹھنا، ٹھنڈا دوستی، دشمنی تعلقات، لال چال ایمانیات سے لے کر اخلاقیات تک اور اعمال سے لے کر کردار تک یہ ساری چیزیں زندگی کا حسن ہیں۔ دنیا ایک خارزار بھی ہے۔ اس میں پھل بھی ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور زندگی یہ ہے کہ آپ کانٹوں میں الجھنے کی بجائے اس سے پھول حاصل کر سکیں۔ اس سے پھل حاصل کر سکیں۔

سوال :- آپ نے زندگی کو کیسا پایا؟

جواب :- میری داستان بڑی عجیب ہے۔ میں نے زندگی کا ہر رخ دیکھا ہے۔ کسی کا بہت پرانا ایک شعر تھا۔

گردش ایام تیرا شکر یہ

ہم نے ہر پہلو سے دنیا دیکھ لی

یہ جو میں نے ہر پہلو سے دنیا دیکھی ہے۔ اس کا مجھے ایک فائدہ بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جہاں میں اب ہوں مجھے کبھی کوئی حسرت نہیں ستاتی کہ کاش میں اس طرح کا ہوتا میں اس طرح کا ہوتا، میں مشہور ہوتا میرے پاس اقتدار ہوتا میں طاقتور ہوتا میرے پاس دولت ہوتی میں فلاں ہوتا؟ کچھ بھی نہیں، کیوں کہ میں نے زندگی کا ہر رخ دیکھا ہے۔ دوستیاں، دشمنیاں، تلخیاں، نرمیاں، نصاریاں صحت اتنے حوادث سے گزر کر میں جب یہاں حضرت کے پاس پہنچا تو میں زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور میں نے زندگی کو سوائے دکھوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کے کچھ نہیں پایا تھا۔ یہاں پہنچ

کر مجھے احساس ہوا کہ نہیں، زندگی تو رامتوں کا نام ہے۔ زندگی تو محبتوں کا نام ہے۔ زندگی تو بیچنے کی چیز ہے اور یہ سارا کچھ مجھے اس شعبے سے ملا جس پر میں کام کر رہا ہوں الحمد للہ اس میں مجھے ۳۰ سے زیادہ سال ہو گئے ہیں۔ میں سن ۵۸-۵۹ کا اس میں ہوں تو اب تک الحمد للہ مجھے کوئی پریشانی کوئی دکھ کوئی تکلیف اس میں نہیں آئی اللہ کا احسان ہے۔

سوال :- سکون قلب کیسے ملتا ہے؟ خواہشات کے پورے ہونے سے یا ترک خواہشات سے؟

جواب :- اس کا جواب بھی اللہ کریم نے دیا ہے۔ دراصل سکون ایک کیفیت کا نام ہے۔ کسی جنس کا نام نہیں ہے۔ سکون کا لفظی مطلب تو منحصر آؤ آجاتا ہے۔ لیکن جب قلب کی بات آتی ہے۔ تو ان حقائق تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد اس کا اضطراب ختم ہو جائے۔ پریشانی ختم ہو جائے۔ اس کیفیت اس حالت ان حقائق تک پہنچنے کا نام سکون ہے اور میں اس کا کیا جواب دوں گا اللہ تعالیٰ نے اس کا اصول بتا دیا ہے۔

(۱)

ترجمہ خوب اچھی طرح جان لو کہ سکون قلب جو ہے وہ اللہ کی یاد میں ہے۔ ذکر الہی میں ہے۔

اللہ کی یاد اور ذکر الہی کے مختلف انداز جو قرآن پاک نے بتائے ہیں ان کا ما حاصل لیا جائے تو یہ سمجھ آتی ہے کہ اسم ذات کا ذکر کیا جائے اپنے پروردگار کے ذاتی نام کا ذکر یعنی اللہ اللہ کی تکرار کا، کتنی؟

ترجمہ :- جب بھی کر سکتی ہو کہ دنیا سے تیرا رشتہ ایک طرح سے یعنی سوچوں کا خیالات کا کٹ کر صرف اللہ سے جڑ جائے اگر یہ کیفیات نصیب ہوں۔ تو دل کا اضطراب اور بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کسی کے رنج دینے سے بھی کلفت نہیں

ہوتی۔ اور کسی کی خوشامد کرنے سے بھی کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ پھر آدمی کو ان چیزوں کے پیچھے جو حقیقتیں ہیں ان کا اور اک ہوتا ہے پیچھے جو اسباب ہیں ان کا اور اک ہو جاتا ہے اور پھر افراد سے انہیں کی جائے ات پتا ہوتا ہے کہ یہ جو ہوا ہے ایسا ہونا چاہئے تھا اور یہ چیز اسے پریشانیوں سے بچاتی ہے۔

سوال :- اہل اللہ کی توجہ کیسے حاصل ہوتی ہے کیا توجہ سے اندر کی تبدیلی ممکن ہے؟

جواب :- پہلی بات تو یہ ہے کہ اہل اللہ کون ہے اور توجہ لیا ہے، اس کی تھوڑی سی چند جملوں میں وضاحت ہو جائے تو پھر بات آسان ہو جائے گی۔ یہاں جو مراد ہے اہل اللہ سے مراد ہے اور توجہ سے مراد یہ ہے کہ جو کیفیات قلب اطہر رسولؐ سے ملیں اور وہاں سے جو صحابہ کرامؓ کو فسیب ہوئیں۔ صحابہ کرامؓ سے تابعین کو پھر تبع تابعین کو اس کے بعد انہی نوشتن بن گیا، اہل اللہ سے مراد وہ مدہ ہے کہ جو ذاتی طور پر اولاً ان کیفیات کا حامل ہو اور اس درجے کا حامل ہو اس قوت کا حامل ہو کہ وہ کیفیات دوسروں میں منتقل کر سکے۔ یہ جو عمل ہے ان کیفیات کو منتقل کرنے کا اسے توجہ کما جائے گا۔ اب رہی آپ کے سوال کی بات کہ اہل اللہ کی توجہ کیسے حاصل ہوتی ہے تو اس کا بنیادی جو نقطہ ہے وہ جو قرآن پاک نے فرما دیا۔ ترجمہ :- امانت ہوتی ہے انسان اپنے دل کی گہرائی میں کوئی فیصلہ کرے کہ مجھے اللہ کے حضور جانا ہے۔ مجھے اللہ کے قرب کو پانا ہے میری منزل میرا رب ہے۔

سوال :- یہ فیصلہ مدہ خود کرتا ہے؟

جواب :- ہاں یہ مدہ خود کرتا ہے۔ اس کا اختیار ہے اس کے پاس، یہ بڑی عجیب بات ہے پس یہی کچھ اختیار اس کے پاس ہے۔ باقی سب اس کے شاخصانے ہیں جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اللہ کی ضرورت نہیں ہے تو پھر اس کے باقی فیصلوں کا مدار اس

پر ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کس سے مل رہا ہے کونسی غلطی کر رہا ہے کہاں جا رہا ہے۔ جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ نہیں مجھے اللہ کے پاس جانا ہے تو اس کی زندگی کے سارے فیصلے اس سے متاثر ہوں گے۔ اللہ نے یہ ملے کر لیا ہے کہ جب کوئی دل میں خلوص کے ساتھ یہ ملے کر لے گا کہ مجھے اللہ کے پاس جانا ہے۔ اللہ کے قرب کو پا رہا ہے تو وہ اس کے لئے ہدایت کے راستے کو مل دیتا ہے۔

ترجمہ :- اپنی طرف اسے راستہ دکھا دیتا ہے جس کے دل میں امانت آجائے امانت ہوتی ہے خلوص کے ساتھ طلب الہی۔ اب یہاں مفسرین نکلتے ہیں کہ کیسے راستے کی جانب۔ فرمایا اپنے ان ہندوں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ جو اس کے مقرب ہوتے ہیں اور اس کا رابطہ کر دیتا ہے۔ جس سے برکات نصیب ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

سوال :- تبدیلی آجاتی ہے؟

جواب :- بہت بڑی تبدیلی آتی ہے۔ بہت بڑی۔

سوال :- یقین اور ایمان میں کیا فرق ہے۔ کیا یقین کی رسائی ایمان تک ہو سکتی ہے؟

جواب :- میرا جو آج کا درس ہے اسی سوال پر ہے یقین کی رسائی ایمان تک ہونا بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ایمان کیا یقین کی حدوں تک ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ جسے ہم ایمان کہتے ہیں کیا وہ یقین کی حدوں تک ہے۔ دیکھیں ہاں قرآن پاک نے ساری بات بتائی کہ قرآن کتاب ہدایت ہے اس پر کسی شے کی گنجائش نہیں ہے یہ ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں دنیا کی چیزوں میں الجھتے نہیں بلکہ دوسروں کے فائدے کے لئے خرچ کرتے ہیں پھر فرمایا غائبانہ ان حقیقتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ جو آپ پر نازل ہوئیں یا آپ سے پہلے نازل ہوئیں اب اس میں ساری باتیں آگئیں۔ آخرت بھی آگئی حشر نشر بھی آگیا دنیا بھی آگئی۔

ترجمہ :- "یہ سارا ایمان ہے ان کا لیکن اس کے بعد جو ہے آخرت پر یقین ہے" یقین کے مختلف مدارج ہیں مثلاً کوئی ہمیں بتاتا ہے کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم مان لیتے ہیں یقین کا ایک درجہ ہے ایمان، یہی ایمان ہے۔ یہی یقین کا ایک درجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں۔ شور شرابہ سنتے ہیں ہم کہتے ہیں وہاں آگ لگی ہے۔ یہ اس سے مضبوط ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ ہم وہاں دیکھ لیتے ہیں کہ آگ لگی ہوئی ہے چیزیں جل رہی ہیں۔ اسے مین الیقین کہتے ہیں۔ یعنی کہ ایسا یقین جو آنکھوں دیکھا ہو ایک درجہ اس سے آگے ہے جو مشہور ہے اور وہ ہے جو اس آگ میں گر گیا ہو اسے بمشکل نکالا جائے یا وہ تڑپ کر نکلے اس کا آدھا بدن جل گیا ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں جل گئے ہوں اس کے کپڑے جل گئے ہوں بچن جل کر نکلے۔ جو یقین آگ کی پختگی کا اسے ہو گا وہ مطلوب ہے اب یہ کیسے ہو، اصل بات یہی ہے کہ جو کچھ اللہ کا کلام ہے۔ یہ نوافلہ نہیں۔ اس کے ساتھ کیفیات ہیں جو کچھ رسولؐ نے فرمایا اس کے ساتھ کیفیات ہیں اور وہ بدن پر وارد کی جاسکتی ہیں۔ روح پر وارد کی جاسکتی ہیں۔ ان کیفیات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان میں ایک ادراک حاصل ہوتا ہے اللہ کے ہمدوں کو کہ ان کے قلوب صاف ہوتے ہیں ان کیفیات تک ان کی رسائی ہوتی ہے تو ایسا عجیب حال ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین عطار کی توجہ کا سبب بنا، اور سنا ہے کہ وہ معروف عطار تھے تاریخ گواہ ہے۔ دوا میں پتے تھے بہت رش ہوتا تھا ان کے پاس۔ ان دنوں یہ ایلو پیتھی تو ہوتی نہیں تھی۔ بعض نسخے ہوتے تھے، عطار کی بہت بڑی دکان تھی ان کی، ایک درویش۔۔ آدمی تھا اسے کچھ چیز چاہے تھی۔ مگر اس کی باری ہی نہیں آرہی تھی بڑے بڑے نسخوں والے لوگ بیٹھے تھے رش اس قدر تھا کہ شیخ فرید الدین عطار بھی ملازموں کے ساتھ دکان پر مصروف تھے۔ اس درویش منش آدمی نے کہا بیہوشی فرید الدین تم اتنے مصروف ہو یوں لگتا ہے جیسے تمہیں تو موت بھی بھول گئی

ہو آخر میں بھی انسان ہوں مجھے تھوڑی سی چیز چاہیے۔ ٹھیک ہے بڑے بڑے گاہکوں کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں۔ تم اتنے مصروف ہو کہ تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمہیں مرنا بھی ہے۔ شیخ نے غصے سے کہا مرنا تو تمہیں بھی ہے، انہوں نے کہا ہاں مجھے بھی مرنا ہے۔ شیخ نے جواب دیا تو جیسے تو مرے گامیں بھی مر لوں گا، ذرویش نے کہا نہیں میں تو بڑے آرام سے مر جاؤں گا۔ دیکھو میں تجھے بتاتا ہوں دوکان سے باہر نکلا اپنی چاب۔ زمین پر رکھی اس پر سر رکھ "انشہد ان لا اللہ الا للہ" کہا کچھ دیر نہیں اٹھا جا کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا اس واقعہ نے ان کی زندگی تبدیل کر دی۔ وہ اہل اللہ کی خدمت میں گئے توجہ حاصل کی اور فرید الدین عطار معروف ولی اللہ ہیں۔ تو یقین کی وہ قوت جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اسے اپنے اوپر وارد کر لے مثلاً قرآن نے کہا

ترجمہ :- اس طرح حیوان کہ تم مرنے سے پہلے موت کی حقیقتوں کو پاسکو مرنے سے پہلے موت تمہارے لئے عجیب نہ ہو۔ نبی پاکؐ نے فرمایا۔

ترجمہ :- دنیا میں اس طرح رہو جس طرح مسافر ہوتے ہیں۔ یاراہ چلنے والا راہرو ہوتا ہے کہ کسی جگہ سستانے کے لئے رک گیا اس کی منزل آگے ہے اسے جانا ہے اور اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار کرو "ہمارے ہاں اس سلسلے میں بلکہ باقی سلاسل میں بھی یہ باقاعدہ مراقبہ کرایا جاتا ہے۔ جس میں آدمی موت کو وارد ہوتے دیکھتا ہے۔ روح کو جاتے دیکھتا ہے۔ دوسروں کے کندھوں پر اپنا جنازہ دیکھتا ہے۔ وہ حالات اس کی قبر کہاں ہوگی۔ قبر میں مگر نکیرین کیسے آئیں گے قبر کے بعد میدان حشر ہے یہ ساری حقیقتیں نظر سے گزرتی ہیں۔ اگر یہ کیفیات وارد کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے تو یہ یقین ہے یہی ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔

سوال :- آپ نے اللہ کو کیسا پایا؟

جواب :- کراچی میں میرا ایک گھنٹے کا ایک بیان تھا، سا مین عام لوگ تھے۔ ایک بزرگ نے کہا آج آپ نے ایک گمنامہ بات کی اور ہمیں اللہ سے ڈرایا ہی نہیں۔ کوئی خوف خدا کی بات کوئی اللہ سے ڈرانے والی بات۔ میں نے کہا جی میری مجبوری ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) مجھے ڈراتا ہی نہیں میں آپ کو اس سے کیوں ڈراؤں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ میں نے آپ کو پیار کی محبت کی باتیں بتائیں۔ میں نے آپ کو دعوت دی کہ اللہ سے پیار کرو اللہ سے محبت کرو کہ وہ محبت کرنے والا ہے۔ وہ خالق ہے ہمارے اور اکالت سے بالاتر ہے۔ لیکن مشیت غبار کے پیار کی حیثیت کو سمجھتا ہے۔ قبول کرتا ہے۔

ترجمہ :- ”جو کوئی اس سے پیار کرتا ہے اس کے پیار کو قبول کرتا ہے“ وہ جانتا ہے کہ یہ میرے لئے روتا ہے یہ میرے لئے تڑپتا ہے اور یہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اللہ کو سب سے بڑھ کر کریم محبت کرنے والا محبت دینے والا اور محبت قبول کرنے والا پایا۔

سوال :- کیا یہ راستہ آپ نے خود چنا ہے یا طے شدہ لگتا ہے؟

جواب :- میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں زندگی کی تکنیاں اور زندگی کے مصائب اور اس کے بے شمار نشیب و فراز دیکھ چکا ہوں۔ میں نے بڑی جدوجہد کی ہے میں نے بہت ہمت کی ہے۔ میں نے بہت محنت کی ہے۔ میں بڑا ضدی، ٹھکڑا ڈٹ جانے والا۔ محنت کرنے والا مجاہدے والا آدمی ہوں۔ لیکن میں جو کچھ کرتا تھا۔ وہ میرے سامنے ایک نئی تخی پیدا کر دیتا تھا۔ پھر کچھ میں فیصلے کرتا تھا۔ بڑا عرصہ میرے فیصلے جو میں کرتا تھا چلتے رہے پھر مجھے سمجھ آئی نہیں یہ محض اتفاق تھا فیصلے میں نافذ نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا کوئی ایسی چیز ہے جو انہیں توڑ دیتی ہے۔ مجھ میں شکستگی سی آئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ میری انا کی شکست ہوئی۔ میں نے سوچا کون ہے ایسا، پھر میرا دھیان اللہ کی

طرف گیا۔ پھر میں بزمگوں کے پاس گیا۔ پیروں کے پاس گیا۔ وہاں میں نے پورے پائے عیار پائے زر کے طلب گار اقتدار کے بھوکے ان ساری چیزوں کی میرے لئے کوئی حیثیت نہیں تھی۔

میں کتنا تھا سال بھر نمر کو کے دو دو روپے شہرینی لینے کی بجائے مدد و پکڑو ایک بس لوٹ لو آرام سے کھاؤ پیو۔ دو دو روپے سے کیا بنے گا۔ مگر ان میں بہت نہیں ہوتی تھی۔ پھر میری ملاقات حضرتؒ سے اتفاقاً ہوئی اور یہ ملاقات ۲۵ طویل برسوں پر محیط ہو گئی۔ میں اٹھ نہیں سکا وہاں سے، یہ اللہ کا ترتیب دیا ہوا پروگرام تھا کیونکہ میں اتفاقات کا قائل نہیں ہوں۔ اتفاق ہم اسے کہتے ہیں یا حادثہ اسے کہتے ہیں۔ جس کے پیچھے جو سبب ہو گا ہماری عقل یا ہماری نظر میں نہیں ہو گا مگر پیچھے سبب ہوتا ہے۔ دست قدرت ہوتا ہے۔ اس کا پروگرام ہوتا ہے اس کی کائنات میں اس کے پروگرام کے باہر کچھ نہیں ہوتا۔ الحمد للہ اللہ نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ میں سمجھتا ہوں اسی کا فیصلہ تھا اور بہت خوبصورت فیصلہ تھا بہت حسین فیصلہ تھا۔ مجھے اب سمجھ آتی ہے۔ کہ یہ جتنی پریشانیوں، تکلیفوں، دکھوں سے میں گزرا ہوں یہ میری ضرورت تھیں۔ آج وہ ساری چیزیں میرے لئے معاون ہیں۔ الحمد للہ۔

سوال :- عشق کا اصل مطلب کیا ہے؟

جواب :- اس نام کی بہت سی تعبیریں ہیں بہت سی تشریحات ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں۔ لیکن ایک مصرعہ ایک جملہ جو ایک عرب شاعر نے کہا تھا میری ذاتی رائے میں وہ اس کا مفہوم ہے۔

ترجمہ :- ”محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کا غیر مشروط غلام بن جاتا ہے۔ چوں چراں باقی نہیں رہتی“ میری ذاتی رائے میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس سے ہم عشق کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ وہاں ہمارے دلائل، ہماری پسند، ہماری خواہشات،



ہماری آرزوئیں دم توڑ دیں اور وہی ہماری پسند ہو جو وہ چاہے۔ ایک بہت مزے کا عربی کاشعر ہے۔

ترجمہ: میں اس کے قرب کا طالب ہوں جبکہ وہ مجھے دور رکھ کر خوش ہے میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ مجھے ہجر میں رکھ کر خوش ہے۔

ترجمہ: ”جو کچھ وہ چاہتا ہے اس پہ میں نے اپنی خواہش کی دستبرداری اختیار کی میں وہی کروں گا جو وہ چاہے گا“ تو جہاں جا کر اپنی خواہشات اپنے سوال اپنا لاجک اپنی آرزوئیں دم توڑ جائیں اور تمنا یہ بن جائے کہ جو محبوب چاہتا ہے مجھے وہ کرنا ہے وہ عشق کھلاتا ہے۔

سوال :- اصل راستہ کیا ہے وہ راستہ جسے سچ کا راستہ کہتے ہیں، کوشش سے ملتا ہے یا تقدیر سے؟

جواب :- اصل راستہ ایک ہے۔ اسی ایک راستے کو جس کا ایک سرا اللہ کی ذات سے ملا ہوا ہے۔ ہر نبی اس راستے کی شمع ہے۔ محمدؐ سراج منیر ہیں ایسا چراغ جو روشنیاں بانٹتا ہے آپؐ کو بھی اسی راستے کا چراغ فرمایا گیا ہے۔ اصل راستہ وہی ہے جو ہم دے کو حقیقت آشنا کر دے سب سے بڑی حقیقت اللہ کی ذات ہے اب اس میں نماز روزہ عبادات کی حیثیت ثانوی آجاتی ہے کہ وہ کیفیت وہ ذوق نصیب ہو اور پھر یہ پتا چلے کہ ہر سجدے سے اس راستے کا ایک قدم طے ہوتا ہے۔ پھر سجدوں میں مزا آجاتا ہے پھر یہ پتا چلے کہ ایثار کرنے سے یا یہ کام کرنے سے میں اس راستے میں تھوڑا آگے چلا جاؤں گا تو تب لطف آتا ہے عبادات کا معاملات، اخلاقیات کا اگر وہ سمت درست ہو جائے اور وہ راستہ اور اس کی بنیادی بات یہ ہے کہ سارے دروازے اس راستے کے ہمہ ہو چکے ہوں۔ سوائے اتباع محمدؐ رسولؐ کے ”کسی یکجائی سے ملت احمد مرسل کو مقامی کرلو“ ایک ہی راستہ ہے۔

سوال :- سوال میں یہ بھی تھا کہ یہ راستہ کوشش سے ملتا ہے یا تقدیر سے ؟  
 جواب :- دونوں باتیں ہیں۔ کوشش بھی ہے اور تقدیر بھی میں نے پہلے آپ سے  
 عرض کیا ہے کہ ہمے کا اختیار کیا ہے۔ کیا وہ اپنی مرضی سے پیدا ہو سکتا ہے نہیں۔  
 اپنی مرضی سے مر نہیں سکتا۔ اپنی مرضی سے ہماری نہیں اپنی مرضی سے پسند کی  
 شکل نہیں بنا سکتا اپنی پسند سے دماغ نہیں بنا سکتا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مجبور ہے اس  
 ہے بے چارہ، ایک فیصلہ ہے اس کے پاس  
 (ترجمہ :)

یہ فیصلہ نر انسان کا ہے اس میں اللہ کا شکر کرتا ہے یا اس کی ناشکری کرتی ہے۔  
 جب یہ طے کرتا ہے۔ اگر شکر کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ فیصلے میں کتنی  
 قوت ہے۔ دیکھیں نہ آپ ایک گولی چلاتے ہیں اس میں جتنا بارود ہو تو اتنی دور تک  
 جائے گی سو گز تک جائے گی ہزار گز تک جائے گی دس ہزار گز تک جائے گی۔ ایک  
 پاور ہے اس میں۔ آخر میں پاور کام کرتی ہے۔ اس فیصلے میں کتنی طاقت ہے۔ جتنی  
 اس فیصلے میں پاور ہے اتنا دور وہ چلا جائے گا۔ اللہ اسے لے جائے گا اور اگر اس نے  
 یقین سے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے اللہ کی طرف جانا ہے اللہ اس کے اسباب پیدا فرما  
 دے گا آگے تقدیر کا کام ہے وہ اس کا ساتھ دیتی چلی جائے گی۔

سوال :- قسمت بنانے میں انسان کی اپنی محنت و کوشش کا کتنا ہاتھ ہے ؟

جواب :- قسمت سے مراد نیاوی اسباب و وسائل ہیں یا ؟

سوال :- میرا مطلب تقدیر اور تدبیر سے ہے ؟

جواب :- تقدیر کیا ہے اور تدبیر کیا ہے۔ تقدیر دو قسم کی ہے قضا جسے کہتے ہیں تقدیر  
 جسے کہتے ہیں اس کی دو اقسام ہیں۔ ایک ہے قضا مبرم۔ ایسے فیصلے جو نلتے نہیں جو  
 طے شدہ ہیں اور دوسری ہے قضا معلق وہ تقدیر جس کے فیصلے معلق رہتے ہیں۔

انسانی کردار کے مطابق نافذ ہوتے ہیں۔ مثلاً اب دیکھیں ایک پوری قوم غرق ہو گئی ان سب کی موت ازل سے ایک دن مقدر نہیں تھی لیکن قضا معلق تھی۔ اللہ کی گرفت میں آئے مگر انا اس لیول تک پہنچے یہ ان کا کردار تھا کہ اس کی وجہ سے وہ قضا معلق ان پر مسلط ہو گئی تو تدبیر جو ہے یا حسن تدبیر جو ہے وہ قضا معلق کو تبدیل کرتی ہے جو فیصلے انسان کے کردار پر نافذ ہونے والے ہیں، اگر وہ سدھر جاتا ہے فیصلے بدل جاتے ہیں نہیں سدھر جاتا تو فیصلے بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت یونس کی قوم، جسے حضرت یونس چھوڑ کر چلے گئے کہ اب تم پر عذاب آئے گا۔ انہوں نے توبہ کر لی عذاب نہیں آیا۔ تو تدبیر کا دخل قضا معلق کو اس کے نفاذ یا اس کی تبدیلی میں ہے، البتہ جو مہرم ہیں جو فیصلے نہ ملنے والے ہیں جو طے شدہ ہیں ان میں تدبیر بے اثر ہے۔

سوال :- کیا محبت کا تعلق ارادے سے ہے یا بے اختیاری سے۔ اگر بے اختیاری ہے تو انسان کا اس میں کتنا دخل ہے؟

جواب :- محبت کبھی ارادے سے نہیں ہوتی۔ ارادے سے لین دین ہوتا ہے تجارت ہوتی ہے۔ بہت سی محبتیں جنہیں ہم محبت کہتے ہیں۔ وہ محبت نہیں ہے۔ باہمی مفادات کا لین دین ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ چاہئے ہوتا ہے اسے ہم سے کچھ چاہئے ہوتا ہے وہ اپنے فائدے کی چیز ہم سے لیتا ہے ہم اپنے فائدے کی چیز اس سے لیتے ہیں۔ جیسے پیسہ دے کر غلہ خرید لیا کپڑا خرید لیا۔ جو تاخیر لیا اسی طرح کچھ جذبات کا تبادلہ کر لیا یا کچھ مادی فوائد دوستی یا اس کے پردے میں ایک دوسرے کے مفادات اکٹھے ہو گئے۔ تو یہ محبت نہیں یہ ضرورتیں ہیں، یہی بات ہے تو محبت ارادوں سے نہیں ہوتی محبت ایک حادثہ ہے جو ہو جاتا ہے۔ محبت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہمدے کی اللہ سے محبت اور ہمدے کی رسول سے محبت اور ہمدے کی اللہ سے محبت

ہندے سے محبت اور بے عورت اور مرد کی محبت ایک اور شے ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں اس میں وہ پہلو بھی آسکتا ہے جو ہندے کو ہندے سے ہوتی ہے اور ایک فطری تخلیقی پہلو بھی ہے۔ جس پر سائنس اب پہنچی ہے اور جس سے نئی پاک نے ۱۳۰۰ سال پہلے آگاہ فرمایا تھا۔ اب یہ جدید ریسرچ آئی ہے، تو جس طرح اشمیل کی انکس میں ہمیں ملتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جانوروں میں بھی سلیکشن ہوتی ہے۔ کوئی فی میل کسی کنڈیا یا کمزور میل کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ انسانوں کی فریکوئنسی ہے۔ یہ جو محبت ہے اس کو جہاں سے ہم چھوڑیں میل فی میل پر رکتی ہے۔ جہاں سے اس فسانے کو چھوڑا جائے بات وہاں پہنچتی ہے۔ تو اس میں میل اور فی میل میں فریکوئنسی ہے۔ اس کے دل سے ایک چیز اٹھتی ہے ایک کیفیت اٹھتی ہے۔ جو اس کی آنکھوں سے منعکس ہوتی ہے۔ یہ وہ قرآن نے پردے کا کہا ہے۔

ترجمہ :- نگاہوں کو چاکر رکھو نچار کھیں، اسی طرح مردوں کو بھی کہا کہ نگاہیں چار رکھو، یہ جو کیفیات آتی ہیں آنکھوں سے دل کے راستے، اگر میل فی میل کی نظریں دوچار ہوں اور ان کی فریکوئنسی قریب تر ہو۔ جتنی قریب ہو مثلاً یہ کہ ایک کی دس دوسرے کی آٹھ تو اس نسبت سے انہیں ایک دوسرے سے رغبت ہو جائے گی۔ اگر ایک کی دس ہے دوسرے کی نو ہے تو اور زیادہ محبت ہو گئی اور اگر دونوں کی دس دس ہے تو پھر لپٹی مجنوں ہوں گے۔ سکی ہوں ہوں گے ہیرا رانجا ہوں گے۔ ایک فطری چیز ہے جو اپنا مقابلہ تلاش کرتی ہے۔ اس کی مختلف اقسام ہیں کہیں ہمیں اولاد سے محبت ہے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں اولاد سے محبت ہوتی ہے، اکثریت اولاد سے بے نیس یا پار کرتی ہے۔ انہیں توقع ہوتی ہے کہ انہیں پڑھائیں گے لکھائیں گے تو ہمیں چہرے ملے گا جب وہ چہرہ کما کر نہیں آتا محبتیں کا فور ہو جاتی

ہیں دوستوں سے محبت ہوتی ہے جب ان سے وابستہ توقع ٹوٹ جاتی ہے دوستی ختم ہو جاتی ہے سب بزدل ہے، ہاں کیس کیس محبت ہے جہاں لوگ نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر خالص محبت کرتے ہیں یہ دوستوں میں بھی ہے والدین اور اولاد میں بھی اور میل فی میل میں بھی ہے۔

سوال : تصوف کا اصل مطلب کیا ہے؟ کیا تصوف سے زندگی آسان بنائی جاسکتی ہے؟

جواب : تصوف کے بہت سے مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ میری رائے میں یہ ترجمہ ہے تزکیہ کا۔ قرآن نے عربی میں یہ لفظ تزکیہ کے طور پر استعمال کیا ہے قرآن کا سب سے پہلے جو ترجمہ ہوا ہے وہ فارسی میں ہوا ہے۔ ایران نے بڑے بڑے نامور محدثین اور قرآن پاک کے مفسرین پیدا کئے ہیں، ایران میں ترجمے اور تفسیریں لکھی گئیں تو انہوں نے تزکیے کو تصوف لکھا تزکیے سے مراد ہے خاص دل کی باطن کی صفائی اور تصوف سے بھی مراد صفائے باطن ہے، صفائے قلب ہے۔ قلب کی صفائی سے مراد یہ ہے کہ قلب ایسا آئینہ بن جائے جس میں برکات نبوت یا عبادات نبیؐ اس میں منعکس ہوں۔ اور اس کے گرد و روشنی کے ہالے وہ نور کے دائرے پھیلیں۔

زندگی کی آسانی کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا سبب نہ ہوں بلکہ دوسروں کو آسانیاں دے سکیں۔ اگر کوئی شخص دوسروں کی آسانیوں کا اہتمام نہیں کر سکتا تو وہ اپنے لئے زندگی میں کبھی آسانیاں پانیں سکتا۔ یہ اصول ہے فطرت کا۔ تو تصوف سے مراد یہ ہے کہ طریقے یا سلیقے سے ذکر اذکار کر کے محنت کر کے توجہ حاصل کر کے، وہ کیفیت ڈھیلپ کی جائے وہ کیفیت حاصل کی جائے کہ اس میں کوئی معمولی سی لیکن اخلاق کریمانہ کا عکس اس میں نظر آئے؟ اخلاق کریمانہ کا عکس حسین کرے گا تو وہ ہر ایک کی اپنی

حیثیت کے مطابق۔ لیکن کوئی نہ کوئی حسن جمال محمدیؐ کا اس میں آئے اور پھر وہ روشنی کا ہالہ بنے اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو برکات نبویؐ سے منور کرے، پھر وہ روشنی دوسروں کو سکون دے گی دوسروں کو دم لینے کی جگہ دے گی دوسروں میں جینے کا حوصلہ پیدا کرے گی دوسروں کے دکھ مٹانے کا طریقہ عطا کرے گی اور جب دوسروں کو آسانیاں ملیں گی تو اس شخص کی زندگی آسانیوں سے بھر جائے گی اگر کوئی دوسروں کو آسانیاں نہیں دے سکتا تو اپنے لئے پانہیں سکتا۔

سوال :- اس سوال کا تعلق حضرت سلطان باہوؒ کے شعر سے ہے۔  
 ”ایمان سلامت ہر کوئی مئے عشق سلامت کوئی ہو“ عشق کی سلامتی مانتے والے کیا ایمان سے دور ہو جاتے ہیں؟

جواب :- میرے خیال میں اس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ بہت بڑے عاشق تھے، اس حد تک کہ ان کا ہر بال سراپا عشق بن گیا تھا۔ ان کی کیفیات اگر عالم برزخ میں بھی دیکھی جائیں تو ان کا وجود گویا آج بھی سراپا عشق ہے، ان کی کمائی بڑی عجیب و غریب ہے جو میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا بہت سے لوگوں کے نفع نقصان اس سے واسطہ ہیں۔ اس بات کو رہنے دیں، ان کا عالم یہ ہے کہ انہیں برزخ میں بھی مئے نے آج تک پیٹھے ہوئے یا آرام کے حال میں نہیں دیکھا۔ اسی طلب کو لے کر کھڑے ہیں اس کی (اللہ تعالیٰ) بارگاہ میں۔ ایمان کی سلامتی کی جو بات انہوں نے لی ہے، وہ یہ ہے کہ اس حد تک جو مذہور ہٹانے اس کی اخروی نجات ہو جائے اور بس، یہ ایمان سلامت ہے اتنا یقین اتنا ایمان ہو اسے اعمال ہوں کہ حشر میں کامیاب ہو جائے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ محشر میں کامیاب ہو جانا۔ لیکن دو عالم سے اٹھ کر اسی کو پانا اسی (اللہ تعالیٰ) کی خواہش کرنا اسی کی طلب میں سرگرداں ہو جانا۔ اور دنیا و آخرت سے بالاتر ہو جانا۔ یہ عشق کی سلامتی کی بات ہے جس کی وہ بات کرتے ہیں، یہ

ان کا حال ہے جو وہ کہہ رہے ہیں یہ ان کی کیفیت ان پر وارد ہے وہ اس میں آج بھی مبتلا ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں اور ایسے حوصلے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ حضرت ربیعہ بصریؒ نے کہا تھا کہ دنیا کے طلب گار کہتے ہیں۔ آخرت کے طلب گار مونٹ ہیں یعنی زمانے میں اور مرد وہ ہے جو اللہ کا طالب ہو۔

سوال :- کیا ذکر سے اندر کی دنیا میں تبدیلی آسکتی ہے؟

جواب :- یقیناً بہت بڑی تبدیلی آسکتی ہے آتی ہے۔ ہم نے ہزاروں لوگوں کو تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ بیٹھے تہجد پڑھتے ہیں ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو کلبوں سے میخانوں سے جو خانوں سے یورپ کی روشنیوں سے امریکہ کے چمچ سے آئے ہیں۔

سوال :- نئی زمانہ اہل اللہ کی ضرورت ہے یا اہل خرد کی؟

جواب :- جو اہل اللہ نہیں ہے اہل خرد نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا پاگلوں کی دنیا ہے آپ نے نہیں دیکھا کہ یہ قیام امن کے لئے ایٹم بم مارتے ہیں۔ دنیا کا فلسفہ آپ نے دیکھا۔ یہ امن کے قیام کے لئے تباہی کے سامان پیدا کرتے ہیں۔ قتل و غارت کرتے ہیں کہ امن قائم کرنا ہے۔ ظلم کرتے ہیں کہ یہ عدل ہو رہا ہے یہ دیوانوں کی دنیا ہے۔ اہل خرد میں صرف اہل اللہ کو سمجھتا ہوں اور یاد رکھیں اللہ اللہ کرنے سے ذکر کرنے سے استعداد ہے جو فطری ہے عقل کی بھی شعور کی بھی فکر کی بھی اس کی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں قوت کار اس قدر بڑھ جاتی ہے اور آدمی اتنا کام کر لیتا ہے کہ جتنا ۵۰ آدمی مل کے بھی نہیں کر سکتے۔ کام میں برکت آ جاتی ہے۔ اوقات میں برکت آ جاتی ہے۔ جو کام آدمی ہفتے میں نہیں کر تا وہ دو گھنٹے میں کر لیتا ہے اس کی بے پناہ برکات ہیں اور بے شمار خوبصورت تبدیلیاں آتی ہیں۔

سوال :- یہ آپ سے متعلق سوال ہے آپ بہت سے شعبہ ہائے زندگی میں کام کر

رہے ہیں؟ اگر آپ سے کہا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں تو آپ کا انتخاب کیا ہوگا؟

جواب :- میں نے ایک دفعہ گننا چاہی نے مجھے احساس دلایا اور اس نے مجھ پر طنز کیا کہ تم خود نمائی کا شکار ہو۔ لوگوں پر خود کو مسلط کرنا چاہتے ہو۔ کیا وہ ہے کہ ہر شعبے میں تم نے دخل اندازی کر رکھی ہے۔ تم صحافت میں بھی دو تم المرشد بھی چلاتے ہو۔ تم خطیب بھی ہو تم جمعے بھی پڑھاتے ہو تم پیر بھی ہو تم اللہ اللہ بھی کرتے ہو۔ تم نے الفلاح فاؤنڈیشن مار کھی ہے الاخوان مار کھی ہے سلسلہ نقشبند یہ بھی چلاتے ہو۔ رنک مار کھا ہے۔ تم سکول چلا رہے ہو تم کیا منیبت ہو۔ تو اس وقت جو میں نے جواب دیا۔ کالم نگار ہارون الرشید اس محفل میں موجود تھے۔ انہوں نے اس کا ذکر اپنے کالم میں کیا ہے۔ یہ واقعہ انہوں نے اپنے کالم میں لکھا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو وہ کالم مل جائے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ مختلف جہتیں نہیں ہیں۔ میری اصل جہت طلب الہی ہے۔ عشق الہی ہے۔ یہ باقی جتنی چیزیں ہیں اس طرف سے مجھ پہ آجاتی ہیں۔ یہ بھی کر لوں وہ بھی کر لوں میں نہیں سوچتا کہ میں کیا کر رہا ہوں اس لئے کہ جو کہہ رہا ہے وہ کرنے کی طاقت بھی دے دیتا ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں کہیں کوئی شعبہ ہے جس میں انسانیت کی خدمت، کافرو مومن کی تمیز کے بغیر، کوئی شعبہ ہے جس میں معاشی اصلاحات کا کام ہے، کوئی شعبہ ہے جو تعلیمی اصلاحات کا ہے، کوئی رفاہ عامہ کا ہے، کوئی شعبہ سیاست کا ہے۔ کوئی ذکر اذکار کا ہے۔ تو یہ سارے شعبے اس ایک راستے کے زاد راہ ہیں جس پر میں جا رہا ہوں۔ اب کوئی مسافر جو جا رہا ہے۔ اسے راستے میں اخروٹ ملتے ہیں لے لیتا ہے۔ پانی کی چھاگل ملتی ہے انھا لیتا ہے رونیاں ملتی ہیں لے لیتا ہے یہ اس کا زاد راہ ہے بوجھ نہیں ہے۔ تو میں دراصل ایک ہی سمت جا رہا ہوں یہ سارا میرا زاد راہ ہے۔ جو آپ کو منتشر نظر آتا ہے۔



سوال :- آپ کا نظر یہ حیات کیا ہے؟

جواب :- میرا نظر یہ حیات یہ ہے کہ اس فانی زمین پر اتنے مگرے نقش چھوڑے جائیں کہ جب تک یہ رب ہمارے نقش باقی رہیں۔ محبت کے نقش۔ بھلائی کے نقش۔ احسان کے نقش۔ فرعونیت اور ظلم و تشدد کے نہیں۔

سوال :- اب یہ سوال آپ کی شاعری سے متعلق ہے آپ خود ورت شاعری کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری کی قصم کیا ہے؟

جواب :- میں شاعر نہیں ہوں۔ لیکن میں شعر کہتا ہوں۔ مجھے شعروں کے قواعد و ضوابط نہیں آتے۔ مجھے شعروں کے اوزان کا نہیں پتا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا میں نے اس بارے میں کچھ نہیں پڑھا۔ مجھے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لئے کہ میرے پاس وقت ہی نہیں ہے، اس لئے میں جو شعر کہتا ہوں یہ شاعری نہیں ہے یہ میرا حال ہوتا ہے۔ کیفیات ہوتی ہیں واردات ہوتی ہے میں ٹیبل پہ بیٹھا ہوں میں کھانا کھا رہا ہوں، میں ایک مسرۂ کہتا ہوں پھر دوسرا کہتا ہوں پھر تیسرا چوتھا اس طرح غزل بن جاتی ہے، ٹیبل پہ بیٹھا ہوں دفتر میں بیٹھا ہوں لوگ بیٹھے ہیں میں لکھتا شروع کر دیتا ہوں۔ گنگنا تا جاتا ہوں لکھتا جاتا ہوں۔ غزل بن جاتی ہے، گاڑی میں سفر کر رہا ہوں اس وقت فارغ ہوں، کسی کیفیت میں جب چلا جاتا ہوں۔ میں جس حال کا ہوں وہ مجھ پر وارد ہو جاتی ہے کسی سے مات کر لیتا ہوں کسی کو دیکھ لیتا ہوں کسی کو چھو لیتا ہوں۔ کچھ پالیتا ہوں کچھ دے دیتا ہوں۔ عجیب ساقصہ ہے میرا پھر وہ باتیں جو میری کسی سے ہوتی ہیں کوئی مجھ سے کرتا ہے پھر وہ غزلوں میں شعروں میں نظموں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جب کوئی میرے پاس نہیں ہوتا کوئی نہ کوئی میرے پاس ہوتا ہے۔ جو ہوتا ہے اس سے جو بات ہوتی ہے وہ غزل بن جاتی ہے۔ شعر بن جاتا ہے کہانی بن جاتی ہے، کہیں درد و الم میں ڈھل جاتی ہے تو کبھی لڑائی میں

آجاتی ہے تو کبھی ایثار میں آجاتی ہے۔ بھی الفت و محبت میں آجاتی ہے تو یہ اس طرح چلتا رہتا ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں کہ مجھے شاعری کے لئے قواعد پڑھنا پڑھیں کچھ سوچنا پڑے کچھ سمجھنا پڑے 'کچھ محنت کرنا پڑے' نہیں ایسا کچھ بھی نہیں اور مجھے شاعر ہونے کا کوئی دعویٰ بھی نہیں ہے۔

سوال :- کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کو رک کر سوچنے پر مجبور کیا ہو؟

جواب :- ایک واقعہ ہوتا تو ہوتا دیتا میری زندگی واقعات کا ایک تسلسل ہے اور ہر واقعہ ایک زینہ ہے۔ ایک سیرِ حسی ہے، میں جہاں کھڑا ہوں میں وہاں سے وہ سیرِ حیاں گرا نہیں سکتا۔ ۶۵ سال پر پھیلا ایک ایک قدم ایک یادگار ہے اور مجھے ساری یادیں بڑی عزیز ہیں یہ میری سیرِ حیاں ہیں ان میں سے میں کسی کو توڑ اور کھو نہیں سکتا۔ میں نے زندگی سے سیکھا ہے زندگی کو لباس کی طرح اپنے اوپر وارد کیا ہے۔ پہنا ہے۔ میں نے زندگی کا کوئی لمحہ خالی نہیں جانے دیا۔ اچھا، اکہیں نفیس کہیں کھردرا کہیں گرم کہیں سرد، موسموں کے اعتبار سے لباس بدلتے رہے۔ ملکوں کے اعتبار سے لباس بدلتے رہے۔ میں نے جاپان سے امریکہ کے مغربی ساحلوں تک اور چین سے افریقہ تک دنیا کو پھر کے دیکھا ہے۔ ہر دیار میں ہر موسم میں رہ کے دیکھا ہے۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملا ہوں مسلسل ایک تسلسل ہے۔ ان سیرِ حیوں کا۔ ہر سیرِ حسی اپنی جگہ اہم ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا کہ کون سی سیرِ حسی زیادہ اہم ہے اور کون سی کم اہم ہے۔

سوال :- راہِ سلوک میں مرشد کا ہونا ضروری ہے؟

جواب :- راہِ سلوک یہ ہے کہ اس کی اصل ہے قلبِ اطہر رسول اللہ۔ انوارِ ویرکاتِ صحابہؓ نے حضورؐ سے لئے، صحابہؓ سے تابعین نے، تابعین سے تبع تابعین نے اس کے بعد یہ انٹرنیٹ ٹوشن بن گیا۔ تو یہ جو پیری مریدی کا ہمارے ہاں تصور ہے۔ اس کی



مولانا محمد امجد الحق دہلی میں



مولانا محمد امجد الحق ایک انداز

اساس یہ ہے کہ شیخ یا پیروہ ہوتا تھا۔ جوان برکات کا حامل ہوتا تھا۔ مرید وہ ہوتا تھا جو اس سے وہ برکات لینے جاتا تھا۔ اب تو یہ ہمارے ہاں اس ہندو علم کا شکار ہو گئے، وہ رہبانیت اور پوپ کا فلسفہ آگیا یا عربی کا فلسفہ آگیا کہ یہ ہماری مشکلیں دور کرے گا، اور یہ کہ اولاد اس سے لیں گے، یہ سب فضول ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ کیفیات قلبی اس کے پاس ہوں اور وہ آگے تقسیم کرے۔ حضرت سلطان باہو سے کسی نے سوال پوچھا تھا کہ قرآن کا پڑھنا نماز کا پڑھنا عبادت کا کرنا کافی نہیں ہے۔ شیخ کی کیا ضرورت ہے انہوں نے فرمایا کہ جس طرح اولاد کے لئے شادی کی ضرورت ہے، اسی طرح راہ سلوک کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔ دنیا کا ایک نظام ہے یہ ایک تسلسل ہے جس طرح حدیث کی سند ہے اس طرح تصوف کے شجرے ہیں کہ حضور سے کس نے حاصل کیا اس سے کس نے اس سے کس نے اس طرح آگے تک سلسلہ چلتا ہے اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔

سوال :- ہمارے ہاں معاشرتی قدروں کے بگاڑ کی وجہ کیا ہے؟

جواب :- دنیا کا ایک نظام ہے اور دنیا کا نظام یہ ہے کہ سورج روشنی دیتا ہے۔ مختلف چیزیں ہیں، فضا ہے ہوا ہے اور اس میں بے شمار ذرات ہیں خاک کے بے شمار گیسوں ہیں بے شمار چیزیں ہیں۔ اور ہر چیز اس روشنی کو آگے منعکس کرتی چلی جاتی ہے۔ یعنی تقسیم در تقسیم کا ایک سلسلہ ہے کہ جو موصول ہو رہا ہے اسے آگے پہنچاؤ دل دھڑکتا ہے خون دیتا ہے اب خون خون کی بڑی نالی میں آتا ہے اور پھر چھوٹی نالی میں آتا ہے اس سے اگلی چھوٹی نالیوں میں جاتا ہے اس طرح جلد کے ایک ایک مسام تک آتا ہے۔ اب کہیں سے آپ اسے روک لیں آگے تقسیم نہ ہونے دیں وہاں ناسور بن جائے گا۔ اگلا حصہ گل سڑ جائے گا اور پھٹلا بھی سوچ جائے گا آرام اسے بھی نہیں آئے گا۔ جب ہم انسانی ضروریات انسانی اخلاقیات انسانی عظمتوں اور انسانی حقوق کو

روکتے ہیں، تو کسی شخص کی ہوس بڑھ جاتی ہے کہ مجھ تک تو آیا ہے آگے نہ جائے پائے۔ وہاں سے معاشی اخلاقی اقدار کا بھی وبال شروع ہو جاتا ہے۔ جو آگے ہے اس کی چیز رک جاتی ہے۔ وہ مٹنے سڑنے لگتا ہے۔ جس نے روکی ہوئی ہے سوزش اسے بھی ہونے لگتی ہے متورم ہونے لگتا ہے خراب ہونے لگتا ہے، اے کاش اس فلسفے کو ہم سمجھ سکیں۔ سمجھا سکیں اور یہ جو نعمتیں ہیں جو چیزیں ہیں ہم اپنے لئے جو چاہنے استعمال کریں جہاں دوسروں کا حق آجاتا ہے اسے آگے پہنچائیں، روکیں نہیں رکاوٹ نہ بنیں۔ اپنے لئے بڑے بڑے ذخیرے اور دوسروں کے لئے کچھ بھی نہ بچے یہ بڑی زیادتی ہے۔ یہی سبب ہے اس ساری خرابی کا۔

سوال :- آپ معاشرے میں کس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

جواب :- میں نے چار نکاتی پروگرام دیا ہے۔ صرف چار باتیں میری تمنا ہیں۔ سب سے پہلے معاشی انصاف اور مومن و کافر، نیک و بد کی تمیز سے بالاتر ہو کر حیثیت انسان ہر ایک کو اس کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ذرائع مباحہ کے جائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ وزیراعظم کے لئے تین سو کروڑ کا گھر بنائیں۔ اور دوسرا آدمی تین سو کی جھونپڑی نہ بن سکے۔ یہ زیادتی ہے ایک اپنے لئے جائز وسائل سے روزی پیدا کرے اچھی نعمتیں بنائے، لیکن جو دوسروں کے حقوق ہیں ان پر محل تعمیر نہ کرے بلکہ ایسا معاشی نظام ہو جو حیثیت انسان اللہ کی مخلوق ہوتے ہوئے ہر ایک تک معاشی وسائل پہنچائے۔ اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ جاننے کی ضرورت ہے ایسا تعلیمی نظام ہو جس کا ایک نصاب ہو ایک Status ہو اور ہر ایک کے لئے ہو۔ جس میں ٹیلنٹ ہو بچے میں چاہے وہ گداگر کا بچہ ہے وہ گزریئے کا بچہ ہے کسان کا ہے امیر کا ہے غریب کا ہے جس میں ٹیلنٹ ہے وہ ترقی کرے۔ پھر اس سارےوازن کو قائم رکھنے کے لئے عدل کی ضرورت ہے۔ کہ جو جس کے حقوق میں دخل

اندازی کرے، وہاں انصاف ہو اور انصاف میرے نزدیک یہ ہے کہ جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے اصول بتایا ہے اس کے مطابق انصاف ہو، تین باتیں۔ اب اس کو دیکھنے کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹن ایک ادارہ ہو کہ ہر چیز اپنی جگہ صحیح کام کر رہی ہے۔ اسے حکومت کہتے ہیں۔ حکومت سازی کا وہ طریق اپنایا جائے۔ جو موزوں ہے بہترین ہے اور جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے پسند فرمایا ہے۔ اور وہ وہی جمہوریت ہے حقیقی جمہوریت وہ ہے جو محمد رسول اللہ اور اسلام نے دی۔ جب لوگ حضرت عمرؓ کا دامن گلی میں پکڑ لیتے تھے، تب امریکہ، انگلند تھا اور یورپ کے لوگ غاروں میں رہتے تھے، اور کسریٰ اور قیصر فرعون نے ہوئے تھے اور کہیں عدل نہیں تھا۔ کوئی دامن نہیں پکڑ سکتا تھا سلطان کا۔ یہ چار معمولی سی باتیں ہیں۔ کاش کوئی کر گزرے۔

سوال :- شکر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب :- شکر یہ ہے کہ جب ہندے کو یہ اور اک ہو جائے کہ وہ تو شکر کرنے سے بھی قاصر ہے اور یہ بڑی محنت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

سوال :- وہ کونسا رنگ ہے جسے اللہ کا رنگ کہتے ہیں؟

جواب :- اللہ کریم ہے۔ اللہ ستار العیوب ہے۔ اللہ غفور ہے۔ اللہ جبار ہے اللہ قہار بھی ہے۔ اگر انسان دوسروں کے لئے کرم کا باعث بن جائے۔ اگر انسان دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ احساس ہو اسے۔ دوسروں کو خوشیاں دینا چاہے اور جہاں ظلم ہو وہاں اللہ کے جبر و قہر کی تصویر بن جائے۔ جب تک ظلم رک نہ جائے۔ افراد سے نہ لڑے۔ ہمارے نہ لڑے۔ ہماری سے لڑے، ظلم سے لڑے۔ ظلم کو روک دے۔ اگر یہ صورت حال بن جائے۔ اللہ نے کہا۔

”یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ کے رنگ سے خوبصورت رنگ کون سا ہو سکتا ہے۔“

وہ اوصاف باریؑ ان کی جھلک انسان کی اپنی حیثیت کے مطابق آجائے۔ دیکھیں

سورج روشنیوں کا منبع ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا شیشے کا ہے۔ منکس تو کرتا ہے۔ سورج کو نہیں اک چھوٹی سی کرن کو تو کرتا ہے۔ مدد ایسے ہی آئینہ بن جائے۔ تہاں باری کا۔

سوال :- واسطی کی دنیا کیسی دنیا ہے اس دنیا کے لوگوں کی پہچان کیا ہے؟  
جواب :- یہ لوگ اپنی ج و جھج سے۔ اپنے کردار سے اپنی باتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان سے بات کیس سے چھیڑناں یہ ختم وہاں جا کر کرتے ہیں۔ دنیا کے کسی گوشے سے انہیں چلاؤ۔ انہیں آپ دوسری طرف چلاتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس طرف رہتی ہے۔ جہاں واسطی ہوتی ہے۔ یہ عجیب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ پر سکون اور ایک مرکز پر جتے ہوئے فصرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔

عبدالحمید عدم نے خوب کہا ہے

یہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں

آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

بہت مزے کے لوگ ہوتے ہیں ایک پورا جہان ہوتا ہے ایک مدد کے اندر موسموں کا تغیر و تبدل جھلی بارش پانی بدستہ پھر بہار آتی ہے پھول کھلتے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں یہ۔ ایک وقت میں بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں۔ دوسرے وقت میں بیٹھے نغمہ گارہے ہیں۔ تیسرے وقت میں بیٹھے ناراض ہو رہے ہیں چوتھے وقت میں بیٹھے منا رہے ہیں۔ عجیب سا ایک جہان ہوتا ہے ایک آدمی کے اندر ایک دنیا اور اس کا ہر رنگ موجود ہوتا ہے ایک فرد کے اندر۔ بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔

## اماں جی

والدہ حضرت ملک محمد اکرم اعوان صاحب

س :- آپ کی شادی کب ہوئی اور اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

ج :- میری شادی ۱۹۳۳ء میں ہوئی اور اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی۔

س :- کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟

ج :- میرے والد فوج میں کپتان تھے۔ میں انڈیا رڑ کی میں پیدا ہوئی۔ والد صاحب

دوران ملازمت آگرہ، دہلی، متھرا، ہمدان، الہ آباد، سہارن پور، لدھیانہ، انبالہ اور

رڑ کی رہے۔ اس طرح مجھے ان تمام جگہوں کو دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ اس وقت

فوج کے افسروں کی بڑی شان ہوتی تھی۔ میرے لبا جی، میرے بیٹے سے بھی زیادہ قد

آور اور جوان تھے۔ بہت رعب والی شخصیت تھی ان کی۔ انہیں بہت سی زبانوں پر

عبور حاصل تھا۔ انگریزی، فارسی، پشتو، اردو، عربی اور چینی زبان وہ بڑی روانی سے

بولتے تھے۔ میرے سر ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اور زمیندارہ کرتے تھے



بہت نیک اور پرہیزگار تھے اور اپنے علاقے کے مانے ہوئے طبیب تھے۔ وہ بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے اور ہمارے ان کے ماحول کا بہت فرق تھا۔ اسی لئے جب میرے والد صاحب نے میرا یہاں رشتہ کرنا چاہا تو والدہ نے بہت مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہاں شادی ہو۔ جب یہ بات چل رہی تھی تو میری پھوپھی ہمارے گھر آئیں۔ اور انہوں نے والدہ سے کہا۔ تم کیوں جھگڑتی ہو۔ یہ شادی ہونے دو۔ اس ماحول میں تمہاری آسائشوں کی عادی بیٹی نے رہنا تو بے نہیں اسی لئے جب یہ واپس آجائے گی تو میں اپنے بھائی کو مبارک باد دینے جاؤں گی کہ بیٹی واپس آگئی۔ میں نے اتفاق سے پھوپھی کی بان سن لی جو وہ دراصل بھائی کو طعنے کے طور پر کہنا چاہتی تھیں۔ بس میں نے اس بات کو دل میں رکھ لیا۔ اب جو بھی ہو گزارہ کرنا ہے۔ باپ کو طعنہ نہیں دلوانا۔ بس اس بات پر میں نے زندگی کا بڑی ہمت اور حوصلے سے سامنا کیا اور ہر نشیب و فراز سے گزر گئی۔

س :- جب شادی ہوئی تو حضرت جی کے والد صاحب کیا کرتے تھے ؟

ج :- وہ اس وقت کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ہمارے گھر بھی جو انٹ فیملی سسٹم تھا۔ میں اگرچہ بالکل ہی فرق ماحول سے آئی تھی، مگر وہاں آکر میں نے بڑی آسانی سے ایڈجسٹ کر لیا۔ اس لئے کہ میرے والد صاحب کی ٹریننگ ہی کچھ ایسی تھی۔ انہوں نے بہت ماز و نعم سے مجھے پالا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ عملی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں بھی پورا شعور دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں شری ماحول اور سولتوں بھری زندگی کے بعد ایک بالکل ہی پسماندہ اور مشکل ماحول میں آئی تو اپنی تربیت کی وجہ سے مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ کچھ اس زمانے کی قدروں میں پیار اور رکھ رکھاؤ بھی اتنا ہوتا تھا کہ انسان مادی طور پر مشکل حالات میں رہ کر بھی ذہنی طور پر نشان نہیں ہوتا تھا۔

س :- آپ کے کتنے بچے ہیں؟

ج :- میرے پانچ بچے تھے۔ سب سے بڑے اکرم پوتا ہیں۔ ان کے بعد چار بیٹے ہوئے۔ تین اللہ کو پیارے ہو گئے اور دو اللہ سلامت رکھے۔ میرے پاس ہیں۔

س :- جو بچے فوت ہوئے ان کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟

ج :- میرا ایک چھ ایک سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ دوسرا چھ تین سال کا تھا تو اللہ نے لے لیا۔ مگر میرا تیسرا بیٹا 'تین جوانی میں' اکیس برس کا تھا تو ہم سے ٹھہر گیا۔ عجیب حادثہ تھا وہ۔ خوش و خرم گھر میں بیٹھے تھے۔ وہ اپنے ریلوے کو چیک کر رہا تھا۔ گولی میگزین میں پھنس گئی۔ نکالنے لگا تو گولی چل گئی اور سیدھی اس کی آنکھ میں لگی۔ اور آنا فانا میری آنکھوں کے سامنے میرا چہرہ دم توڑ گیا۔ یہ اے کی بات ہے۔ وہ صدمہ ایسا ہے کہ جو بھلائے نہیں بھولتا۔

س :- حضرت جی کے بچن کے بارے میں بتائیں؟

ج :- گھر میں چونکہ یہ پہلے بچے تھے اس لئے بہت لاڈلے تھے۔ یہ دسمبر میں پیدا ہوئے تھے سخت سردی کے دن تھے 'مگر الحمد للہ میں نے انہیں ہمیشہ با وضو دودھ پلایا۔ کیونکہ میرے سر کھاتے تھے کہ اگر ماں با وضو ہو کر دودھ پلائے تو بچے بہت صالح ہوتے ہیں۔

پانچ سال تک ہم ذریعے (ڈھوک ٹیالہ) پر رہے۔ پھر میں نے ماموں جی سے

کہا۔ ہم گاؤں جانا چاہتے ہیں تاکہ بچے کو اسکول داخل کروا سکیں۔ انہوں نے کہا۔ پوتا انہیں گھر میں ہی پڑھالیتے ہیں۔ میں نے کہا۔ گھر میں کہاں پڑھائی ہوتی ہے۔ ہم انہیں اسکول میں پڑھائیں گے تاکہ یہ باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ میں چونکہ ایک مختلف ماحول سے آئی تھی اور اس زمانے میں 'میرے والد صاحب نے مجھے تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ کیا ہوا تھا' لہذا میں اپنے بچے کا وقت ضائع کرنے سے

حق میں نہ تھی۔ ماموں جی نے میری بات مان لی۔ اور ہم اوگ ڈھوک سے کچھ شفت ہو گئے۔ میں نے انہیں اسکول داخل کروادیا۔ جب یہ پانچ ماہ کے ہوئے تو ان کے والد فوج میں چلے گئے۔

س :- یہ کب کی بات ہے؟  
ج :- یہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے۔ دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ عراق چلے گئے اور دو سال کے بعد لوٹے۔

س :- حضرت جی اپنے چچن میں کیسے تھے کچھ ان کی تعلیم کے متعلق بتائیے؟  
ج :- بہت ذہین تھے۔ شرارتی بھی تھے۔ مگر ان کی شرارت میں بھی ذہانت نمایاں ہوتی تھی۔ سیٹی اسکول سے پرائمری کے بعد۔ انہوں نے نور پور سے مڈل کیا اور پھر پوچھال گورنمنٹ اسکول سے انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک میں انہوں نے بہت اچھے نمبر لئے۔ اس وقت یہاں کوئی کالج نہیں تھا۔ البتہ چکوال میں اسی سال ایک کالج بنایا کھلا تھا۔ انہوں نے وہاں داخلہ لے لیا اور جب ایف اے میں تھے تو میرے اباجی قتل ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد پریشانی کی ایسی لہر چلی کہ ہم بہت عرصہ اس سے نکل نہ سکے۔ انہی دنوں بیٹے نے کالج چھوڑا۔ اور گھر آگئے۔ ان دنوں ان کے والد صاحب نوکری پر تھے۔ ماموں ملازمت کرتے تھے۔ گھر میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اس مشکل وقت میں حالات کو سنبھالتا۔ یہ گو کم عمر تھے مگر ان میں کچھ ایسی قدرتی صلاحیتیں تھیں کہ سب نے انہیں بڑے کی حیثیت سے مان لیا۔ پھر مخالفوں نے انہیں جھوٹے قتل کے مقدمے میں پھنسا دیا۔ وہ دن بڑی آزمائش کے تھے۔ میں چکوال نیچنگ کا کورس کر رہی تھی۔ اور پٹا جیل میں تھا۔ مجھے یاد ہے سردیوں کی راتیں تھیں۔ اور میں ساری ساری رات کبل اوڑھ کر باہر کھڑی ہو کر سورہ مزمل پڑھتی تھی اور ان کے لئے دعا کرتی تھیں۔ خدا نے مجھے بے نوا کی سن

لی۔ اور یہ بہت جلد بری ہو گئے۔

س :- اس کے بعد انہوں نے تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا؟

ج :- جی نہیں۔ انہوں نے باقاعدہ کسی درس گاہ میں داخلہ نہیں لیا۔ مگر اپنے طور پر یہ مختلف علوم پر کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔

س :- کوئی ایسی یاد جو حضرت جی کے حوالے سے آپ بتانا چاہیں؟

ج :- بہت پرانی بات ہے۔ پارٹیشن سے بہت پہلے کی۔ ہمارے گاؤں میں ایک ذات تھی 'جنہیں راجا تیلی کہا کرتے تھے۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ جب کسی کے گھر چھ پیدا ہوتا تھا تو وہاں پہنچ جاتے تھے۔ گھر والوں سے بچے کی مبارک کا ایک روپیہ وصول کرتے تھے (ایک روپیہ مقرر ہوتا تھا) پھر اس کے بعد ان کی بھتیجی کو تیل سے بھر دیا جاتا تھا۔ وہ تمام تیل وہیں کھڑے کھڑے سر اور چہرے پر مل لیا کرتے تھے اور پھر بچے کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ ان دنوں ہمارے گاؤں میں اسے ایک رسم کے طور پر لیا جاتا تھا۔ مگر میں چونکہ ان چیزوں کو نہیں مانتی تھی 'میری ایک اپنی سوچ تھی' میں اس رسم کو عمدہ جہالت کی رسموں کی باقیات سمجھتی تھی 'اسی لئے' جب اکرم پٹا پیدا ہوئے 'تو میں نے راجا تیلی والی رسم کو ادا نہیں کیا۔ ان کی پیدائش کے پندرہ برس روز کے بعد 'میں ایک دن انہیں اٹھا کر گلی سے گزر رہی تھی 'تو آگے سے راجا تیلی آگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا 'لی لی یہ آپ کا چہرہ ہے۔ میں نے کہا 'ہاں یہ میرا چہرہ ہے۔ لی لی اسکے لیکہ دیکھوں۔ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے رکھائی سے جواب دیا اور آگے جانے لگی۔ تو اس نے مجھے روک لیا۔ لی لی 'ذرا رکو' مجھے تمھارا چہرہ خوں والا لگ رہا ہے 'ذرا دیکھنے دو۔ اس نے چہرہ مجھ سے لے لیا اور کہنے لگا۔ میں دیکھ رہا ہوں 'یہ عام چہرہ نہیں ہے۔ اس کا ستارہ بہت عروج پر رہے گا۔ مگر زندگی میں بہت مشکل بھی دیکھے گا۔ بہت جدوجہد کرنی پڑے گی اسے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا

اسے دینا مانے گی۔

اس وقت تو میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی، اس لئے کہ مجھے پتہ تھا۔ پیسے، ذرے کے لئے وہ اچھی اچھی باتیں کر کے لوگوں کو خوش کرتا ہے۔ مگر اب سوچتی ہوں، ہے تو سب خدا کی قدرت۔ اسکی رضا کے بغیر کچھ بھی ہونا ممکن نہیں۔ مگر راجا تیلی نے بھی جو کچھ کہا تھا، وہ بھی جھوٹ نہیں لگتا۔ شاید خدا کی ذات نے اسے بھی کوئی علم دے رکھا تھا۔

س :- حضرت جی کیسے جڑے ہیں؟

ج :- بہت اچھے جڑے ہیں۔ فرمانبردار تو وہ ہیں ہی، مگر ہم ماں جڑے میں روایتی ادب و آداب والا تعلق نہیں ہے۔ ہم میں دوستی ہے۔ بہت اچھی دوستی، میری چونکہ بیٹی نہیں ہے، اور اولاد میں سب سے بڑے یہی ہیں۔ تو انہوں نے مجھے کبھی بیٹی کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ تمام کاموں میں، میرے ہمراہ رہے، ہم نے دکھ سکھ ہمیشہ آپس میں بانٹا ہے۔ وہ میرے جڑے ہی نہیں میرے ہمراز بھی ہیں۔

س :- انہیں اس مقام پر دیکھ کر آپ کو کیسا لگتا ہے؟

ج :- ایک ماں اپنے بچے کی کامیابیوں کے لئے جو خواب دیکھ سکتی ہے۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ دنیاوی لحاظ سے تو جو ہے سو ہے؟ مگر روحانی طور پر اللہ نے انہیں جس منصب سے نوازا ہے۔ اسکا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے، کیونکہ میں سمجھتی ہوں دنیا میں عروج حاصل ہونا کوئی بڑا کام نہیں ہے، یہاں بڑے بڑے صاحب کمال آئے اور چلے گئے۔ مگر خدا کے راستے میں اس کے مقرب بندوں میں شامل ہونا اور خلق خدا کا دکھ بانٹنا ان کے لئے باعث ہدایت ہونا اصل شکر ہے۔ یقین کریں میرا توراں رواں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے مجھے ناچیز کو اتنا نوازا۔

## بڑی ملی ملی جی

س :- اجتماع کب شروع ہوا؟

ج :- اجتماع ہمارے ڈیرے سے شروع ہوا، ذھوک ٹیالا سے۔

س :- اس وقت کتنے لوگ اجتماع میں شریک ہوتے تھے؟

ج :- اس وقت چالیس پچاس کے قریب لوگ ہوتے تھے پھر ہم ذوالوال پلے سمئے وہاں

اجتماع ہوتا رہا اس کے بعد منار و اجتماع چلا گیا۔ اسکے بعد نور پور اجتماع ہوتا تھا ایک

اسکول میں اجتماع کا انتظام ہوتا تھا۔ حضرت جی اس وقت اسکول میں پڑھاتے تھے وہاں

تقریباً دو سال اجتماع رہا۔

س :- بڑے حضرت جی بھی آتے تھے؟

ج :- جی وہ بھی آتے تھے اس وقت ہم ذھوک پر تہوں لگا کر لوگوں کو فہمرا نے کا انتظام

کرتے تھے۔

س :- اس وقت حضرت جی ذکر کیا کرتے تھے؟

ج :- جی ہاں۔ وہاں ذہوک والے گھر میں ایک چھوٹی سی کچی کوٹھڑی ہوتی تھی جس کے فرش پر گھاس بچھا ہوتا تھا، حضرت جی بہت شدت سے چارپانچ گھنٹے مسلسل ذکر کیا کرتے تھے دوران ذکر کہنیاں زمین پر ٹیک دیتے تھے اور جب اٹختے تھے تو ان کی کہنیوں سے خون بہہ رہا ہوتا تھا۔

س :- کیا صبح و شام ذکر کیا کرتے تھے؟

ج :- صبح و شام تو ضروری تھا مگر رات کو زیادہ تر کیا کرتے تھے اور جب تھکتے تو چھوڑتے تھے۔ اللہ نے انہیں اسٹھما بھی اتا دیا ہے کہ عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

س :- کیا شادی سے پہلے بھی نماز پڑھتے تھے یا شادی کے بعد شروع کی؟

ج :- نماز تو انہوں نے شادی سے پہلے ہی شروع کر دی تھی اس وقت ان کی چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی تھی۔

س :- سنا ہے آپ سے حضرت جی نے پسند کی شادی کی تھی اور بہت جھگڑے بھی ہوئے تھے؟

ج :- آپ نے ٹھیک سنا ہے! ہم چونکہ آپس میں فرسٹ کزن بھی تھے اور میری مغلنی چچن میں ہی حضرت جی سے ہو چکی تھی۔ مگر بعد میں گھر والے اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ ان کی لڑائیاں جھگڑے چل رہے تھے اور دوسرا یہ ان دونوں کوئی کام بھی نہیں کرتے تھے۔ ہمارے ہاں چونکہ زیادہ تر لوگ فوج میں ہیں۔ تو میرے لئے اپنے ہی ایک رشتہ دار کا پرپوزل آیا جو آرمی میں تھے۔ وہ میری پھوپھی کے بیٹے تھے۔ انہوں نے کہا میں نے اس لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ تو اس طرح گھر

والوں کی مرضی تھی کہ یہاں سے رشتہ ختم کر کے دوسری جگہ کر دیا جائے۔ مگر جب اس بات کا حضرت جی کو علم ہوا تو انہوں نے شور مچا دیا پھر بہت ہنگامہ ہوا اور بالآخر حضرت جی کے دادا جی جو کہ میرے نانا تھے انہوں نے ہماری شادی کرادی۔

س :- آپ کی کیا مرضی تھی؟

ج :- بنتے ہوئے۔ میری کیا مرضی ہوتی۔ بیٹیوں کی کیا مرضی ہوتی ہے۔ جہاں ماں باپ کہیں۔

س :- سنا ہے بات کے بڑے کچے تھے؟

ج :- جی بات کے بڑے کچے تھے۔ دوستیوں میں بڑے سچے ہیں۔ دوستوں کے مسائل کو اپنا مسئلہ سمجھ کر۔ ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ جہاں طاقت کی ضرورت ہوتی تھی وہاں ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور جہاں مالی امداد کی ضرورت ہوتی وہاں بھی سب سے آگے آگے رہتے تھے۔ اپنے علاقے میں یہ سنگت کے بہت کچے مشہور تھے۔

س :- شادی کے بعد حضرت جی میں کوئی تبدیلی آئی؟

ج :- جی شادی سے پہلے بہت جھگڑے اور سخت ہوتے تھے۔ مگر شادی کے بعد ان میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ مزا جانیہ کچھ بدلنے لگے۔ بعد میں یہ سلسلے میں بھی آگئے شاید یہ ہی وجہ تھی کہ ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ آنے لگا۔

س :- بڑے حضرت جی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج :- بڑے حضرت جی بہت مہربان تھے۔ مجھ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ جب ہمارے پاس دھوکہ میں آکر ٹھہرا کرتے تھے تو میں ان کا کھانا اپنے ہاتھ سے دلاتی تھی۔ ان کے کپڑے خود دھو کر باہر بھجوا کرتی تھی۔ مجھ سے بہت خوش تھے۔ اور بعد میں حضرت جی سے کہا کرتے تھے کہ شادی تو آپ نے کر لی ہے مگر آپ نے انہیں خوش رکھا ہے۔



س :- حضرت جی کی دوسری شادی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج :- کول مائنگ کے کام کے سلسلے میں یہ اکثر منارہ جایا کرتے تھے۔ ان کا دفتر وہیں تھا۔ چھوٹی لی لی کے بھائی کے ساتھ ان کا بزنس تھا۔ اور وہ چونکہ سلسلے کے ساتھی بھی تھے تو ان کے گھر بھی آتا جاتا تھا۔ مگر ایک بات میں واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ حضرت جی کا اس وقت شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا، ہم اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔ یہ تو خبر نہیں کیا ہوا۔ بس قسمت کہہ لیں، چند ایک ایسی باتیں ہوں کہ ضد میں آکر انہوں نے شادی کر لی۔

س :- شادی کا سن کر آپ کو کیسا لگا؟

ج :- مجھے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ انہوں نے منارہ شادی کر لی ہے۔ پہلے تو یقین ہی نہیں آیا، ذہن کو ایک دم سے اتنا چھچھ لگا کہ بعد میں بہت دیر لگی مجھے سنہلنے میں۔ مگر ایک بات ہے کہ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں ہم میں فرق نہیں رکھا۔ مساوی سلوک رہا ہے ان کا دونوں گھروں سے۔ حقوق و فرائض کے علاوہ ان کے رویے میں بھی ایسی کوئی تبدیلی میں نے نہیں دیکھی۔ جس پر مجھے گمان ہوتا کہ دوسری شادی کی وجہ سے ہے۔ ہاں بس ایک دکھ تو ہے اور رہے گا، اور وہ حقیقت بھی ہے۔ کہ وہ تقسیم ہو گئے۔ اور اتنا اچھا خاندان تقسیم ہو جائے تو کون عورت ہے جو اس محسوس نہیں کرے گی۔

س :- کبھی آپ کی چھوٹی لی لی جی سے لڑائی بھی ہوئی؟

ج :- بالکل نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا اور جب آپ کسی کو تسلیم کر لیں تو پھر جھگڑا کس بات کا۔

س :- حضرت جی کی کوئی عادت آپ کو زیادہ اچھی لگتی ہے؟

ج :- یہ بہت خیال رکھنے والے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں کا خیال رکھتے

ہیں۔ ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بتائے بغیر سمجھ جاتے ہیں۔ اب حالانکہ ان کی زندگی بہت مصروف ہے۔ سلسلہ 'جماعت اور دوسری بے شمار مصروفیات' مگر ان کے باوجود ہر ایک کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ ہر ایک کی سنتے ہیں سب ان سے خوش ہیں۔

## انٹرویو۔ چھوٹی بی بی سے

س :- آپ حضرت جی کو شادی سے پہلے بھی جانتی تھیں؟

ج :- حضرت جی کا میرے گھر والوں سے پرانا ملنا ملنا تھا۔ میرے نانا، ماموں اور چچا کیساتھ ان کی بڑی اچھی جان پہچان تھی۔ خوشی غمی پہ سب اکٹھے ہوتے تھے۔ میں اپنے والد کی تیسری بیوی سے اولاد ہوں۔ پہلی دو بیویوں سے ان کے اولاد نہیں تھی۔ ہم دو بہن بھائی ہیں۔ میرے بھائی حضرت جی کے ایک سال بعد جماعت میں آئے۔ وہیں حضرت جی سے ملاقات ہوئی اور ساتھی کی حیثیت سے دوستی کا آغاز ہوا۔ میں اس وقت پانچویں میں پڑھتی تھی۔ میرے والد کا علاقے کے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔

س :- حضرت جی کی پہلی شادی کے بارے میں بتائیں؟

ج :- ان کی پہلی شادی غالباً ۱۹۶۰ء میں ہوئی اس وقت یہ جماعت میں آپکے تھے۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ ان کے ایک سال بعد میرے بھائی بھی جماعت

میں شامل ہو گئے پھر ان کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا۔

س :- کیا گھر کے اندر آتے تھے؟

ج :- گھر کے اندر نہیں وہ گھر کے اوپر والے حصے میں سیڑھیوں کے پاس چو بارہ تھا وہیں آتے تھے۔

س :- آپ کی شادی پہلی شادی کے بعد کب ہوئی؟

ج :- اس وقت ان کے تین بچے تھے جب شادی ہوئی۔

س :- یہ کیسے ہوئی؟

ج :- یہ آپ کو بتاؤں گا۔ یہ لوح محفوظ پر لکھا تھا اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا میرے ابا جی اپنے علاقے کے مشہور آدمی تھے میں بچوں سے کہتی ہوں جس طرح آپ کے والد کا نام ہے۔ اسی طرح آپ کے نانا بھی بہت اچھے آدمی تھے اپنے علاقے کے۔ میرے رشتے کا جھگڑا چلتا رہا ابا جی اپنے رشتہ داروں میں چاہتی تھیں ابا جان اپنے رشتہ داروں میں چاہتے تھے۔ اسی کھینچا تانی میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ابا جان فوت ہو گئے۔ تو بڑے حضرت جی نے (مولانا اللہ یار خاں) ابا جی سے کہا ان کا جہاں بھی مقدر ہو گا فوری فیصلہ ہو گا۔ یعنی پھر شادی جلدی ہو جائے گی دیر نہیں لگے گی۔ میری عمر تیس برس کی تھی جب شادی ہوئی۔

س :- حضرت جی کا گاؤں تو سیتھی ہے پھر منارہ میں آپ کی رہائش کس طرح ہوئی؟

ج :- ویسے میں سمجھتی ہوں بڑے حضرت جی کو اس فیصلے کا پتہ تھا وہ صاحب حال جو تھے۔ انہوں نے خود یہ رشتہ کر لیا تھا۔ اور اس گھر کی بنیادوں میں اپنے ہاتھ سے دو اینٹیں لگائی تھیں۔ اسی وجہ سے تو ہم یہ جگہ چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اس شادی نے ہونا ہے اور ہو کر رہے گی۔ جھگڑے بھی ہوں گے شور بھی مچے گا مگر ہو کر رہے گی۔ بلکہ اس ضمن میں مجھے یاد ہے کہ میرے

رشتہ داروں میں سے کسی نے میرا رشتہ مانگا میری امی نے حسب روایت انکار کر دیا تو حضرت جی (لی لی جی حضرت جی کو حضرت جی ہی کہتی ہیں شیخ کے حوالے سے) کی میری امی سے حث ہو گئی۔ کہ آخر آپ کیوں بیٹھی کا رشتہ نہیں کرتیں۔ کیوں اسے بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔

س :- یعنی اس وقت تک آپ سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا؟  
ج :- جی ہاں۔

س :- شادی کے بعد آپ نے حضرت جی کو کیسا پایا؟

ج :- الحمد للہ۔ وہ بہت اچھے ہیں انہوں نے دونوں فیملیز کو بہت خوب رو رتی سے رکھا ہے میں چونکہ بعد میں آئی تھی وہ پہلے سے تھیں مگر ہمیں انہوں نے ایک دن بھی ایک جگہ پر اکٹھا نہیں رکھا، ان کا گھر الگ تھا اور میرا گھر الگ۔ ان کے حقوق کے معاملے میں، میں نے کبھی مداخلت نہیں کی اور میرے حقوق کے معاملے میں وہ کبھی نہیں بولیں۔ تو اس طرح وقت بہت اچھا گزرا اور میں سمجھتی ہوں اس میں حضرت جی کی فراست اور معاملہ فہمی کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے ساری عمر تمام معاملات اتنی خوش اسلوبی سے نبھائے ہیں کہ کسی کو کسی کی حق تلفی کا احساس تک نہیں ہوا۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش اور مطمئن ہیں۔

س :- سنا ہے پہلے اجتماع آپ کے گھر ہوتا تھا اس کے بارے میں بتائیں؟

ج :- جی پہلے بہت عرصہ اجتماع ادھر منارہ میں ہوتا تھا۔ پندرہ بیس ساتھی ایک وقت میں ہوتے تھے بڑے حضرت جی کا کھانا میں خود اپنے ہاتھ سے بناتی تھی۔ اسکے بعد جماعت پھیلنا شروع ہوئی تو اب دیکھیں تعداد ہزاروں سے بھی نکل کر لاکھوں میں پہنچ گئی ہے۔

س :- آپ کام سے تنگ نہیں آتی تھیں؟

ج :- جی بالکل نہیں۔ میں بڑی خوشی سے سب کام کرتی تھی اور بڑے حضرت جی فرمایا کرتے تھے کہ منارہ کے کھانے میں شفاء ہے۔

س :- سنا ہے حضرت جی آپ کے پاس قیام فرمایا کرتے تھے ان کے بارے میں بتائیں؟

ج :- بڑے حضرت جی ہمارے پاس اجتماع کے علاوہ بھی قیام فرماتے تھے۔ بعد میں وہ کمزور ہو گئے اور اکثر بیمار رہنے لگے تو کمر کے اندر ہی زیادہ تر رہتے تھے۔ یہیں انگریز آتے تھے جو ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے تھے آپ چونکہ ان کے ساتھ ان کی زبان میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ تو یہ کام ہمارے حضرت جی کیا کرتے تھے اور باہر کے دورے یعنی تبلیغ کے سلسلے میں بھی حضرت جی ہی باہر جایا کرتے تھے۔

س :- حضرت جی کے بارے میں بتائیں انہیں غصہ آتا ہے کہ نہیں؟

ج :- (مسکرا کر) اول تو آتا ہی نہیں اگر آئے تو کمر کے گیٹ تک جاتے جاتے ختم ہو جاتا ہے۔

س :- کھانا کس طرح کا پسند ہے؟

ج :- ہر طرح کا کھانا شوق سے کھاتے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ تازہ ہونا چاہئے باقی سالن نہیں کھاتے۔ یعنی دونوں وقت تازہ سالن ہونا چاہئے اور اب تو بہت سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ زیادہ تر سبزیاں اور دالیں گوشت چھوڑ دیا ہے کبھی کبھی مرغی کا گوشت وہ بھی Boneless ہو تو کھا لیتے ہیں۔

س :- آپ کو حضرت جی کی سب سے اچھی عادت کونسی لگتی ہے؟

ج :- صبر کی عادت۔ کچھ بھی ہو جائے برداشت کئے جاتے ہیں۔ میں نے ان جتنا صابر انسان آج تک نہیں دیکھا۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کے سامنے چاہے سونے کے ڈھیر لگا دو ساری دنیا کا اسباب رکھ دو وہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔ اس

معالے میں میری عادت بھی ان سے ملتی جلتی ہے ہم میں اتنا توکل اتنی قناعت ہے کہ طبیعت کسی طرف مائل ہی نہیں ہوتی۔ قلب اتنا مطمئن ہے کہ کسی طرف نگاہیں نہیں اٹھتی۔

س :- بڑے حضرت جی کی وفات کے بارے میں بتائیں؟

ج :- ہمارے گھر اس وقت فون نہیں تھا ساتھ والے گھر سے جب فون آیا کہ بڑے حضرت جی کا وصال ہو گیا ہے۔ تو اس وقت سے ایک گھنٹہ پہلے حضرت جی خاموشی سے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وجودی طور پر تو وہ یہاں ہیں مگر روحانی طور پر کہیں اور ہیں یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔

جب شیخ راولپنڈی فوت ہوئے اور ہمیں اطلاع ملی تو میں نے حضرت جی کو بہت دفعہ بلایا انہیں آوازیں دیں بتایا کہ حضرت جی کا انتقال ہو گیا ہے پتوں نے بھی انہیں آوازیں دیں مگر وہ بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ بعد میں بتاتے ہیں کہ مجھے آپ کی آوازیں بہت دور سے آرہی تھیں۔

پھر ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے وہ ابدیدہ ہو گئیں بمشکل ان کے منہ سے نکلا کہ خبر سن کر میں نہ زمین پر تھی اور نہ آسمان پر عجیب حالت تھی میری۔ ان کا اور میرا تو باپ بیٹی والا رشتہ تھا۔ بلکہ وہی تو تھے جو میرے سر پرست تھے جب بھی بیمار ہوتے تھے، ہمارے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ میں دو دو ملازموں کی موجودگی میں بھی ان کے کمرے کی صفائی خود کرتی تھی۔ بستر جھاڑتی تھی، کمرہ ٹھیک کرتی تھی اور جو کوزا لکھتا تھا اسے صحن میں لگے کیلے کے درخت کے پاس کچی زمین میں ڈال دیتی تھی۔ کہ اس پر کسی کا پاؤں نہ پڑے اور بے ادبی نہ ہو۔ وصال سے کچھ عرصہ پہلے ان کے جسم سے سکن اترنا شروع ہو گئی تھی انوارات کی وجہ سے ایک دفعہ بستر جھاڑتے ہوئے میں نے چارپائی کے پاس فرش پر دیکھا تو کچھ سفید بال اور سکن کے

چٹکے پڑے تھے۔ پھر تو جیسے انسان پلکوں سے چلتا ہے میں نے ایک ایک بال چٹا چٹکے  
اسنے کئے اور انہیں باندھ کر اپنے زیور والے ڈبے میں محفوظ کر لئے۔ جب یوے  
حضرت جی نے وفات پائی تو پورے چھ مہینے میں بے قراری کے عالم میں چکڑا چکڑ  
لگاتی رہی میری حالت کے پیش نظر حضرت جی مجھے لے کر جاتے رہے مجھے مہر ہی  
نہیں آتا تھا۔

س :- آپ کے پاس زیادہ ٹھہرا کرتے تھے ؟

ج :- جی بہت زیادہ ! اگر کوئی ان سے پوچھتا تھا کہ آپ کو کوئی چیز عزیز ہے تو پہلے  
نمبر پر وہ حضرت جی کا نام لیتے تھے اور دوسرے نمبر پر میرا بہت پیار تھا انہیں ہم  
سے۔

س :- آپ کے بچے ذکر کرتے ہیں ؟

ج :- جی ماشاء اللہ چاروں بچے ذکر کرتے ہیں اور مجھے اس چیز کی دلی خوشی ہوتی ہے  
میں ان سے اکثر کما کرتی ہوں کہ تمہارے پاس ایک سمندر ہے اس سے جتنی چاہو  
پاس بھراؤ تم لوگ خوش نصیب ہو کہ تمہیں وقت مل رہا ہے فیض حاصل کرنے کا۔

س :- آپ حضرت جی کو حضرت جی کہتی ہیں جب کہ وہ آپ کے شوہر ہیں اسکی  
وجہ ؟

ج :- مجھ سے کئی لوگ یہی سوال کرتے ہیں۔ کہ آپ اپنے میاں جی کو حضرت جی  
کیوں کہتی ہیں۔ تو میں انہیں ہمیشہ یہی جواب دیتی ہوں کہ میاں تو وہ میرے ہیں اور  
وہ بہت آئینہ دل میاں ہیں مگر اسکے علاوہ وہ میرے شیخ بھی تو ہیں میں انہیں اس  
حوالے سے حضرت جی کہتی ہوں۔

س :- کیا آپ کو پتہ تھا کہ جماعت کی قیادت حضرت جی کو ملے گی ؟

ج :- جی کافی حد تک ہم لوگ جانتے تھے دراصل دو اور ساتھی بھی تھے جنہیں یہ



گمان تھا مگر بڑے حضرت جی یہ فرمایا کرتے تھے ان میں ایک تو ذات کے جوابدہ تھے اور دوسرے شاعر تھے بڑے حضرت جی فرمایا کرتے تھے یہ ؟ ہجاء احوال ہی اٹھا سکتے ہیں بڑے حضرت جی بھی احوال تھے۔

س :- آؤنگ کے لئے جاتے ہیں آپ لوگ ؟

ج :- جب بھی حضرت جی کے پاس وقت ہوتا ہے تو ہمیں پھرانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں بے پناہ قدرتی حسن ہے آپ جہاں جائیں ایک نئی قسم کی خوبصورتی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم لوگ اکثر شام کو کپکنگ کے لئے باہر بنٹل اور پہاڑوں میں جاتے ہیں۔ حضرت جی کو فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے۔ چوں کی تصویروں کیچتے ہیں۔ وہیں ہم لوگ ہانچنگ کرتے ہیں دور تک پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

س :- چپوں کی آزادی کے قائل ہیں یا نہیں ؟

ج :- بالکل قائل ہیں۔ انہوں نے چپوں کو شکار کھیلنے سے لے کر کارڈرائیو کرنے تک خود سکھایا ہے اور انہیں خوشی ہوتی ہے کہ ان کی بیٹیاں خود اعتماد ہیں اور روانہتی سوچ سے دور ہیں۔

س :- آپ ذکر کرتی ہیں ؟

ج :- جی۔ الحمد للہ۔ میں اس وقت سے ذکر کرتی ہیں جب سے میرے بھائی جماعت میں آئے تھے۔ میں اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ میرے والد صاحب کی عمر اس وقت زیادہ تھی۔ اکثر بیمار رہتے تھے۔ میں رات کو ان کی ٹانگیں دبانے کے لئے کمرے میں جاتی تو لائٹیں اٹھا کر باہر رکھ دیتی۔ اور انہیں دبانے کے دوران ذکر کرتی رہتی یہ روٹین اب تک اسی طرح جاری ہے۔ اب ہمارے چوں میں بڑی بیٹی آسیہ اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ بہت جہن سے اس نے تہجد اور ذکر شروع کر دیا تھا مجھے یاد نہیں اس نے کبھی اس معمول میں مانع کیا ہو۔

## بہو سے باتیں

س :- آپ نے حضرت جی کو بطور سر کیسا پایا؟

ج :- چار سال ہو گئے ہیں میری شادی کو میں نے انہیں ہر لحاظ سے آئیڈیل اور پرفیکٹ انسان پایا میں نے اب تک ان کا کوئی پہلو ایسا نہیں دیکھا جس میں کچھ کمی ہو۔ ہر لحاظ سے مکمل۔ اماں جی نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ As a husband آئیڈیل انسان ہیں میں کہتی ہوں۔ وہ حیثیت سر آئیڈیل انسان ہیں۔

س :- ان کی کونسی عادت اچھی لگتی ہے؟

ج :- ان کی یہ بات سب سے اچھی لگتی ہے کہ وہ دوسروں کی چھوٹی سے چھوٹی Feeling کو سمجھتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو Celebrate کرتے ہیں۔ ان احساسات کو سمجھنا جن تک عام آدمی پہنچ ہی نہیں سکتا اور پھر اس صورت میں کہ جب آدمی اتنی ذمہ داریوں میں گمراہ ہوا اتنے بھگیزے ہوں اور سب کو اتنا ٹائم دینا

بہت مشکل ہے۔

س :- ساس سر کا Relation Ship کیسا ہے ؟

ج :- وہ بہت کیئر کرتے ہیں جہاں تک میں نے دیکھا ہے۔ اماں جی کے ساتھ ان کا  
 آئیڈیل 'Relation Ship' ہے۔

س :- آپ جب سے مہیا کر آئی ہیں۔ ان کی رہائش دار العرفان میں ہوئی ہے وہ کم کم  
 ہی یہاں آتے ہیں ؟

ج :- جی یہ تو ہے مگر وہ جتنا وقت بھی آتے ہیں۔ وہ اتنا بھر پور ہوتا ہے کہ کسی کی کا  
 احساس نہیں ہوتا یہاں وہ مکمل طور پر ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔

اور ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ دل میں چھپی ہوئی باتیں بھی جان  
 لیتے ہیں یعنی وہ باتیں جو صرف ایک عورت ہی عورت کی سمجھ سکتی ہے انہیں اس کا  
 ادراک بھی ہو جاتا ہے۔

## انسٹریو

ملک بشیر اکرم اعوان

۱۔ حضرت جی کو حیثیت والد آپ نے کیسا پایا؟

جواب۔ سب بہن بھائیوں میں میرا نمبر پہلا ہے چنانچہ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے وہ غالباً 1966، 67 کا زمانہ تھا کچھ خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے ہم لوگ گاؤں سے باہر ڈیرہ پر رہائش پذیر تھے، اس زمانے کی جو سب سے پہلی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جو بڑے حضرت جی کے حوالے سے ہے کہ سلسلہ عالیہ کے سالانہ اجتماع کا آغاز غالباً وہیں سے ہوا تھا، وہ منظر ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ حضرت جی (حضرت مولانا اللہ یار خانؒ) گھوڑے پر سوار ہیں اور پندرہ بیس افراد ان کے ساتھ ہیں جو پیدل چل رہے ہیں ان حضرات میں سے انکل خذاش راجہ یوسف صاحب اور حافظ عبدالرزاق صاحب مجھے یاد ہیں اور اب بھی کبھی کبھی ان حضرات سے اس زمانے کی باتیں کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔

۲۔ چین کا کوئی ایسا واقعہ جو حضرت جی کے حوالے سے ذہن میں محفوظ ہو؟

جواب: ان کو حیثیت والد چمن سے بہت شفیق اور انتہائی دوستانہ ماحول میں دیکھا جائے اور یہ بے تکلفی ان کے مزاج کا حصہ ہے، بچوں کے ساتھ سختی یا پابندی تو ان کی طبیعت میں بالکل بھی نہیں ہے۔ چمن میں ہم لوگ اپنے چچا جان سے ڈرا کرتے تھے مجھے بالکل یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی ان سے ڈانٹ کھائی ہے بلکہ مجھے یاد ہے کہ وہ دینی دادی جان کا تعلق درس و تدریس کے شعبہ سے رہا ہے اور میں نے پرانہ ہی سبک ان سے پڑھا ہے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت میرا مزاج چمن سے ذرا سنجیدہ تھا تو اب کو ان سے عموماً یہ شکایت ہوتی تھی کہ آپ نے میرے بیٹے کو بزرگ بنا دیا ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو خاندانی حالات و واقعات اور علاقائی مجبوریوں کی وجہ سے سیجورٹی پر اہم کو ہمیشہ والد محترم کی زندگی کا حصہ دیکھا اس وقت ہمارے علاقے میں چلی نہیں تھی اسکے باوجود وہ سخت گرمی میں بھی ہمیشہ کمرہ بند کر کے سوتے تھے اور انہوں نے کبھی گرمی کی شکایت نہیں کی۔

غالباً 1968ء کا واقعہ ہے سردی کا موسم تھارات کے وقت ہم لوگ سو رہے تھے کہ خاندانی دشمنی کی وجہ سے کچھ لوگوں نے گھر پر حملہ کر دیا، ان کی آنکھ کھل گئی کافی فائرنگ ہوئی مقابلہ ہوا وہ لوگ بھاگ گئے، ایک آدمی کے جوتے وہاں رہ گئے جس سے اندازہ ہوا کہ کون لوگ تھے، لیکن مجھے یہ واقعہ ایک اور حوالہ سے یاد رہ گیا جب فائرنگ ہوئی تو پڑوس میں میاں بھوی تھے وہ ابھی بھی زندہ ہیں اور کافی عمر رسیدہ ہیں، اس خاتون نے کمرے کو اندر سے تالا لگایا اور چالی اندھیرے میں کہیں ادھر ادھر پھینک دی اب بابا اس کو کمرے دروازہ کھولو، چالی مل نہیں رہی تھی وہ کیسے کھولتی وہ میاں بھوی ساری رات لڑتے رہے اور صبح ان کو دروازہ توڑ کر باہر نکالا۔

۳۔ والد اور والدہ کے باہمی تعلق کو آپ نے کیسا پایا؟

جواب: اپنے والدین کا باہمی تعلق جو میں نے دیکھا ہے اس میں کسی بد مزگی یا ٹکرا

کا بھی تصور نہیں ہے لڑائی جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے والد محترم کی دوسری شادی کے باوجود آج تک اپنی والدہ کی زبان سے کوئی شکایت نہیں سنی، اگر کوئی مسئلہ نہ بھی ہو تو بھی ہمارے معاشرے میں خصوصاً صغیر میں شاید ہندوانہ اثرات کی وجہ سے دوسرے مسلمان نمک کی نسبت یہ چیز عموماً مسائل کھڑے کر دیتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ والد محترم کی شخصیت کا اثر ہے کہ الحمد للہ نہ صرف ہمارے والدین بلکہ بہن بھائیوں میں بھی سرے سے اس کا کوئی تصور نہیں۔

۴۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ روحانی اور سیاسی مسرو فیات کی وجہ سے، حضرت جی آپ کو وہ توجہ نہیں دے سکے، جو ایک عام باپ اپنے بچوں کو دیتا ہے؟  
جواب: یہ ضرور ہے کہ والد محترم کی مسرو فیات بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی شخصیت اتنی ہر جہت ہے کہ وہ جتنا بھی وقت فیملی کو دیتے ہیں اور جو دوستانہ ماحول ان کی موجودگی سے بننا ہے وہ وقت کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتا وہ اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اپنی تمام مسرو فیات کے باوجود کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے ہمارے بچے ہم سے زیادہ ان کے گرویدہ ہیں۔

۵۔ آپ کو حضرت جی کی شخصیت کا کونسا پہلو زیادہ متاثر کرتا ہے؟

جواب: ان کا انتہائی پر اعتماد اور با عمل ہونا (Practical) ہونا۔

۶۔ ان کی روحانیت کے حوالے سے کوئی ایسا واقعہ، جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟  
جواب: دس بارہ سال پہلے کی بات ہے گلبرگ لاہور میں ہم تاج رحیم صاحب کے گھر ناشتے پر گئے، گلوکار اخلاق احمد جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ ان کے پڑوسی تھے۔ وہ وہاں آگئے ہمساری سے ان کا بہرہ حال تھا وہ ان دنوں انگلینڈ سے مایوس ہو کر واپس لوٹے تھے انہوں نے وہ تعویذ والا پانی پینا شروع کیا اور تین چار مہینے کے اندر وہ بارمل ہو گئے اس کا اعتراف انہوں نے خود انٹرویو میں بھی کیا۔

۷۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی جو تصویر حضرت جی نے آپ کو دکھائی وہ صحیح ہے یا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟

جواب: میرے خیال میں اس دور میں دین اور دنیا دونوں کے حوالے سے جو توازن والد محترم کی شخصیت میں نظر آتا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے اور یہ بہت مشکل کام ہے۔  
۹۔ حضرت جی کی روحانی تعلیمات کو آپ کتنا Follow کرتے ہیں؟

جواب: جہاں تک آئیڈیالوجی کا تعلق ہے تو سو فیصد اور عملی طور پر میں اپنی حد تک کر سکتا ہوں کہ جتنا ہم کر سکتے ہیں، مواقع اور تعلق کی وجہ سے اتنا شاید نہیں کر سکے۔  
اللہ ہمت اور توفیق دے، لیکن ان کی شخصیت کا یہ اثر ضرور ہے کہ زندگی میں تقصیر نہیں ہے جو بے سامنے ہے۔

۱۰۔ ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہونا آپ کو کیسا لگتا ہے؟

جواب: ظاہر ہے بہت اچھا لگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کوئی خاص مخلوق نہیں سمجھا یہ شاید والد محترم کے مزاج کا اثر ہے کیونکہ وہ خود بالکل نارمل لائف گزارتے ہیں اور پروٹوکول کے قطعاً قائل نہیں ہیں۔

۱۱۔ سیاست روحانیت، ادب اور کاروبار میں سے آپ کو ان کی کونسی صفت زیادہ اچھی لگتی ہے؟

جواب: روحانیت، کیونکہ ان کے باقی تمام شعبہ ہائے زندگی پر سب سے زیادہ اثر انہی چیز کا ہے۔

۱۲۔ بطور شاعر اور ادیب آپ کو حضرت جی کیسے لگتے ہیں؟

جواب: ادب سے مجھے دیے بھی دلچسپی ہے اور کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا ہوں اب کی جتنی تحریریں ہیں شاعری ہو یا نثر ان میں ایک روانی اور تسلسل ہے اور روحانیت کے اثرات اس کو عام شاعری اور ادب سے منفرد چیز بنادیتے ہیں۔

(چھوٹی بی بی جی کے بھائی)

حاجی خدا بخش صاحب

سوال۔ آپ سلسلہ میں کب آئے؟

جواب۔ یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے اعلیٰ حضرت، سلسلہ میں کسی کو بڑی مشکل سے شامل کرتے تھے۔ میرے لئے حضرت جی مدظلہ نے چھ مہینے تک سفارش کی تھی تب کہیں جا کے حضرت جی "مانے" تھے؟

سوال۔ کیا آپ جانتے تھے کہ مولانا اللہ یار خاں صاحب کے بعد مولانا محمد اکرم اعوان صاحب ہی سلسلے کے شیخ نہیں گئے؟

جواب۔ میں کیا یہ بات تو سب جانتے تھے

سوال۔ کس طرح سے؟

جواب۔ وہ یوں کہ جماعت میں کوئی دوسرا شخص ان کے پائے کا نہیں تھا نہ زہد و تقویٰ میں اور نہ ہی منازل میں یہ پرہیزگاری، مراقبات، مجاہدات اور مالی قربانیوں



میں سب سے آگے تھے۔ جماعت پہ سب سے زیادہ وقت اور پیسہ انہوں نے ہی خرچ کیا ہے۔ مجاہدات میں ان کا یہ عالم تھا کہ یہ ہم سب سے دو گنٹھ پہلے اٹھ کر لطائف کرنے شروع کر دیتے تھے ہم دو گنٹھ بعد جا کر کہیں ان کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ یہ چھ گنٹھ تک لگا مار ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ اعلیٰ حضرت نے زندگی ایام میں ہر ملنے والے سے یہ کہا کہ "جاتے ہوئے اکرم سے ملتے جاؤ" وہ انہیں بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کا مقام ان کے خلیفہ والا تھا۔

سوال۔ حضرت جی آپ کے رشتہ دار بھی ہیں اور شیخ بھی تو آپ کو یہ کیسا لگتا ہے؟  
جواب۔ وہ میرے شیخ پہلے ہیں اور رشتہ دار بعد میں۔ میں ان کا ادب اسی طرح کرتا ہوں جس طرح ایک مرید کو کرنا چاہیے۔ اس لئے بھی کہ میں ان کے مقام کو جانتا ہوں ان کے مرتبے سے واقف ہوں لہذا مجھے ان کے رشتہ دار ہونے سے زیادہ ان کا مرید ہونے پہ فخر ہے۔

سوال۔ حضرت جی کے بارے میں (حیثیت شیخ) آپ کو کوئی ایسا واقعہ یاد ہے جو آپ ہمیں سنا چاہیں۔

جواب۔ یوں تو بے شمار واقعات ہیں لیکن دو واقعات ایسے ہیں جن کی مثال تاریخ تصوف میں نہیں ملتی۔

ایک واقعہ اعلیٰ حضرت کے زمانے کا ہے ہم لوگ ایک مسجد میں حضرت جی کے ساتھ ذکر کر رہے تھے۔ جو نمی ہم نے ذکر شروع کیا تو اترنے والے انوارات سارے گاؤں کو دکھائی دیئے اور پورا گاؤں دوڑا اکیا کہ شاید مسجد کو آگ لگ گئی ہے۔ وہ لوگ جب بھاگے بھاگے آئے تو آگے ہم لوگ ذکر کر رہے تھے۔ یعنی انکشافات ان لوگوں کو بھی ہو گئے جو خود ذکر نہیں تھے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۹۳ء کا ہے۔ میں دل کے مرض میں مبتلا تھا۔ مجھے پنڈی لے جایا۔

میا اور میری حالت کے پیش نظر مجھے ہسپتال داخل کر دیا گیا اور آنسجین وغیرہ لگ گئی۔

ہاں تو جب مجھے آنسجین وغیرہ لگ گئی تو بریگیڈر صاحب نے منارہ فون پہ بتا دیا کہ حالت ٹھیک نہیں۔ اتنا سننا تھا کہ میری بمشیرہ گھبرا کر رونے لگی کہ میں ان کا اکلوتا بھائی ہوں۔ حضرت رات کے کھانے کے لئے گھر آئے تو آگے کمرام مچا ہوا تھا۔ انہوں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور واپس دارالعرفان چلے گئے۔ رات انہوں نے میرا مرض سب کر کے دارالعرفان میں ایک بند رہا تھی۔ اس پہ پھینک دیا اور صبح اٹھے تو ڈاکٹر عظمت سے کہا جا کر بند ریاد کیج کر آؤ۔ وہ گئے اور واپس آکر بتایا کہ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے۔ حضرت نے فرمایا دوبارہ دیکھ کر آؤ۔ ڈاکٹر صاحب نے جا کر دیکھا تو وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے چھتری سے ہلایا تو وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ وہ مر چکی تھی۔

یہ واقعہ اس لحاظ سے اٹھو کھا ہے کہ ”صوفیا کرام“ سب امراض کا عمل مرینس کو سامنے اٹھا کر کرتے تھے جبکہ میں سو میل کے فاصلے پہ تھا اور حضرت جی دارالعرفان میں تشریف فرما تھے۔ ایسی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس کے بعد اگلے روز ہی میری حالت سنبھل گئی اور میں ٹھیک ٹھاک گھر واپس آ گیا۔

## چاچا نذیر

خادم حضرت محمد اکرم اعوان

س :- آپ کو یہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے ملازمت کرتے ؟

ج :- میں گیارہ برس سے یہاں کام کر رہا ہوں۔

س :- کیا ڈیوٹی ہے آپ کی یہاں ؟

ج :- جی میرے ذمے اندر کے کام ہیں۔ اس کے علاوہ لٹکر کا کھانا پکاتا ہوں۔ ٹینگی میں پانی پورا کرتا ہوں۔

س :- اگر چھٹی پر جائیں تو پیچھے لٹکر کا کیا انتظام ہوتا ہے ؟

ج :- جی میرے بعد دوسرا خانساں خان محمد ہے۔ وہ کام کرتا ہے۔

س :- آپ کو یہاں رہنا کیسا لگتا ہے ؟

ج :- جی میں ذات کا درزی ہوں۔ یہی میرا پیشہ بھی تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں کپڑے بیٹا تھا۔ یہاں آیا تھا 'حضرت جی سے ملنے' پھر ایسا لطف آیا کہ گھر جانے کو جی ہی نہیں چاہا۔ میرا بڑا کانٹیلر ماسٹر ہے۔ دوسرا بھی یہی کام کرتا ہے وہ کہتے ہیں گھر آ

جائیں۔ مگر میرا دل ہی نہیں مانتا گھر جانے کو۔

س :- یہاں سے جانا کیوں اچھا نہیں لگتا؟

ج :- بس جی۔ یہاں رہ کر دل کو خوشی ہوتی ہے۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں۔ یہاں سے نکلوں تو بے سکون ہو جاتا ہوں۔

س :- حضرت جی کی طبیعت کیسی لگی آپ کو؟

ج :- جی ان کی طبیعت کا تو پوچھیں ہی ناں۔ بہت اچھی طبیعت ہے ان کی۔ جب بھی بات کریں، ہنس کر کرتے ہیں۔ کیا حال ہے نذر خان، اس طرح بلاتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے غصے سے مجھے بلایا ہوں۔ یا مجھ پر ناراض ہوئے ہوں۔

س :- کبھی گھر سے دوری کا احساس ہوتا ہے؟

ج :- جی بالکل نہیں۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ صحیح ہے کہ گھر یا دی نہیں آتا۔ ورنہ یہاں آنے سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ میں دو دن بھی گھر سے باہر نہیں گزار سکتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ چھٹی پر بھی جانے کو دل نہیں چاہتا۔

س :- اجتماع کے دنوں میں مہمانداری زیادہ ہونے کی وجہ سے پریشان تو نہیں ہوتے؟

ج :- ہم لوگ دارالعرفان کے کچن میں، عام روٹین میں، دو ہندے کام کرتے ہیں۔ مگر جن دنوں مہمانداری زیادہ ہوتی ہے تو حضرت جی اور لاٹگری بلوا لیتے ہیں۔ ان دنوں میں ہم پانچ ہندے ہوتے ہیں کام کرنے والے۔ اس لئے مل کر کر لیتے ہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

س :- کیا آپ ذکر کرتے ہیں؟

ج :- جی پابندی سے تو نہیں، مگر جب بھی وقت ملتا ہے ضرور کرتا ہوں۔ ویسے نماز کی اللہ کے فضل سے پوری پابندی ہے۔

س :- کبھی آپ سے کھانا خراب بھی ہوا اگر ہو اتو حضرت جی نے کیا کہا ؟

ج :- جی ایک دفعہ مجھ سے کھانا خراب ہو گیا تھا۔ کرنل صاحب نے لکڑی سے لے کر مرچ مصالحے تک کا بل 819 روپے بنایا تھا۔ حضرت جی کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا 'کرنل صاحب سے کہ اس دفعہ کی جانے دیں' اگلی دفعہ ہوا تو دیکھا جائے گا۔ اسی طرح ایک دفعہ کرنل صاحب نے میری تنخواہ اور چھٹیاں کاٹ لیں 'میں نے حضرت جی سے کہا۔ میری والدہ فوت ہو گئی تھیں ' اس لئے چار چھٹیاں فالٹو لی تھیں۔ حضرت جی نے پندرہ سو روپیہ مجھے دیا اور فرمایا 'کرنل صاحب کو تنخواہ کاٹنے دو' وہ تمہارا سات سو روپیہ کاٹ رہے ہیں تم مجھ سے پندرہ سو لے لو۔ اس کے علاوہ والدہ کی وفات پر مجھے خرچے کے لئے تین ہزار روپیہ دیا ' اسکے علاوہ بھی باقی ضرورتوں کا اسی طرح خیال رکھتے ہیں۔ یعنی انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی ' وہ خود خود جان لیتے ہیں۔

## ہارون الرشید سے باتیں

ہلور ایک اخبار نویس کے کوئی بہت اچھا تاثر نہیں تھا جو ابتدا میں 'میرانا' سوائے اس کے، کہ جماعت اسلامی والوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا 'یہ وہی بات کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ پورے اسلام کی بات کرتے ہیں۔ لیکن جرنلسٹوں کا رویہ تھوڑا سا شک بھرا ہوتا ہے۔ جو نیالینڈر merge ہو رہا ہو تو پیشے کے اعتبار سے وہ اسے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اب بات جو ان کے بارے میں کہی جاتی تھی یہ وہ آدمی ہے جو ڈاکے ڈالتا رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ہوتا تھا کہ تائب ہو گیا، اچھی بات ہے۔ مگر یہ نہیں گمان ہوتا تھا کہ کوئی اتنا بڑا آدمی ہے۔ میرے بھائی جو ہیں وہ ان سے ملے۔ اور میرے جو چھوٹے بھائی نیویارک میں رہتے ہیں۔ وہ انکی اب ایک طرح سے وہاں نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ وہ ذرا Different آدمی ہیں۔ میرے ایک بھائی ہیں یا سین صاحب 'سینٹر طارق چوہدری سے بڑے۔ وہ بہت ذکر کرنے والے آدمی ہیں۔ اور بہت ان کا تعلق رہا۔ عالم اسلام اور مسلمان لیڈروں سے وہ لندن میں رہتے ہیں۔ مولانا مودودی ان کے ہاں ٹھہرتے تھے اور دوسرے لوگ بھی ان کے

والد کا بھی بزرگوں سے تعلق رہا۔ انہوں نے ذکر کرنا شروع کیا موانا اکرم انمول کا اور یہ کہا کہ وہ بڑے مرتبے کے آدمی ہیں۔ اور مجھے اس پر تعجب نہ تھا کہ میرے بھائی ہیں پڑھے لکھے آدمی ہیں اور وہ جلدی کسی سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔ فیملی ایک گراؤنڈ کچھ ایسا ہے Experience بھی کافی رہا ہے۔ یہ جو میرے بھائی ہیں ان کی ضیاء الحق سے بڑی پرانی دوستی رہی۔ عام طور پر وہ کوئی جلدی انتہی رائے دینے والے نہیں تھے۔ محتاط آدمی تھے۔ بہت نیک آدمی وہاں لندن میں ہیں۔ بہت ذکر کرنے والے آدمی ہیں بہت زیادہ۔ انہوں نے ایک دفعہ بتایا کہ تیس تیس سال سے وہ ہمیشہ وضو کے ساتھ رہتے ہیں۔ کاروباری آدمی ہیں۔ تو مجھے تعجب نہ تھا۔ میرا خیال تھا خوش گمانی ہے۔

بیس ڈینس میں ایک دفعہ حضرت جی سے ملاقات ہوئی یاسین صاحب کے گھر جو بعد میں ڈینس ریڈ بلاک میں شفٹ ہو گئے تھے۔ تو حضرت صاحب نے فرمایا میں تو انہیں جانتا ہوں پتہ نہیں یہ بھی مجھے جانتے ہیں کہ نہیں۔

یہ دسمبر کا مہینہ تھا جی۔ 98ء کا۔ میں خاص طور پر انہیں ملنے کے لئے گیا اور میں اپنی پوری پریکٹیکل لائف میں کبھی کسی آدمی سے ملنے نہیں گیا۔ یہ ایک انکار ہے میری طبیعت کا اسلئے کہ میں early جبر ملزم میں آگیا۔ اور میں نے لوگوں کو بہت دیکھا ہے۔ میری رائے بہت خراب ہے۔ لیڈروں کے بارے میں عمومی طور پر اور میری یہ بالکل پختہ رائے ہے کہ ان میں جو بہتر لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی انسانی احساسات کے تاجر ہیں۔ ان کے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔ خیر میں گیا درس قرآن سننے کے لئے It was something very very unusual قرآن کا اپنا اثر تو ہے ہی۔ لیکن جس طرح اسکو انہوں نے پیش کیا۔ اب میں اس کو بڑی اہمیت دیتا ہوں کہ قرآن کی اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی

شکت اور وجاہت ہے 'اس کی ایک پر اسراریت ہے' اور اس کو عام طبعیت سے بیان نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے پہلا آدمی دیکھا جس نے قرآن کو اس طرح بیان کیا جس طرح بیان کرنا چاہئے۔ اور اللہ کا ذکر اس طرح سے کیا جس طرح سے اللہ کا ذکر کرنا چاہئے۔ اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مجھ پر 'حالانکہ سردی تھی' باہر کھلی جگہ پر بیٹھے رہے اب میں نے ایک چیز قریب سے دیکھی ہے۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ صوفی کتنا بڑا آدمی ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے کہا 'جی اگر کسی کا والد بیمار ہو' اور وہ اس کی خدمت پر مامور ہو اس کا مرشد اسے طلب کرے تو اسے کیا کرنا چاہئے تو انہوں نے کہا۔ اس کا مرشد اسے طلب نہیں کرے گا۔ وہ وہاں بیٹھا اس کی تربیت کر سکتا ہے۔ میرے لئے ایک تعجب خیز جواب تھا یہ 'بالکل نئی دنیا کا' جیسے انکشاف ہو رہا ہو۔ ایک آدمی نے حضرت میاں محمد صاحب کا ایک شعر پڑھا۔

خاصاں دی گل عاماں اگے شمس مناسب کرنی

مٹھی کھیر پکا محمد کتیاں اگے دھرنی

مجھے بڑا نامووار گزرا۔ یہ کیا مصرع ہے۔ میاں محمد بہت بڑے شاعر تھے۔ مگر بڑے شاعروں کے کمزور مصرعے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اسکی جو تشریح انہوں نے کی قرآن کے حوالے سے کی اور بڑی عجیب بات اس میں یہ کہ کسی کہ لوگوں سے ان کی عقل کی سطح پر بات کی جائے۔ قولو للناس علی قدر عقولہم میں نے کہا یہ تو کوئی زیادہ گہرا آدمی ہے۔ پھر وہاں ایک آدمی نے بد تمیزی کی۔ اس نے کہا آپ کوئی پیر ہیں۔ یا روحانی پیشوایا لیدر ہیں 'یا خود نمائی کے مرئیس ہیں۔ میں جدہ میں آپ سے ملا آپ نے ملاقات کا وقت دیا اور میں گیا تو آپ ملے نہیں۔ پتہ چلا آپ مریدوں کے ساتھ ہیں۔ تو انہوں نے کہا 'میں کیا ہوں' یہ تو لوگ ہی فیصلہ کر سکتے ہیں 'اور میں ایک سو سو صدی کا آدمی ہوں' ہو سکتا ہے 'میرے اندر خود نمائی بھی پائی جاتی



ہو۔ آپ آئے ہوں ممکن ہے مجھے اطلاع نہ دی گئی ہو یا کوئی ایسی مجبوری ہو رہی ہو؟  
 جانے لگے تو اس آدمی سے وہ خاص طور پر ملے اور کہا کہ کوئی لڑنے بھڑکنے والا بھی تو  
 ہونا چاہئے۔ میرے دل پہ ایک اثر ہوا؟ لیکن میں نے اپنے بھائی سے یہ کہا۔ کچھ دن  
 کے بعد کہ حضرت ملی کا قول ہے کہ جب کسی آدمی میں کسی خوبی کا ظہور دیکھو تو  
 دوسری خوبی کے ظاہر ہونے کا اظہار کرو۔ اس بات سے مجھے کوئی انکار نہیں ہے کہ  
 مجھے یہ آدمی اچھا لگا۔ لیکن ابھی دیکھتے ہیں کچھ جائزہ لیتے ہیں۔ بڑا ہم نے لوگوں پر  
 زندگی میں اعتماد کیا۔ جنرل حید گل کو لائے پالیٹکس میں عمران خان کو لائے اور کئی  
 تجربات ہوئے اگرچہ اب بھی میری ان کے بارے میں رائے یہی نہیں ہے لیکن وہ  
 ناقص ہی رہا تجربہ کوئی اچھا نہیں۔ اور لوگوں کو بھی قریب سے دیکھا۔ مگر پھر وہ ایک  
 کیفیت طاری ہوتی گئی۔ اس لیے کہ صوفی جو ہے وہ آپ کے اندر داخل ہو جائے تو  
 ٹھکانا نہیں ہے۔ میں نے ان سے انٹرویو کیا۔ مگر انٹرویو میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ یا  
 تو گفتگو میں سوال ٹھیک طرح سے نہیں کر سکا یا وہ اس کیفیت میں نہیں تھے۔ میں  
 نے کہا جو بات آپ کہتے ہیں اگر وہ صحیح ہو تو اس پر کتاب لکھنی چاہئے۔ انہوں نے کہا  
 اس کا وقت نہیں آیا۔

پھر میں نے ایک کالم میں لکھا کہ ایک کیفیت محسوس کی۔ کہ یہ آدمی سوال کا  
 جواب دیتا ہے۔ جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ ان سوالوں کے  
 جواب نہیں دیتے مگر یہ سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح گزارنی چاہئے  
 اور دوسری دنیا کیا ہے۔ لیکن میں اس آدمی کو Discribe نہیں کر سکتا اس لئے کہ  
 فور کا دریا بہہ رہا ہو تو آدمی گم ہو جاتا ہے اسے دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔ تو  
 پھر میں نے جانا شروع کیا ان کے پاس انہوں نے بڑا تپاک ظاہر کیا۔ پھر جب میں  
 منارہ گیا تو وہ ایک بڑا خیر خیز تجربہ تھا۔ رات کو وہاں ایک صاحب ملے جو کسی زمانے

میں بالکل لمحہ ہوتے تھے۔ Non-believer انہوں نے کچھ چیزیں مجھے بتائیں۔ اس میں ایک چیز یہ تھی کہ 83ء میں مولانا اللہ یار خان جو حضرت صاحب کے مرشد تھے۔ انہوں نے ایک دن فوجی افسروں کو کہا کہ روس جو ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ تباہ ہو جائے گا۔ میرے لئے یہ تعجب کی بات تھی میں نے افغانستان کی جنگ کو بہت قریب سے Watch کیا، دسمبر 79ء سے 89ء تک میں نہ اس پر لکھ رہا ہوں۔ اس کی رپورٹنگ میں نے کی ہے اس کے تجزیے لکھے ہیں تمام افغان لیڈروں سے میرے مراسم رہے ہیں۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ 86ء سے پہلے یہ کسی کو غماں ہی نہیں تھا کوئی شخص یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ روس جاسکتا ہے اور ٹوٹ جائے گا۔ اسکی بڑی گرفت تھی اور کوئی ایسے حالات نہیں تھے جب تک سنٹر نہیں آگیا جو 86ء جون میں آیا ہے۔ اس وقت تک اس کی کوئی پاسبیلٹی نہیں تھی۔ 83ء میں ایک آدمی کیسے کہہ سکتا ہے پھر انہوں نے یہی نہیں کہا۔ انہوں نے کہا کہ کینسٹ اوڈ اسپر ریکارڈ کر لیا کہ روس ٹوٹ جائے گا اور روسی بھیک مانگا کریں گے۔ یہ بھیک مانگنا علامتی نہیں ہے روسی افر بھیک مانتے دیکھے گئے ہیں۔ اور ملک بھی بھیک پر چل رہا ہے۔ پھر انہوں نے کہا انڈیا ٹوٹ جائے گا، میری موت کے بچاس سال کے اندر اندر یہ بھی ریکارڈ کر لیا۔ میرے لئے یہ بڑا تعجب خیز تھا۔ پھر میں نے لوگوں کو وہاں گارڈ سے لے کر سکول ٹیچر تک پر نسل اور جو عام پٹرول پمپ پر کام کرنے والے ہیں مختلف لوگ ہیں اچھے لوگ ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے پالیٹکس میں یا دینی جماعتوں میں آج بحثی ضرور کرتے ہیں غیر ضروری بحث مباحثہ اور اپنے لیڈروں کو بہت بڑا چڑھا کر بیان کرنا اور بہت غیر ضروری چیزیں مبالغہ کرنا۔ مگر میں نے دیکھا یہ لوگ جموٹ نہیں لاتے مبالغہ نہیں کرتے تو کچھ Communication شروع ہوئی ان سے پالیٹکس اور ہسٹری وغیرہ پر بات

ہوتی رہی۔ اور جب بات ہوئی تو کئی دفعہ ایسا ہوا میں دس سہٹ حضرت نبی کے پاس گیا تو باتوں میں رات کا ایک بج گیا۔ وہ خصوصی مہربانی کرتے رہے اور میرے لئے وقت نکالتے رہے۔ یا تو مجھے اپنے پاس بلا لیتے یا پھر جہاں میں ٹھہرا ہوتا وہاں آجاتے۔ یہ حافظہ بہت اچھا نہیں ہے۔ 'تفصیلات یاد نہیں رہتیں' مگر مولانا روم 'مظہر جان جاہاں کے بارے اور تصوف پر ان کی گفتگو کا معیار اتنا اعلیٰ ہے کہ مجھے زندگی میں ان کا مشاہدہ نہیں ہوا۔ نہ کسی کتاب میں نہ کسی بڑے مثلاً مولانا مودودی جن سے میں ملتا رہا ہوں اور بھی لوگوں سے ملتا رہا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے کامل تھا اس لئے کہ میں اپنے مزاج کو سمجھتا ہوں کہ میں ذہین وغیرہ فالو نہیں کر سکتا۔ بعض چیزوں میں 'میری اب بھی ایک Observation ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان جو ہے وہ انسان ہی ہے۔ اللہ کے پیغمبر کے سوا سب انسان ہیں۔ لیکن بعض باتوں کا بہت اثر ہوا۔ ایک رات کو میں جاوید چودھری کو اپنے ساتھ لے کر گیا۔ رات کو ہم سو ایک بجے اٹھے اور پھر میں نے دیکھا وہ ساڑھے تین بجے تہجد کیلئے بھی اٹھ گئے۔ میں نے ان کے مشاغل دیکھے 'شکار کرنا' میل پالنا اور گھوڑے پالنا۔ لوگوں سے ملنا اور ان کی سطح پر Communicate کرنا۔ ان سب چیزوں کے بعد ایک Perfect نارمل آدمی کی زندگی گزارنا۔ میرے لئے سب سے حیران کن تھا۔ اس لئے کہ کسی لیڈر کو میں نے نارمل زندگی گزارتے نہیں دیکھا۔ میں نے ایرانی لیڈروں افغان لیڈروں کو بھی دیکھا ہے۔ پاکستانیوں کو بھی دیکھا ہے۔ ہسٹری پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر میں نے کوئی شخص ایسا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا جو اس درجے پر فائز ہو کہ اسی 'نوے ہزار' آدمی جس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہوں۔ (موت پر بیعت) جان دینے کے لئے تیار ہوں۔ صبح سے شام تک لوگ فدائین کی طرح جس کے پاس آتے ہوں اور 'ہundred percent نارمل زندگی گزارے۔ میرے لئے یہ Miracle

تھا۔ پھر کچھ اور چیزیں میں نے دیکھیں، مثلاً یہ کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی جب ان کے پاس آتا ہے میں کسی کا نام لئے بغیر یہ کہتا ہوں کہ وہ Allips: ہو جاتا ہے۔ اور یہ غیر معمولی روحانی قوت کے سوا نہیں ہو سکتا۔ اور لوگوں کے قلب پر اثر ہوتا ہے ایک سب سے زیادہ مینشن کرنے والی چیز شاید یہ ہے کہ میں نے محسوس کرنا شروع کیا ایک زمانے میں کہ جب میں یہاں آتا ہوں تو ایک خاص رغبت دین کیلئے پاتا ہوں کہ اس سے پہلے کبھی اس طرح نہیں ہوئی، کتاب پڑھتے ہوئے کبھی ہوئی ہو، کسی آدمی کی صحبت میں تو بنگی سی سطح پر ہوئی اس سطح پر نہیں ہوئی کہ آدمی کو اپنی غلطیوں کو تا ہیوں کا احساس ہو، جذبے کی شدت پیدا ہو کہ کوئی بھلا کام کرنا چاہئے۔ لوگوں پر غصہ نہ آئے۔ مجھے سوائے عمرہ کے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ آدمی کے دل میں غبار بھرنے لگے اور نفرت کم ہونے لگے۔ ایک دفعہ میں نے یہ دیکھا، چکوال تک پہنچے اور وہاں سے میں نے محسوس کیا کہ دل کی حالت بدل رہی ہے۔ اور اس کو مانیٹر کرنا چاہئے۔ گھر جیسے جیسے قریب آتا ہے حالت بالکل اور ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات میں آپ کو بالکل ایمان داری سے بتا رہا ہوں میں زندگی میں کبھی کسی سے ملنے نہیں گیا۔ میرا تجربہ ہے کہ بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آدمی ذہین تو ہو سکتا ہے مگر اخلاقی اعتبار سے یا Otherwise کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے جیسے لوگ ہوتے ہیں کچھ چیزوں میں اچھے ہو سکتے ہیں۔ یہ میں نے محسوس کیا کہ اثر ہوتا ہے۔ پنڈی گیا تو دیکھا ایک دفعہ میری یہ کیفیت ہوئی، جب میں مری روڈ پر گیا تو میں نے چاہا کہ منارہ واپس چلا جاؤں۔ حیرت کی بات ہے اس طرح کسی سے ملنے کو کبھی دل نہیں چاہا، حالانکہ اور بھی نیک لوگ تھے، ان میں اچھے لوگ بھی تھے۔ میرے ایک خالہ زاد بھائی جن سینئر طارق چوہدری بہت نیرے سے آدمی ہیں۔ انہوں نے زندگی میں کسی کی نہیں مانی۔ ضیاء الحق نے انہیں سینئر بتایا، مگر

انہوں نے اسکی ایک بات نہ مانی۔ غلام اسحاق خاں ان کا سر پرست تھا انہوں نے وزارت دینی چاہی انہوں نے انکار کر دیا۔ نواز شریف کو وزیر اعلیٰ بنانے میں ان کا Contribution تھا مگر نواز شریف کی کوئی بات انہوں نے نہیں مانی کچھ بھی ان کی یہی حالت تھی۔ Otherwise بڑے مضبوط مارل سپرٹ کے آدمی ہیں۔ صاف ستھرے آدمی ہیں۔ بات کسی کی نہیں سنتے۔ میں نے دیکھا کہ وہ مولانا اکرم اعوان کے قریب گئے تو انہوں نے تہجد پڑھنی شروع کر دی۔ پہلے وہ میری طرح بے قاعدہ نماز پڑھتے تھے پھر نماز کی باقاعدگی ہو گئی روزے بھی رکھنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک indication تھی۔ مجھے انہوں نے کہا یہ شخص اتنی صاف ستھری زندگی گزارتا ہے اور یہ جو دنیا پر جھوٹ نہیں بولتا یہ اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔ This the was time per-haps میں نے محسوس کیا کہ ان سے باقاعدہ تعلق ہونا چاہئے۔ کیونکہ میرا بھائی (سینئر طارق چودھری) بہت کم رائے دیتا ہے اور جلدی رائے نہیں دیتا اور عام طور پر اسکی رائے مستحکم ہوتی ہے۔ پھر چھوٹے بھائی نے چہ صفارہ اکیڈمی میں داخل کر دیا تجربہ بہت اچھا رہا پھر دوسرے چوں کو بھی وہاں داخل کروایا۔ میرے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ بڑا آزاد آدمی ہے اور اپنی بڑی ذاتی رائے دیا کرتا ہے۔ پھر میں نے دعوت کر لی۔ مگر اسکو اس طرح سے پریکٹس نہیں کیا جس طرح دوسرے کرتے ہیں۔ مگر ان سے ایک تعلق استوار ہو گیا اور پہلی دفعہ میں نے تصوف کو پڑھنا شروع کیا۔ ورنہ ہمارا تو تعلق اہلحدیث سے ہے اور ہمارے ہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہر جو ہوتے ہیں ٹوٹلی فراز ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بھی اپنی زندگی کے بارے میں پیشکشیں کیں۔ انہوں نے کہا بات یہ ہے ہارون الرشید اسی سڑک پر میں ڈاکو کے طور پر رہتا تھا۔ بیس بیس میں نے بیس لوٹیں۔ مجھے اس بارے میں تھوڑا بہت تو تھا مگر

ایک جاب رکھتا تھا 'احترام اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں نے پوچھا باقاعدہ کام کرتے تھے۔ کہنے لگے باقاعدہ ہی کرتے تھے کس لئے کہنے لگے اپنی چودہ حراہٹ کے لئے کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔ صرف یہ کیا کہ گھر پیسے لے کر نہیں گئے وہیں بانٹ دیتے تھے۔ کس لئے میں نے حیرت سے پوچھا۔ اُس یار رزق حرام کھانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی شاید اسی لئے اللہ نے چالیا۔ پھر انہوں نے حضرت اللہ یار خان کے بارے میں بتایا کہ کیسے ان سے تعلق قائم ہوا۔ انہوں نے بتایا 'ان کا عالم تو یہ تھا کہ کوئی شخص ان سے گفتگو نہیں کر سکتا تھا آپس میں مشورہ کیا جاتا تھا کہ کون ان سے بات کرے اور کیسے کرے۔ بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ کم لوگوں کو دعوت کرتے تھے اسلئے کہ تربیت کی ذمہ داری ہے۔ مگر حضرت جی نے تو Concept ہی بدل دیا ہے اس کا۔ اسلئے کہ زمانے کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس لیے بھی بدل دیا کہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے لئے جس قوت اور فیصلے کی ضرورت ہے وہ ایسے ہی ہیں۔ وہ طبعا لیڈر بھی ہیں محض صوفی نہیں ہیں۔ اللہ نے بڑا Confidence دیا ہے انہیں۔

پھر میں نے دیکھا ان کے ساتھ شکار پر میں جاتا۔ عصر کے وقت جاتے تھے اور کوئی آٹھ دس کلو میٹر جانا اور واپس آنا عصر پڑھ کے تو پھر عشاء تک اور وہ جو میں نے کہا ایک بار مل آدمی کی زندگی 'اچھا مذاق بھی اور شاعری اور لطیفے بازی بھی لیکن بڑی شائستہ حدود کے اندر اور یہ جو عظیم لوگوں کا وصف ہے 'جو لوگوں کی حالت بدلتے ہیں کہ وہ لوگوں میں گھل کر رہتے ہیں مگر اس کے باوجود کوئی ان سے بے تکلف ہونے کی جرات نہیں کرتا۔ اور میں نے ان کے اندر جو چیز دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہندوؤں سے مرعوب نہیں ہوتے اور جی سیدھی بات ہے 'جس کا اللہ سے تعلق ہو گا اسکو ہندوؤں کی مرعوبیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اور ہندو ہے ہی وہی جو

مرد آزاد ہے۔ میرا اپنا تھیمز یہ ہے زندگی کا ساز ہے تیس سال کے Experi-  
ence کا کہ میں نے برصغیر کی سیاسی تاریخیں پڑھی ہیں اور لینڈروں کو دیکھا ہے اور  
جو پولیٹیکل ہسٹری پڑھی ہے۔ جس سے مجھے Interest رہا ہے۔ دراصل برصغیر  
معاشرہ ایک غلام معاشرہ ہے۔ اس کے اندر خوں غلامی بہت ہے۔ ہر آدمی میں  
کیس نہ کیس خوں غلامی ہے۔ ہر آدمی میں کیس نہ کیس کمتری ہے۔ بڑوں سے ذرا  
ہے اور کمزوروں پر زیادتی کرتا ہے۔ یہ اس معاشرے کی روح کے اندر ہے جب تک  
غلامی اس معاشرے کے اندر سے نہیں نکلتی یہ کبھی صحت مند معاشرہ نہیں بن  
سکتا۔ اور یہ چیز میں نے جرنلسٹوں میں بھی دیکھی۔ پولیٹیکل ورکرز میں بھی اور  
فوجیوں میں بھی دیکھی ہے۔ مگر یہ میں نے ایک آدمی دیکھا ہے جو آزاد آدمی ہے۔  
جس کے اندر مجھے خوف نظر نہیں آتا۔ اور مرغوبیت نہیں کسی چیز سے۔ ظاہر ہے  
عقل کل تو دنیا کا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ کوئی انگریزی یا فرانسیسی کا استاد بھی نہیں یا  
کوئی ساری ہسٹری تو انہوں نے نہیں پڑھ رکھی ہے اور بھی کئی چیزوں میں کمی ہو سکتی  
ہے وہ جو آدمی کو ہونا چاہئے ایک مرد آزاد کو تو وہ ہیں۔ ایک میں نے ان کے معاملہ  
میں یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کے اندر Bitterness نہیں ہے۔ یہ میرے لئے اخبار  
نویس کے نقطہ نظر سے تعجب خیز تھا۔ وہ اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں  
کدورت اور رنج نہیں ہوتا۔ تنقید تو کرتے ہیں مگر اس میں بغض و عناد نہیں ہے خیر  
خواہی کا جذبہ ہے۔ وسعت ہے۔ مطالعہ بڑا وسیع ہے اور ایک فکر مندی ہے لوگوں کی  
اصلاح کرنے کی اور کشش تو ایسی ہے میں نے دیکھا جہاں کہیں وہ گئے۔ لوگ ان کی  
طرف کھینچے جاتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں جنہوں نے Forty Seven Agitation لڑی کیا تھا۔  
M.S.f کے پلیٹ فارم سے، نسیم انور بیگ۔ وہ الگ تھلک رہنے والے ہیں۔ لوگ

ان کے پاس جاتے ہیں۔ مجید نظامی صاحب بھی جاتے ہیں۔ حمید گل بھی جاتے ہیں۔ ایس ایم ظفر بھی جاتے ہیں۔ اور ہم بھی ان کے پاس جاتے تھے۔ وہ بزرگ آدمی ہیں ان معنوں میں کہ شریف آدمی ہیں۔ بڑی تواضع اور انکسار ہے طبیعت میں۔ شام کو محل ہوتی تھی۔ فارن آفس سے لوگ بہت آتے تھے کہ وہ یونیٹوں میں رہے تھے سال 'تو فارن آفس کے لوگ انہیں باپ کا درجہ دیتے ہیں۔ قائد اعظم کے ساتھ کچھ عرصہ کام کیا 'اب تو کافی بوڑھے ہیں لیکن صحت اچھی ہے۔ تب وہ مجھ سے کہتے تھے حضرت جی سے کہیں 'میرے لئے دعا کریں 'میری مرحومہ دبی کے لئے دعا کریں۔ تو حضرت کہتے تھے 'ٹھیک ہے 'مگر کبھی زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ میں نے انہیں ایک دفعہ بتایا کہ نسیم انور بیگ صاحب کہتے ہیں کہ گھر میں جو یہ گلاب کی جھاڑیاں ہیں 'ان میں ہر جھاڑی پر سینکڑوں مرتبہ درود پاک پڑھا گیا 'کیونکہ ان کی مرحومہ دبی ان کی تراش خراش کرتے وقت ان پر درود پڑھتی رہتی تھیں۔ جب میں جانے لگا تو انہوں نے کہا 'مجھے اس گھر کا پتہ بتائیں۔ میں نے کہا میں آپ کو لے جاؤں گا 'تو کہنے لگے تمہارا کیا بھر دے کبھی ملتے ہیں تو کبھی نہیں ملتے 'کبھی ٹیلی فون خراب ہوتا ہے کبھی ٹھیک خیر میں نے پتہ بتایا اور وہ وہاں گئے اور پھر اکثر جاتے رہے میں نے دیکھا کہ اس آدمی کے رشتے اور محبت کی بنیاد ہی الگ ہے۔ یعنی یہ صرف اس وجہ سے اس گھر گئے اور جاتے رہے کہ وہاں کثرت سے درود پاک پڑھا جاتا رہا تھا۔ وہاں سے واپس آکر انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا 'جس دن پہلی دفعہ تشریف لے گئے وہاں افتخار عارف فارن آفس کے لوگ 'اکرم ذکی اور ہمایوں قاضی جو افغانستان میں سفیر تھے موجود تھے اور بھی اس طرح کے لوگ تھے، مجھے بہت لوگوں نے ٹیلی فون کیا بعد میں کہ رات کو نیند نہیں آئی۔ ہم اس بارے میں سوچتے رہے۔ نسیم انور بیگ جو قائد اعظم کے سوا کسی کی تعریف ہی نہیں کرتے 'انہوں نے کہا ایسی Presencc



تو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کی۔ اچھا ایک اور بات عرض کروں۔ میں نے جب بھی ان سے کسی مرحوم آدمی مرحوم صوفی بزرگ کے بارے میں پوچھا انہوں نے قطعی جواب دیا یعنی پیر صاحب کو لڑہ شریف حضرت سلطان باہوؒ ملے شاہ جیسے بزرگوں کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ اچھا مجھے ایک شخص کے بارے میں CU-riosity تھی، حسین بن منصور طلاج کے بارے میں، کہ اس میں متضاد رائے پائی جاتی ہے۔ وہ سرمستی اور قربانی کا سہل بھی ہے اور بغاوت کا بھی۔ اقبال کے ہاں بھی اس کے بارے میں دو رائے پائی جاتی ہیں میرا اپنا ذاتی تاثر خراب تھا اگرچہ اس کی کوئی تحقیق تو میں نے نہیں کی میں نے حضرت سے پوچھا وہ کیا ہے کہنے لگے وہ کچھ بھی نہیں مجذوب ہے البتہ بات یہ ہے کہ جتنی منزلیں وہ طے کر چکا تھا وہ تو کربھی چکا تھا وہ اس کا وجہ نہیں سار کا مجھے ایسے لگا بالکل کہ جیسے آپ کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ گیا ہو اور آپ کو صاف صاف نظر آنے لگے۔ اتنی Clarity میں نے کبھی نہیں دیکھی خیر یہ واقعہ ہوا میں اسی دن افتخار عارف کو ملنے کے لئے گیا تو اس نے مجھے دیوان دیا 'منصور طلاج' کا انہوں نے کہا یہ میں نے تمہارے لئے رکھا تھا میں نے کہا یہ کوئی عجیب Incident ہے کوئی اتفاق ہو سکتا ہے۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو میں تو ہسوت ہو گیا جی۔ اس لئے کہ حمد کی شاعری تو ہم نے پڑھی ہے کچھ نہ کچھ اس پر غور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مگر ایسی حمد یہ شاعری اس سے پہلے نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس میں سوائے ذات باری تعالیٰ سے محبت کے اور کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اور خیال اتنی رفعت پر ہے اور اتنی ندرت ہے اس کے اندر اور اتنی تیور اتنی گہرائی ہے الفاظ کی، اور اتنا اپنے ماحول سے جدا کہ آدمی ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ الفاظ کا دروہست ایسا ہے کہ جو انکلام کی بعض تحریروں میں اور اقبال کے لفظوں اور مصرعوں میں محسوس ہوتا ہے، پرانے عرب خطیبوں میں محسوس ہوتا

ہے کسی آدمی نے بہت تحقیق کی ہے۔ تمیں پتھیں، میراں خیر میں نے پڑھا، میں ایک دفعہ پھر مخالفے میں پڑ گیا ہو سکتا ہے حضرت جی کی رائے درست نہ ہو۔ میں نے ایک صاحب کے گھر سے آتے ہوئے ان سے کہا: 'منصور طابع تو کمال کا آدمی تھا۔ ذات باری سے میں نے ایسا محبت کہیں محسوس نہیں کی اور وہ تاریخ کا منفرد آدمی ہے، کسی دوسرے شاعر نے یہ کام نہیں کیا تو انہوں نے مجھ سے کہا: یہ بات صحیح نہیں ہے اور حضرت سلطان باہو، سلطان العارفین جو ہیں ان کا کام یہی ہے تو Suddenly میں نے realize کیا کہ میرا دھیان اس طرف تو کیا ہی نہیں۔ کبھی پڑھا تو تھا، باقاعدہ نہیں پڑھا مگر جتنا کچھ پڑھا تھا تو یہ خیال آتا چاہئے تھا۔ اتنی کلیئرٹی آف فکٹ ہے، پھر انہوں نے ایک کیفیت میں کہا کہ جب کبھی عالم برزخ پر نگاہ پڑتی ہے تو سلطان باہو کو ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ پایا ہے۔ انہیں کھڑے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ تو انہوں نے Casually کہہ دیا لیکن ایسا Casually نہیں کیفیت تھی، لیکن میرے تو یہ بات سن کر دو تھلے کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن مجھے اس کا یقین ہو چکا تھا کہ یہ جھوٹ ہونے والا آدمی نہیں ہے۔ خیر سچی بات تو یہ ہے کہ میں دم خود ہی رہ گیا، رفتہ رفتہ پھر یہ اور اک ہوا اور میں اس پر سم اپ کر رہا ہوں کہ جو ایک ذکر کا ایلیونٹ تھا اسلام کے اندر اور جو کہ قرآن میں ہے کہ اٹھتے بیٹھتے لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ ہم لوگ قرآن پڑھتے تھے میں نے تجوید قرآن پڑھا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ کبھی اس پر نظر ہی نہیں ٹھہری تھی۔ اب یہ جو تسبیح اور ذکر کا اہتمام ہے اس کا نتیجہ یہ رہتا ہے کہ جو آلودگی Otherwise پیدا ہوتی ہے ماحول سے اس سے وہ لوگوں کو چاتے ہیں۔ خود بھی ظاہر ہے چتے ہیں اور میں آپ کو ایک بات کی گواہی دیتا ہوں بالکل اللہ کو گواہ کر کے کہ ان سے ملاقات سے پہلے میری اپنی زندگی میں، میں نے کبھی اطمینان محسوس نہیں کیا تھا۔ میں ایک مطمئن آدمی تھا اور وہ جو ایک

خاص اصطلاح لوگ استعمال کرتے ہیں Angry young man کی مجھے پر پوری اترتی تھی۔

میں کوئی تو ہم پرست نہیں ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں مبالغہ بہت کیا جاتا ہے۔ جو نیک لوگ ہیں وہ زیادہ مبالغہ کرتے ہیں۔ کوئی آدمی پیغمبر تو ہو نہیں سکتا۔ نہ کوئی صحابہ کے مرتبہ پر پہنچ سکتا ہے۔ نہ میں انہیں جیند بخدا دی سمجھتا ہوں۔ نہ حضرت علیؓ جو یری جھٹتا ہوں۔ مگر میں ان کو اس راستے پر ضرور سمجھتا ہوں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ دوسرے کی بات سنتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی بات سنتے ہیں۔ ان کی کامقصد اعلیٰ ترین ہے۔ وہ جو ایک عظیم ترین مقصد آدمی کا ہو سکتا ہے وہ انکا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے اندر غیر معمولی کشش ہے اور محبت ان کی ایسی ہے کہ جو آدمی ان کے پاس بیٹھے گا وہ نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے وہ ایسے لوگوں کو متوجہ کر سکتے ہیں جن کو کوئی نہیں کرتا میں نے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے وہ ایک ایسے آدمی کو جس نے کبھی شر بھی نہ دیکھا ہو اور ایسے کو جو امریکن یونیورسٹی کا پروفیسر ہو کیونٹی کیٹ کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک کام تھا تو میں نے کہا دعا کریں پھر جب میں جانے لگا تو میں نے کہا دعا کا وعدہ ہے آپ کا، تو انہوں نے مجھ سے کہا دعا تو ہو چکی مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ابھی تو ہم بیٹھے گفتگو کرتے رہے مگر پرتے رہے دعا کہاں ہو گئی۔ تو انہوں نے کہا ہارون الرشید دعا الفاظ کا نام نہیں ہے دعا اس آرزو کا نام ہے جو آدمی کے دل کی گمراہیوں سے اٹھتی ہے۔ اب میں خود ایک لکھنے والا ہوں میں نے تو الفاظ میں ایسا ربط کبھی نہیں دیکھا۔ یعنی دعا وہ آرزو ہے جو آدمی کے دل کی گمراہیوں سے اٹھے!

سیاست میں بعض چیزوں سے مجھے اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ بعض اوقات ایسے لوگوں سے حسن ظن کرتے ہیں جو اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ یہ ان کی کرامت ہی ہے ان



مولانا عبدالقدیر خان



حضرت ملک اکرم اعوان والد اکرم اعوان و عبدالرشید اعوان

ہے ان کو کام نہیں ہوتا کوئی غرض نہیں ہوتی 'ان سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا' میں نے انہیں بہت خوددار پایا ہے۔ سنا ہے ہر صوفی میں رسول اللہ کی ذات کے کسی نہ کسی وصف کا غلبہ ہوتا ہے خصوصاً رحم اور ترک کا۔ لیکن میں نے ان میں نسبتاً بہت زیادہ بلیس دیکھا ہے، لیڈروں سے تو ان کا تقابل ہی نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے اس سے بھی اختلاف ہے کہ انہیں سنوڈیو میں نہیں جانا چاہئے تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ صرف نیک نیتی سے وہاں گئے۔ اس میں مجھے رتی برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ ہر صوفی زندگی میں کبھی نہ کبھی مذمت invite کرتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ایسا کیا جتنا میں نے پڑھا ہے تصوف کبھی نہ کبھی ضرور in-vite کرتا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے واقعات ہیں یعنی ایک مشہور بزرگ تھے وہ حج کرنے کے لئے گئے۔ تو اہل مکہ ان کے استقبال کے لئے آگئے 'انہوں نے رمضان کا مہینہ تھا' روٹی نکال کر کھانا شروع کر دی۔ رمضان میں آپ روٹی کھا رہے ہیں مریدوں نے کہا غالباً حضرت ابو ایوب بن ادریس کا واقعہ ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ مسافر پر روزہ فرض نہیں ہے۔ کسی نے کہا سب کے سامنے کھانا ضروری تھا کیا، تو انہوں نے فرمایا نفس میں تکبر پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی بات ہے۔ جس کا ظاہر ہے وہ اظہار نہیں کریں گے۔ اور جو غزوہ ہند کا پہلو ہے اس کے بارے میں عرض کرتا چلوں۔ کہ اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے میرے دل میں یہ خیال غالب ہے اور میں اس بات پر یقین کرتا ہوں 'اپنی عمر بھر کے غور و فکر کے نتیجے میں کہ اللہ انسانوں پر خیال کے ذریعے حکمرانی کرتا ہے۔ قائد اعظم اکٹھ برس کے بوڑھے آدمی تھے۔ ہمارے تھے پاکستان بننے کا منطقی طور پر کوئی تصور ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا اور یہ Obsession ہو جائے تو یہ خارجی عمل ہے داخلی عمل نہیں ہے۔ میں نے ہزاروں لوگوں کو اس خیال میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے اور یہ ایک ہوا ہے جو چلنا

شروع ہوئی ہے، کچھ عرصہ پہلے غزوہ ہند کوئی چیز نہیں تھی میرے دل پر اس خیال  
 نے بڑی گرفت قائم کی 'میں لوگوں سے ملا لوگ مجھے ملتے چلے گئے پھر میں نے اس پر  
 لکھا 'اس ملاقات سے پہلے جب میں ان سے ملا تو میں اس بات پر حیران ہی رہ گیا کہ یہ  
 تو بالکل وہ بات کر رہے ہیں جو ہم متذبذب ہو کر، کر رہے ہیں۔ یہ واضح دلائل کے  
 ساتھ کر رہے ہیں۔ ہمارے ذہن میں تو گمان ہی تھا۔ میں نے ان کے لوگوں کو دیکھا  
 کہ وہ اتنی ورزش کرتے ہیں کہ اگر کبھی غزوہ ہند شروع ہو جائے تو وہ تیار ہوں۔ میں  
 سمجھتا ہوں ان کا یقین محکم ہے۔ اگر ان کا پیغام پھیلتا جائے 'اور بہت واقعات ہیں'  
 میں اس وقت بتانا مناسب نہیں سمجھتا 'کچھ چیزیں میں لکھ دوں گا۔ مجھے یقین ہے  
 یہاں ایک بڑا معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ وہ لوگ جو امریکہ کے کارندے ہیں 'ویسٹ  
 سے بہت زیادہ مرعوب ہیں 'خودی جن کے اندر نہیں ہے 'پوری غلامی ہے 'ان  
 کے خلاف ایک دوسرا گروہ ہے اور کوئی لیڈر تو ایسا پیدا ہو گا 'جو تعصبات سے بالاتر ہو  
 گا 'اور بڑا لیڈر تو وہی ہے 'زمانے کا رخ تو وہی بدل سکتا ہے 'جو تعصبات سے بالاتر  
 ہو اور جس پر پوری قوم متحد ہو سکے 'کوئی آدمی اٹھے گا اور یہی لوگ ہوں گے یا ان  
 کے لوگوں کے دستے اور جو لوگ ان کے دست و بازو ہوں گے 'اس لئے ان کا ساتھ  
 دینا 'ان کو پروموٹ کرنا 'ان کے ساتھ کھڑے ہونا 'ان کی وکالت کرنا یہ سب باعث  
 برکت ہے 'میں ان کے ساتھ بیٹھ کر ذکر نہیں کر سکتا 'یہ ایک الگ بحث ہے 'کہ کیوں  
 نہیں کر سکتا۔ میری خامیاں ہیں 'بعض کوتاہیاں 'لیکن میں دلی طور پر سمجھتا ہوں کہ  
 یہ لوگ سوائے انسانوں کی بھلائی کے کوئی چیز نہیں چاہتے۔ میں نے ان کے اندر دنیا  
 کالاجی نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں ہر معاملے میں بڑا خود دار پایا ہے۔ بہت ہی صاف  
 ستھرے اور پاکیزہ 'ان سے بہتر اخلاقی گروہ میں نے نہیں دیکھا 'میں دوسروں کے  
 پاس بھی جاتا ہوں اور بعض صوفی ایسے ہیں ان میں پاکیزگی ہے مگر علم نہیں ہے اور

بعض ایسے ہیں کہ ان کے گرد دنیا دار لوگ ہیں۔ وہ اچھے ہیں مگر دنیا دار لوگ ان کی پناہ لیتے ہیں، میں نے ان میں امت مسلمہ کا درد پایا ہے اور سارے بنی نوع انسانوں کا درد دیکھا ہے، یہ رسول اللہ کا ورثہ ہے۔ میں ان سے باقاعدہ تو دسمبر 1997ء میں ملا، یہ جو واقعہ ہے جو درس ان کا سنا اور اس نے مجھے مجبور کر دیا اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ میں نے اپنے دل سے نکھا کہ نور کا ایک دریا ہے جو آدمی کو گم کرتا ہے اور اس کے میں نے مشاہدات کئے اور پھر دیکھا، میں نے اس کے باوجود کہ انسان ہیں انسانوں میں خامیاں ہو سکتی ہیں وہ تو صحابہ میں بھی تھیں اور صحابہ میں بھی تو عمر فاروقؓ ایک ہی تھے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی ایک تھے اور لوگوں میں کچھ کوتاہیاں اور خامیاں تو ہوتی ہیں مگر یہ سچے لوگ ہیں اور میں نے دعا بہت کی 'خانہ کعبہ میں بھی دعا کی پدینہ منورہ میں بھی دعا کی بہت نمازوں میں دعا کی کہ یا اللہ اس آدمی سے جوڑ دے۔ خیر ہے تو اس آدمی سے جوڑ دے اور میں سمجھتا ہوں یہ جو دل ان کی طرف مائل رہا ہے تو اس میں دعا کا بھی شاید دخل ہو۔

اور ایک اچھی بات آپ کو بتاؤں، حضرت جی کو بتائیے گا، میں آٹھ گھنٹے سوٹا تھا اور بڑی کوشش کی یہ کم ہو جائے، ایک دن کی نیند اگر کم کرتا تھا تو کام میں دقت ہوتی تھی، مگر اب ایسا ہوتا ہے کہ میں فجر تک کام کرتا ہوں اس کے بعد نماز پڑھ کر سوتا ہوں اور نو بجے اٹھ جاتا ہوں اور کام کرتا ہوں، دوپہر کو اگر موقع ملے تو آدھ گھنٹہ سولیتا ہوں اور نہ ملے تو کوئی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے فضل سے تازگی محسوس ہوتی ہے، ورنہ پہلے میں اگر نیند پوری کئے بغیر اٹھ جاتا تھا تو میرے گھر والے میرے قریب نہیں آتے تھے، ڈرتے تھے کہ یہ آئے گا اور لڑے گا، یقین کریں اللہ نے خاص رحم کیا ہے۔

## اجلے رنگ

- پسندیدہ کتاب۔ قرآن کریم
- پسندیدہ شاعر۔ فیض احمد فیض دینی اعتبار سے اقبال
- پسندیدہ پھول۔ چنبیلی رات کی رانی
- پسندیدہ کھیل۔ نشانہ بازی
- پسندیدہ موسم۔ سارے موسم انجوائے کرتا ہوں۔ مزاج انتہا پسندانہ ہے۔ سردیوں میں سخت سردی اور گرمیوں میں شدید گرمی پسند ہے۔
- پسندیدہ خوشبو۔ زعفران
- پسندیدہ ڈش۔ کباب
- پسندیدہ پھل۔ مگر میوں میں آم سردیوں میں مالٹا (لیکن شوگر کے باعث یہ پسند پرہیز میں بدل گئی ہے)
- پسندیدہ لباس۔ شلوار قمیض ڈاسکٹ اور سر پر پگڑی امریکہ، یورپ، انڈل ایٹ اور دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے اس پسندیدہ لباس کو



پنہ رکھا۔

اپنی ناپسندیدہ عادت  
چھوٹی چھوٹی بات کو محسوس کرتا ہوں۔ Hurt: ہوتا ہوں  
لیکن

غصہ کس  
انظار نہیں کرتا یہ میری کمزوری ہے۔  
دو غل بات اور منافقانہ روش برداشت نہیں ہوتی۔

بات پر آتا ہے۔

کس بات پر  
محبت کی باتوں سے محبت آمیز سلوک سے

خوش ہوتے ہیں۔

کوئی ذاتی خواہش تصوف نے استہر دیا ہے کہ مانتے کو کچھ چاہی نہیں ہے۔

جو تا حال تشنہ تکمیل

ہو۔

گھریلو امور میں گھریلو امور چوں نے سنبھال لئے ہیں۔ خانگی امور کی ذمہ

کس حد تک داری مجھ پر نہیں ہے۔

دلچسپی لیتے ہیں۔

روزمرہ معمول۔ ساڑھے تین بجے ہیداری 'تہجد' ذکر اذکار اور فجر کی نماز کے بعد

گھنٹہ ڈیرہ استراحت۔

۱۔ ناشتہ کے بعد دوپہر تک دفتر میں ملاقاتیں اخبارات کا مطالعہ

اور روزانہ کی میل دیکھنا۔

۲۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا اور نماز ظہر کے بعد قیلولہ

۳۔ نماز عصر کے بعد کھیتوں میں سیر یا شوٹنگ

۵۔ نماز مغرب کے بعد ذکر اذکار

۶۔ بعد نماز عشاء کھانا۔

۷۔ اس کے بعد باروچے تک مطالعہ 'اندرون ملک اور بیرون ملک کی ٹیلی فون کالز سننا۔

حوالہ روزنامہ

پاکستان۔ سنڈے معیجزین۔

## حضرت مولانا محمد اکرام اعوان

حافظ عبدالرزاق صاحب

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف

پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا مانی

حکمائے قدیم میں سے ارسلو کا یہ کہنا ہے کہ

Man is a Social Animal

حکماء کا ایک اور گروہ آدمی کی تعریف یہ کرتا ہے کہ ”آدمی حیوان ناطق ہے“ دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ آدمی کو حیوان سمجھتے ہیں۔ آدمی کی زندگی کے مختلف ادوار پر غور کیا جائے تو دونوں کی بات کی تصدیق ہوتی ہے وہ یوں کہ آدمی کا جنم ہر طرح حیوان کے، مشابہ ہے اور وہ بھی مطلق حیوان کے، کچھ مدت کے بعد وہ حیوان ناطق بن جاتا ہے۔ پھر لڑکپن آتا ہے تو ارسلو کی تعریف اسکی زندگی پر صادق آتی ہے۔ پھر جب تعلیم میں کچھ دور آگے چلتا ہے تو آدمیت کے آداب سیکھتا ہے۔ اب اس کی حیوانیت میں آدمیت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے دور ایں ہو جاتی ہیں کچھ وہ ہوتے ہیں جنکی شخصیت میں آدمیت کا عنصر غالب آ جاتا ہے اور ان

کی اکثر حرکات سے آدمیت کا نشان ملتا ہے۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کی آدمیت دب جاتی ہے اور حیوانیت غالب رہتی ہے اور یہ لوگ لاڑھے ہونے بلکہ مرنے تک آدمی نما حیوان ہی رہتے ہیں۔

وہ آدمی جن کی شخصیت میں آدمیت کا عنصر غالب ہوتا ہے ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جن کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو مخلوق میں بڑی ترقی حاصل ہے اس سے ذرا مختلف ہوتا ہے جن کی عقل کہتی ہے کہ کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دوسرے آدمیوں پر بڑی ترقی حاصل ہوتی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنے اصل مضمون کی طرف آتا ہوں مجھے یہ بتانا ہے کہ میں نے حضرت مولانا محمد اکرام اعوان کو کیسا پایا سو میں اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں۔

مجھے 1960 میں ایک ایسے انسان سے ملنے کا اتفاق ہوا جو صرف انسان ہی نہیں تھا بلکہ انسان سازی کا ایک چلتا پھرتا کارخانہ تھا۔ میری مراد استاذی المکرم حضرت مولانا اللہ یار خاں رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ 1960 میں انسان بننے کی آرزو لے کر حضرت کے سلسلہ نقشبندیہ اومیہ میں شامل ہوا اور سب سے پہلے جن قابل ذکر حضرات سے شناسائی ہوئی ان میں سے ایک حضرت مولانا محمد اکرام اعوان ہیں۔ آپ مجھ سے دو سال پہلے یعنی 1958ء میں حضرت سے وابستہ ہوئے۔ اس ملاقات تک آپ زندگی کے دو مراحل طے کر چکے تھے۔ جو اس عمر تک آدمی کر لیتا ہے۔ یعنی چھن لڑکپن۔ تعلیم اور جوانی کی بہار، میں نے محسوس کیا کہ ان میں تعلیم اور اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت کرتے ہوئے دو وصف موجود ہیں۔ اول احساس بڑی ترقی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علاقہ و نمار کے اعوان ہیں۔ اعوان ہونا اس علاقہ میں بڑی ترقی کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور یہ سمجھنا کسی حد تک درست بھی ہے۔ کیونکہ

اعوان نب کے اعتبار سے حضرت علیؑ کی اولاد ہیں۔ آپ کے والد ماجد پندرہویں پشت میں قطب شاہ صاحب سے ملتے ہیں اس لئے ان کو قطب شاہی اعوان کہتے ہیں اور چالیسویں پشت میں حضرت علیؑ سے جاملتے ہیں۔ لہذا ان میں برتری کا احساس ہونا ایک فطری بات ہے۔

اعوان اس علاقے میں ملک کھاتے ہیں اور ملک کے معنی ہیں بادشاہ۔ یہ لفظ ان کے احساس برتری کا واضح ثبوت ہے تو میری ملاقات جب ان سے ہوئی تو یہ ملک محمد اکرم ”دناریا“ تھے۔ دوسری بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ آپ صرف آدمی ہونے پر قانع نہ تھے بلکہ انسان بننا چاہتے تھے لفظ انسان کا مادہ ”انس“ ہے تو جب آدمی میں انس پیدا ہونے لگے تو وہ انسان بننا شروع ہو جاتا ہے مگر انس کس کے ساتھ؟ تو یہ انس پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے اپنے خالق کے ساتھ اور غیر شعوری طور پر ہوتا ہے کہ وہ کتنا مہربان ہے جس نے جسمانی ذہنی عقلی صلاحیتیں عطا فرمائیں وہ بھی بن مائے اور مفت۔ پھر انس پیدا ہوتا ہے۔ خالق کے اس شاہکار سے جسے چشم تصور کے سامنے دیکھ کر انسان کہہ اٹھتا ہے۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کر دی

مرابا جان جاں ہراز کردی

اور دل کی گہرائیوں سے یہ آواز گونجنے لگتی ہے کہ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اور انس کی خاصیت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ترقی کرتا ہے اور بڑھتے بڑھتے

محبت بن جاتا ہے۔ اور محبت چاہتی ہے محبوب کو تو ہاتھ آواز دیتا ہے۔

والذین امنوا اشد حبا لله

مجھے یوں محسوس ہوا کہ اسی کی آرزو لے کر اسی کی تلاش میں آپ نے اس

انسان ساز شخصیت کا دامن تھا ہے۔ یہاں اس حکیم مطلق کی حکمت کا ایک کرشمہ اور دیکھنے میں آیا وہ یہ کہ فطرت ماحول اور قانون توارث کے ماتحت جس شخص میں احساس برتری موجود ہو اسکے دل میں اتنی بڑی خواہش انگڑائیاں لینے لگے تو اسے اُر کوئی ایسا سرملی یا استاد مل جائے جو سوسائٹی میں نسلی اعتبار سے گھنیا شمار ہو تو اسکی خواہش کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں۔ تو حکیم مطلق نے اعوان کو مرشد جو دیا تو وہ بھی اعوان اور وہ بھی وہاں کا اعوان جو ڈانگ مار مشہور ہیں۔

خیر یہ بات یونہی بر سبیل تذکرہ آگئی۔ اپنے موضوع کی طرف چلتے ہیں انسان سازی کا قرآنی نام تزکیہ ہے اور فرائض نبوت میں سے تلاوت آیات کے بعد پہلا کام یہی تزکیہ تو ہے۔ اس فن کے ماہرین نے تزکیہ کا ذریعہ ذکر الہی کو قرار دیا ہے۔ اور اہل فن تزکیہ کے لیے یہی ذریعہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ میں مولانا کے کلاس فیلو کی حیثیت سے تزکیہ کے لئے ان کے ساتھ ذکر الہی کرنے لگا۔ ہم جب اجتماعی ذکر کرتے تھے تو طوائف سے مع سلطان الاذکار کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگاتے تھے۔ اور تنائی میں ملک اکرم صاحب ایک اظیفہ ایک گھنٹہ کرتے تھے اور اس زور سے جیسے زمین کانپ رہی ہے۔ یعنی اب ملک اکرم صوفی اکرم تھے مگر نہ انہیں کوئی صوفی کتا تھا نہ کھلاتے تھے، سوائے قاضی ثناء اللہ صاحب کے جو انہیں نجی محفلوں میں صوفی اکرم کہہ دیا کرتے تھے۔ گو ہم کلاس فیلو تھے مگر کلاس میں مانیٹر کی شان الگ ہوتی ہے۔ پھر یہ تفاوت اکثر اس اصول کے تحت ہوتا ہے جو اللہ کریم نے فرمایا ہے۔

لَبِيسَ لِلْاِنْسَانِ اَلَا مَا سَعٰی "یعنی انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔" پھر فرمایا۔ وَاِنْ سَعٰیهِ سَوْفَ یُزٰی "کہ اسکی کوشش کا جائزہ لیا جاتا ہے پھر ہم یجزاہ الجزاء الاولیٰ۔ پھر اس کو مزدوری پوری دی جاتی ہے۔ تو ان کی اس کوشش سے فوری طور پر مزدوری یہ ملی کہ انہیں مانیٹر بنا دیا

میا۔ اس کے لئے ایک واقعہ بنے۔

ہمارے شیخ الککزم جوانی کے زمانے میں یہاں چکوال کے قریب ایک گاؤں نام موہڑہ کور چشم میں پڑھتے تھے۔ اب جو شیخ سلسلہ کی حیثیت سے چکوال آتے تو ایک رات اس گاؤں میں گزارتے وہیں ذکر کی محفل جمتی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں حضرت کا ایک دوست تھا۔ غلام سرور نام تھا ایک دفعہ جو ہم وہاں گئے تو اس نے حضرت سے دوستانہ شکایت کی کہ آپ یہاں آتے ہیں لوگوں کو کچھ سکھاتے ہیں مجھے پوچھتے ہی نہیں۔ حضرت نے فرمایا اچھا آج مغرب کی نماز کے بعد یہاں ہمارے ساتھ بیٹھ جانا۔ چنانچہ ذکر شروع ہوا تو سرور موجود تھا۔ اس کو طریقہ ذکر بتانے کے بعد حضرت نے خوب زور سے ذکر کرایا۔ جب ذکر ختم ہوا تو پوچھا سرور! کیا کچھ سمجھ آئی۔ کہنے لگا مولوی صاحب (یہ اسی نام سے حضرت کو پکارتا تھا) عجیب منظر دیکھا ہے۔ آپ کے سینے سے نہایت تیز روشنی نکلتی تھی جیسی ریل گاڑی کے انجن کی ہوتی ہے۔ پھر وہ روشنی سیدھی اس کے سینے میں جاتی تھی۔ جو لمبے سے قد کا سا تھی ہے۔ پھر اسکے سینے سے چھوٹی چھوٹی شعاعیں نکل کے سارے ساتھیوں کے سینے میں پہنچتی تھیں۔ حضرت مسکرا دیئے اور فرمایا سرور! تو نے ٹھیک دیکھا ہے ساتھیوں کا تو پتہ نہیں مجھے دو باتیں محسوس ہوئیں اول یہ کہ Step-down trans-former کی تھیوری ہے۔ دوسرا میرے وجدان نے کہا کہ حضرت کے بعد یہ رشد و ہدایت کی ذمہ داری ملک اکرم صاحب کو سونپی جائے گی۔

یہ غالباً 1964ء کا واقعہ ہے یعنی قدرت نے انہیں اس وقت ہماری جماعت کا مانیٹر مادی اور بعد میں ان سے استاد کا کام لیا۔

یہ سلسلہ ذکر الہی برسوں جاری رہا۔ اب ساتھ ہی ملک اور ہرون ملک تزکیہ کے عمل کی ترویج و اشاعت کے لئے ان کا جانا ہوتا۔ میں بھی ”جمعہ چنانال“ اکثر ہوتا

تھا۔ اب آپ صوفی کے بعد مولانا اکرم مٹے جا رہے تھے۔ ہر جگہ ذکر کی محفل جمانا اور تزکیہ کے سلسلے میں میان کرنا اور میان ایسا شستہ جیسے کوئی اعلیٰ پائے کا ادیب کتاب الہی کے موتی بکھیر رہا ہے۔

آخر فروری 84ء میں تزکیہ کا آفتاب ماہتاب غروب ہوا اور مولانا اکرم صاحب اپنے شیخ کے جانشین کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد اکرم شیخ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ سجادہ نشین ہوئے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے اپنے شیخ مکرم کی نیامت کا حق ادا کرنے میں کس مستعدی اور جاں بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر اس سے پہلے آپ کی زندگی کا ایک پہلو زیرِ بحث لانا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اب تک پیش نہیں کیا جاسکا۔

..... کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہاں جی ہم جانتے ہیں عہد جوانی میں ان کی سوسائٹی علاقہ کے بدنام ترین لوگوں کے ساتھ رہی۔ جو برائی میں اپنی برتری منوانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب آپ ملک اکرم ہوتے تھے اور میری ان سے ملاقات تک نہیں ہوئی تھی اس بات کی بنیاد صرف روایت ہے جس کا تعلق ماضی بعید سے ہے اب کون راویوں کی تلاش کرے اور پھر ان کے ثقہ یا ضعیف ہونے کے متعلق پڑتال کرنا پھرے۔ اسلئے عقلی طور پر اگر اس روایت سے نمٹنا جاسکتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ایسا ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس بات کی شہادت کہیں سے نہیں ملی کہ آپ نے کبھی ان لوگوں کی کسی مہم یا کارروائی میں عملہ حصہ لیا ہو۔ چلو اس کو بھی امکان کے دائرے میں لے آتے ہیں۔ مگر یہ سب ایک فطری عمل ہے جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ اس فطری عمل کی نشاندہی نبی کریمؐ نے خود فرمائی ہے۔ آپ نے اپنے عظیم شاگردوں کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "کم فی الجاہلیۃ



خیار کم فی الاسلام۔" یعنی تم میں سے جن لوگوں کو جاہلیت کے دور میں سوسائٹی میں برتری حاصل تھی۔ اسلام لانے کے بعد انہیں اسلامی سوسائٹی میں بھی برتری حاصل ہے۔ مگر وہ کیوں؟ اس لئے ان میں فطری جوہر موجود تھا جو انسان کو عظیم بناتا ہے ماضی میں اس کا رخ جاہلیت کی طرف تھا اس لئے کہ وہاں عظمت حاصل ہوئی۔ اب اسی جوہر کا رخ للہیت کی طرف ہوا تو للہیت کے میدان میں برتری حاصل ہو گئی۔ اس کی ایک مثال ہمارے اپنے اس تزکیہ کے میدان میں بھی ملتی ہے۔

حضرت فنیل بن عیاض اپنے دور کے ایک عظیم ولی اللہ گزرے ہیں۔ تزکیہ کے عمل سے پہلے آپ ایک مشہور ڈاکو تھے۔ دیکھ لیجئے جوہر موجود تھا جب اس کا رخ برائی کی طرف تھا تو آپ نے ڈاکو کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کیا اور جب اللہ کی طرف رخ ہوا تو ولی اللہ بن گئے۔

ایک من چلے شاعر نے کیا خوب نکتہ پیدا کیا ہے۔ کہتا ہے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا  
وہ سپاہ کی تیغ بازی یہ نگاہ کی تیغ بازی

حاصل یہ کہ اللہ کریم نے جو فطری جوہر ان میں رکھا ہے اسے جب صحیح رخ پر لگایا گیا۔ تو آپ ملک اکرم و نہاریا سے حضرت مولانا محمد اکرم اعوان بن گئے۔

اب آئیے حق نیات کے موضوع پر۔ حضرت شیخ المکرم کو اللہ کریم نے مردم شناسی کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کی نگاہ انتخاب جس فرد پر پڑی اس میں غلطی کا نشان تک نہیں تھا۔ حضرت کے جانشین کے چند کارہائے نمایاں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱)۔۔۔۔۔ آپ نے سب سے پہلے تزکیہ کے لئے ایک مرکز

تعمیر کیا جس کا نام دارالعرفان ہے۔ حضرت شیخ کے زمانے میں اصولاً اسکی بنیاد رکھ دی گئی تھی مگر بعد میں وجود میں آیا وسیع مسجد عظیم لائبریری ساتھیوں کی رہائش کا انتظام وسیع کچن، وضو اور غسل کا انتظام اور ایک PCO یعنی ساری جدید ضرورتیں پوری کر دیں اور سالانہ اجتماع جو 40 دن تک پھیلتا ہے لازمی قرار دے دیا گیا اور مسجد کے ساتھ اپنا حجرہ جس کو جدید زبان میں دفتر کہتے ہیں اور جس میں دنیا بھر کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا انتظام موجود ہے۔

(۲)۔۔۔۔۔ اپنے شیخ کا مشن یعنی تزکیہ کے کام کو پھیلانے کے لئے پرانی دنیا اور نئی دنیا میں آپ نے دورے کئے اور کرتے رہتے ہیں۔ ایشیا کے ممالک کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں جا کر مختلف مرکزی مقامات پر اللہ کا پیغام پہنچایا اور امریکہ جیسے ملک میں تزکیہ کی شمع روشن کی۔ میرا خیال ہے اسرائیل کے علاوہ شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ہو جہاں تزکیہ کے لئے ذکر کی محفلیں نہ جستی ہوں۔

(۳)۔۔۔۔۔ زبانی تبلیغ اور علاوہ تربیت کے علاوہ آپ نے تصنیف و تالیف کا کام بھی ان پندرہ برسوں میں کافی کیا ہے۔ مثلاً اسرار التزیل کے نام سے تفسیر قرآن دس جلدوں میں مکمل کی۔ جو طبع ہو چکی ہے اس کے علاوہ کئی کتب لکھی ہیں جو تزکیہ ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۴)۔۔۔۔۔ ان کے کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں یہ تو

آپ جانتے ہیں کہ شاعر ”نئے“ نہیں شاعر ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہی حقیقی شاعر ہوتے ہیں اور وہ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر ان کی زبان سے نکلتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ ”مشغلہ“ کیوں اختیار کیا گیا ہے تو اس کا جواب ترجمان حقیقت کی زبان سے سنئے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست  
سوئے قطار آدم ناقہ بے زمام را  
یعنی جن طبائع میں شعر کا ذوق ہے انہیں اسی کے ذریعے اللہ کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ اور شعر کی تعریف حسرت موہانی سے سنئے۔ کتاب ہے۔

شعر دراصل ہے وہی حسرت  
سننے ہی دل میں جو اتر جائے  
امید ہے کہ آپ کو حضرت کے شعری مجموعہ میں ایسے شعر ضرور ملیں گے۔

سیماب یہ کلام میں ہوتی نہ گرمیاں  
تو نے کبھی کسی سے محبت ضرور کی  
(۵)۔۔۔۔۔ شیخ المکرم کے اس دنیا سے سفر کر جانے کے بعد  
ملک میں ایک ڈرامائی تبدیلی آئی۔ ڈرامائی اس لئے کہ حقیقت  
میں تبدیلی کوئی نہیں آئی محض ڈراما چلایا گیا اور اس ڈراما میں  
اوپر سے نیچے تک سارا ملک شامل تھا۔ اس تبدیلی کا اجمال بیان  
یہ ہے۔

نصف صدی کی طویل مدت میں اس ملک کے کالے انگریز حکمران ان کے  
حواری اور پوری قوم .... خود فریبی کی فنکارانہ مشق میں سرگرم عمل

رہے۔ قوم جس نے ایک وقت چیخ چیخ کر پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کے نعرے لگائے تھے پاکستان بننے کے بعد اس قوم کو موقع دیا گیا کہ اب لا الہ الا اللہ کی بہادر دیکھنے کے لئے مناسب حکمرانوں کا انتخاب کر لو۔ نصف صدی میں نہ جانے کتنے الیکشن ہوئے مگر ہر الیکشن میں اس جموں نے نعرے لگانے والی قوم نے حکمران ایسے چنے جن میں صرف ایک وصف قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا رہا اور وہ یہ کہ مردم شماری کے کاغذات میں ان کے نام کے سامنے ”مسلمان“ کا لفظ غلطی سے لکھا جاتا رہا۔

اس کے علاوہ لا الہ الا اللہ سے کوئی مناسبت ان میں نہ پائی گئی۔ چنانچہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک اس ملک میں لا الہ الا اللہ کا دور تک کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ سیاست کا فرانہ۔ معیشت کا فرانہ۔ قانون کا فرانہ۔ تعلیم کا فرانہ غرض ہر شعبہ زندگی پر کفر کا پورا پورا تسلط موجود ہے۔

بچھلے چند برسوں سے نہ جانے یہ آواز کیسے اٹھی کہ ملک میں نفاذ شریعت ہو۔ نظام مصطفیٰ رائج ہو۔ اسلام نافذ ہو۔ یہ آواز کچھ اس طرح گونجی کہ حلقہ بہیرا منڈی اور حلقہ چار سده کے بغیر ملک کے چہ چہ کی زبان پر نفاذ شریعت کے الفاظ چڑھ گئے۔ حتیٰ کہ ہمارے کالے انگریز حکمرانوں نے بھی سر ملا کر نفاذ شریعت کا تہیہ کر لیا۔ اور ایک عدد نفاذ شریعت بل بھی ایوان زیریں میں پیش کر دیا۔ یعنی اسے برگزیدہ مسلمانوں! تم اگر اجازت دو تو اس ملک میں اللہ کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس شریعت بل کی حقیقت ایک ماہر فن کی زبان سے سچے فرماتے ہیں۔

”موجودہ شریعت بل میں شریعت کے سوا سب کچھ ہے (جنس جاوید اقبال) نوائے وقت 19-10-92۔“ یہ ہے اداکاری کا کمال۔ خدا جانے کس طرح ان برگزیدہ مسلمانوں نے ہاں کر دی مگر یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ہو جاتا۔ ایک مرحلہ ابھی باقی تھا وہ یہ کہ ایوان بالا۔ یعنی وہ مجلس جس میں

مصرف پر مزیدہ نہیں بلکہ کلاس ون منچے ہوئے مسلمان-Cream of the Na-tion جمع ہیں۔ اس سے بھی منظوری یعنی ہے کہ مسلمانوں کے اس ملک میں اللہ کا قانون نافذ کرنے کی اجازت دیں۔ مگر ان اونچے درجے کے مسلمانوں کا حدود و اربعہ سب کو معلوم ہے۔ اس لئے اب تک اس بالائی ایوان میں یہ بل پیش کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ گویا یہ ڈرامہ ابھی تک انجام کو نہیں پہنچا اور کیفیت یہ ہے کہ

نہ انکاری کم نہ ایں کاری کم

اس ڈرامے میں ملک کی چند سیاسی جماعتیں بھی شامل ہو گئیں جن پر دینی جماعت کی سمت بھی لگی ہوئی ہے۔ اور ان کے جلوس اور ریلیاں اور جلسے وقفے وقفے سے ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر ہمارے مولانا کو بھی خیال آیا کہ کرنے کا کام تو یہی ہے۔ ذکر الہی کا حاصل صرف اپنی ذات پر اللہ کا قانون نافذ کر لینا ہی نہیں بلکہ ذکر الہی کا ثمرہ تو یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہو۔ چنانچہ آپ نے الاخوان کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کی جس کا نعرہ ہے "رب کی دھرتی رب کا نظام" آپ کے سامنے غالباً سلسلہ نقشبندیہ کی یہ خصوصیت بھی ہو کہ اکبر کے دین الہی کے طوفان کے سامنے جو ہستی ہمالیہ بن کر کھڑی ہو گئی وہ نقشبندیہ سلسلہ کے ایک بطل جلیل حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی ذات تھی۔ پھر شاید آپ کے ذہن میں ترجمان حقیقت کا یہ شعر بھی ہو کہ

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میر اوطن وہی ہے میر اوطن وہی ہے

یہ ٹھنڈی ہوا یہی ہے کہ رب کی دھرتی رب کا نظام ہو۔ آپ نے جماعت کی تشکیل کے بعد پورے ملک میں دورے کئے چنانچہ لاکھوں مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی۔ یعنی یہ عہد کیا کہ نفاذ شریعت کے لئے ہم اپنی جانوں کا نذرانہ

پیش کر کے رہیں گے۔ چنانچہ اب ذکر الہی کی محفلوں کے ساتھ نفاذ شریعت مهم بھی چل رہی ہے۔

مولانا نے اپنے شیخ کے مشن کو جاری ہی نہیں رکھا بلکہ اس میں انفرادیت سے ترقی کر کے اجتماعیت کی روح بھی پھونک دی۔

اللہ کریم نے ان میں جو تین وصف رکھے ہیں 'انتظامی قابلیت۔ اخلاص۔ اور ایثار۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب یہ ڈرامہ حقیقت بن کے منظر عام پر آئے گا۔

آمین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی  
 اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہمی  
 مولانا نے اپنے شیخ مکرمؒ کے مشن کی ترویج کے لئے ایک نیا  
 Plan تیار کیا۔ انہوں نے غالباً اکبر الہ آبادی اور اقبال لاہوری  
 کی نگاہ سے حالات کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی قوم کے  
 بچے اور بچوں کے چوں کی تعلیم و تربیت پر ہے۔  
 جیسے اکبر نے کہا ہے۔

بچے میں ہو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی  
 دودھ ہے ڈبے کا اور تعلیم ہے سرکار کی  
 یا ایک مقام پر کہہ گیا ہے کہ۔

ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے  
 یا جیسے اقبال لاہوری کہہ گیا ہے کہ۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو  
 ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تائیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ نسخہ  
 سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تو مولانا نے یہ پلاننگ کی کہ اللہ کے بندوں کی پیری تیار کی جائے چنانچہ آپ  
 نے صفارہ اکیڈمی کے نام سے اپنے مرکز دارالعرفان میں دو سکول کھولے زنانہ  
 اور مردانہ جن میں میٹرک تک تعلیم دی جاتی ہے اور چوں کہ رہنے کے لئے ہاسٹل  
 بھی بنایا۔ اب یہاں بچے اسکول ٹائم میں اسلامی روح پر مبنی تعلیم حاصل کرتے  
 ہیں۔ اور باقی وقت ہوٹل میں رہ کر اللہ کا بندہ بننے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ اس طریق کار  
 سے امید افزاء نتائج حاصل ہوئے۔ تو لاہور میں بھی صفارہ اکیڈمی کے نام سے یہی  
 تعلیمی سلسلہ جاری کیا۔

1990ء میں اس کو انٹر میڈیٹ کالج بنادیا گیا۔ ماحول اور حالات نے بتایا کہ یہاں  
 مردانہ کالج کی جگہ زنانہ کالج کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ اب وہ زنانہ کالج صفارہ  
 اکیڈمی کے نام سے کام کر رہا ہے۔ تاکہ قوم کو ایسی مائیں میسر آجائیں جن کی گودوں  
 میں پلنے والے بچے واقعی اللہ کے بندے ہوں۔

## میرا شیخ بس ایک بندہ حق ہی تو ہے

مقبول احمد گھنٹہ صاحب

وسط جولائی ۹۹ء کی ایک دلپذیر صبح معمولات کے لئے بیدار ہوا تو اہلیہ نے بتایا کہ رات سو گیا رہے لاہور سے بٹری انجائز نامی کسی خاتون کا ٹیلیفون آیا تھا۔ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ میں نے بتایا کہ وہ سو گئے ہیں تو انہوں نے متحیر آواز میں فرمایا۔

”وہ دن چھپے ہی سو جاتے ہیں کیا؟ آپ انہیں اتنی جلدی سونے کیوں دیتی ہیں؟ ہمارے ہاں تو شام ابھی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے کھانا کھایا ہے۔ مگر آئے ہوئے مہمانوں سے گپ شپ کی ہے اب الوداع کہہ کر فون کیا ہے تو آپ فرما رہی ہیں کہ وہ سو گئے ہیں۔ اتنی جلدی سونے کی کیا تک ہے۔ چلو خیر! میں کل رات کو دوبارہ فون کروں گی۔ اللہ حافظ“

”انہوں نے صرف اتنی سی باز پرس کے بعد ازراہ التفات فون بند کر دیا تھا“ اہلیہ



نے بات ختم کی تو بڑی بیٹھی ڈاکٹر آسیہ نے گرہ لگائی کہ موصوفہ کبھی کبھار فی وی پر آتی ہیں اور شعرو خن کے حوالے سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ بہر حال مجھے اٹکایہ انداز تک بھلا گا مگر میں غصے میں پڑ گیا۔ کہ اللہ جانے ان محترمہ کے نزدیک رات کے اوقات کا حدود اور بعد کیا ہوتا ہو گا جو سوا گیارہ بجے کو شام کا نام دے رہی ہیں۔ اس سارے پس منظر میں پسلا تاثر یہ تھا کہ آپ ایک بے باک 'مرنجان مرنج' وضع دار اور لطیف ذوق سے مزین خاتون ہیں جو شاید اسی تناظر میں کسی موضوع پر بات کریں گی۔

سارا دن جھوم کار میں مصروف رہا۔ شام کو ذکر اللہ کی محفل سے فارغ ہوتے ہی دفتر کے ٹیلی فون کی گھنٹی جی تو پتہ چلا کہ بشریٰ اعجاز صاحبہ لائن پر طلب فرما رہی ہیں۔ غلیک سلیک کے بعد انہوں نے جو بات چھیڑی وہ میرے لئے نہایت حیران کن اور غیر متوقع تھی۔ میری عاجزانہ بساط سے یہ سب کچھ کہیں وراء الور اٹھا۔

آپ نے فرمایا کہ میں حضرت جی مدظلہ کی حیات مبارکہ پر ایک کتاب لکھ رہی ہوں اس ضمن میں آپ کی تحریری معاونت و مشاورت درکار ہے۔ مجھے اپنے دفتر سمیت گرد و پیش کا ماحول گھومتا ہوا نظر آیا زمین اپنے محور سے ہٹی محسوس ہوئی کہ یہ خاتون نہایت معصومیت اور سادگی سے ایک ہی فقرے میں آغا فانا کیا سے کیا کہہ گئی ہے۔ یقیناً یہ میری کم ہمتی، کم علمی اور کج فہمی کی بابت ایہام و تشکیک میں مبتلا نظر آتی ہیں ورنہ ضرور غفور و درگزر کا مظاہرہ فرماتیں۔

بھلا مجھ جیسا کمزور اور حقیر انسان اپنے شیخ محرم و معظم کی نور الوہیت بجھنے والی ضیاءوں سے بھرپور نور فیضان مصطفویٰ سے قلوب کو گرمانے والی پر سرور روشنیوں پر محیط حیات مبارکہ کو احاطہ تحریر میں لانے کی جرات زندانہ یا کاوش خسروانہ کر سکتا ہے؟ یا پھر بہ امر مجبوری حرکت کر بھی بیٹھے تو کیا کا حقہ انصاف کر

سکتا ہے؟ اس کا جواب لاریب نفی میں ہے۔

میں نے بھڑئی اعجاز صاحبہ کی اس بے باکی اور اپنی بے ہمتی پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ دن اس خوش فہمی میں گزر گئے کہ محترمہ اپنی جوانی طبع سے اب باز آگئی ہوں گی۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر ایک دن دوران اجتماع دارالعرفان منارہ میں حضرت جی مدظلہ کے دفتر میں حاضر بیٹھا تھا کہ آپ اچانک مخاطب ہو کر فرمانے لگے "بھڑئی اعجاز نے آپ کو میرے بارے میں کچھ لکھنے کا کہا تھا؟" میں جواباً بکمانے لگا "مگر اندھانے لگا دل کی دھڑکنوں کو سہانے لگا زبان کو بولنے کے قابل بنانے لگا" ماتھے پر پسینے کو چھپانے لگا اور بولنے کے لئے الفاظ بنانے لگا تو میری انتہائی عظیم المرتبت "قلوب کو بھانے والی" معصومانہ تقدیس سے بھرپور داداؤں والی اور سب سے بڑھ کر نبی رحمت ﷺ کی ابدی حضوری گھنیری چھاؤں والی یہ ہستی حسب سابق دلربا انداز میں گویا ہوئی "شاہ جی! لکھ چھوڑو اللہ ہمت دے گا"

میں اسی وجہ سے ہمت کر رہا ہوں کیونکہ اب یہ میرے شیخ مقدس کی صرف خواہش ہی نہیں رہی بلکہ ان کا حکم بھی شامل حال ہے اس کے علاوہ سب سے قیمتی تو انکی توجہ عالی اور مجھ ناچیز پر اعتماد اور تيقن ہے جو اس تحریر کا مضبوط ترین سبب بن رہا ہے۔

آج رات سونے کی تیاری کرنے لگا تو بیٹے نے بتایا کہ لاہور سے بھڑئی اعجاز صاحبہ کا ٹیلی فون ہے۔ مجھے قطعی باور ہونے لگا کہ یہ نئی نویلی صوفیہ آج مجھے ہرا کر دم لے گی۔ لہذا فون سننے سے پہلے بلا مبالغہ میں نے اعلان کر دیا کہ میرا کمرہ فوراً خالی کیا جائے، میز پر دو قلم اور چند سفید کاغذ رکھ دیئے جائیں۔ کڑک چائے پلائی جائے اور ساری رات با ملاحظہ سکوت اختیار کیا جائے۔ میں نے ماہتاب کے ارد گرد منزلانے والی کھکشاؤں سے دعاؤں کی فرمائش کرتے ہوئے آج کی تاریخ میں رات

محترمہ بھرنی اعجاز صاحب کی پر غلو ص یاد دہانی کے طفیل اپنے محبوب از جان شیخ معظم و مکرم و محترم کے نام لکھ دی ہے اور ان کی حیات مبارکہ کے چند مختصر ترین پہلو احاطہ تحریر میں لانے کی جسارت کرنے چلا ہوں۔

اس تیاری کے بعد محترمہ کا فون سنا تو وہی ڈھاک کے تین پات۔ یعنی تفتیش آمیز استفسارات! آپ نے مضمون لکھ لیا؟ لاہور آئے تو ملاقات کیوں نہ کی؟ اب آئیے تو ضرور ملیے اور ہاں مضمون ساتھ لانا نہ بھولے گا تاکید ہے۔ یہ آخری فقرہ وہ تو نہایت روانی سے اور نتائج سے بے خبر کہہ گزریں مگر میں ہوں کہ اس لمحے سے اب تک کئی دفعہ ہاتھ کو قلم سے آزاد کرنے کی سعی لا حاصل کر بیٹھا ہوں۔ رات ہے کہ دھم دھم جا رہی ہے اور اس سب پر طرویہ کہ شیخ حکرم کی تاریخ ساز شخصیت کے پہلو دھیرے دھیرے دماغ کی سکرین سے ہوتے ہوئے قلب کے تار چھیڑتے ہوئے اور قلم کی نوک پر یلغار در یلغار کرتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ چلو تاروں بھری رات ہے اور ہم ہیں صبح کچھ تو ہوا پڑا ہو گا۔ انشاء اللہ۔

اس سے پہلے بھی شیخ المکرم کی خواہش اور حکم کی جا آوری کے طور پر ایک تحریر لکھ چکا ہوں۔ جس میں یہ اہل حقیقت ریکارڈ پر موجود ہے کہ "ہمارے درمیان سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے تمام انعامات و کرامات سے مزین ایک وجود پوری آن بان سے موجود ہے۔ جس کی لکار سے طاغوت لرزہ بر اندام ہے اور اہل حق اسکی قیادت میں کفر پر یلغار کرنے کے لئے صف ہدی میں مصروف ہیں۔ میری مراد اپنے شیخ طریقت، مفسر قرآن، قاسم فیضان، غازی دوران، پاسبان سنت خیر الانام، امام قافلہ اسلام اور امیر تنظیم الاخوان حضرت مولانا محمد اکرم اعوان ہیں"

"میں اپنے اس عزیز از جان قائد کے اوصاف و خصائص کا احاطہ کرنے سے اپنے آپ کو اس لئے قاصر سمجھتا ہوں کہ آئندہ آنے والی نسل انسانی شاید اس کا صحیح

حق ادا کر سکے اور یہ امانت اس کے سپرد کرنا ہی مناسب ہے مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا  
باق نہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایک زمانہ ان کی صلاحیتوں کا معترف ہو گا۔ قرطاس ارض پر  
ان کے ثبت کردہ گہرے اسلامی نقوش امت محمدیہ کے لئے رہتی دنیا تک باعث  
طمینت و فخر و انبساط ہوں گے۔

لہذا مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کیا لکھوں کہاں سے شروع کروں اور کہاں اختتام  
کروں اور یہ سب کچھ کیوں کر کروں۔ کیونکہ تصوف میں آپ جس کو شیخ مانتے ہیں  
پھر زمین کی پشت اور آسمان کی چھت تلے چلنے والے کسی شخص کو اس جیسا نہیں مانتے  
اگر مانتے ہیں تو آپ منافق، دھوکے باز، عیار اور مفادات کے اسیر ہیں۔ قانون  
تصوف کی رو سے قابلِ گردن زدنی ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر حوالہ دیا ہے کہ جب آپ شیخ کے اوصاف و خصائص کا  
احاطہ کرنے کی اہلیت ہی سے محروم ہوں تو پھر ان کی سیرت مبارکہ پر لکھنے کے کیا  
معنی؟

اگر بغیر نبی محال یہ بارگاہ اپنے مرئی و محسن شیخ مقدس کی خصوصی توجہ مطہرہ  
کے طفیل اٹھانے کی سعی کر بھی لوں تو ان کی شخصیت کے کس پہلو سے بات شروع  
کروں۔ کیونکہ میں یہ کہنے میں ذرا ہمدرد تامل محسوس نہیں کرتا کہ جب آپ شیخ کی  
شخصیت کے اوقیانوس میں غواصی شروع کرتے ہیں تو پھر ایک ایسے بحرِ بے کنار سے  
واسطہ پڑتا ہے جس کی وسعتوں کو ناپنا ممکنات کے زمرے میں آتا ہے۔ اس حقیقت  
پر خود قرآن کریم نے مرتد بلیغ ثبت کی ہے۔ فرعون کے روبرو جب اسکی سلطنت  
کے آزمودہ کار جادوگر نبوت موسوی کے پاکیزہ اور تقدیس سے بھرپور انوارات کے  
طوفانِ بے محابہ میں مستغرق ہوئے تو خود اپنی ماہیت و انفرادیت کھو بیٹھے اور آئینہ  
قلب موسوی میں ذاتِ باری کے جلووں کا نظارہ کرنے لگے۔ فرعون کی دربار کی حدود و

تبد کو جوتی کی نوک پر رکھا اور براہ راست رویت باری سے فیض یاب ہوئے انہی  
بایاب اور پاکیزہ کیفیات باطنی کی خوشہ چینوں کا منظر ہی تو قالب شیخ ہوتا ہے۔ پھر ایسی  
شخصیت کی حد مہیاں کن پیانوں سے کی جائیں۔

چلو! اس موضوع پر اہمہ اتو کرتے ہیں انشاء اللہ آنے والی نسلوں میں سلسلہ  
عالیہ کے چند خدام مزید کچھ ضوفشانی کا حق ادا کریں گے۔

مارچ ۶ ۱۹۷۶ء کا ذکر ہے میں تو پختانہ سکول نوشہرہ میں کورس کر رہا تھا۔ ہماری  
کلاس کے ایک کیپٹن نے بڑی لجاجت سے اعلان کیا کہ آج شام ASC سکول کی مسجد  
میں ایک مہمان آرہے ہیں اور وہ قرآن کریم کے کسی موضوع پر بات کریں گے۔  
تمام دوستوں سے شمولیت کی اپیل ہے۔ اس دلربا شام چند دوستوں کے ساتھ مجھے  
تیار ہو کر سینما دیکھنے جانا تھا مگر شو مئی قسمت (حقیقتاً زندگی کی یہ سعد ترین گھڑی  
تھی) کہ کیپٹن صاحب نے مجھے دھر لیا اور زبردستی ٹائٹل پر لاد کر مسجد میں لاٹھایا۔

مغرب کی نماز باجماعت (بادل نحواست) پڑھی۔ نماز کے دوران بھاگنے کی  
سوجھی تو پیچھے کی صف میں فوجیوں کی ایک قطار ایستادہ نظر آئی۔ آگے بھی راستہ  
مفقود تھا۔ قہر درویش برجان درویش نماز کے بعد ایک شخص سفید چمکتا ہوا لباس  
زیب تن کئے ہوئے خوبصورت گچڑی میں ملبوس منبر پر متمکن نظر آیا۔ قرآن کریم کو  
عقیدت سے چوما، آنکھوں سے لگایا اور کھولا تو آیت پڑھی جس کی شرح جو غائباً مجھے یاد  
ہے کچھ اس طرح تھی کہ اللہ اور اس کے رسول کی دوستی میں اس قدر گہرائی اختیار  
کرو کہ تمہاری ہر حرکت سے اس دوستی کے آثار نمایاں ہوتے چلے جائیں۔ یہ بات  
بظاہر تو روایتی وعظ پر مبنی لگی مگر جس مدے کی زبان سے ادا ہوئی وہ غیر روایتی  
شخصیت محسوس ہوئی۔ پر سوز رقیق القلبی سے بھرپور ماحول اور اس پر مستزاد  
انداز بیان بڑا اچھوتا تھا۔ اس سارے وعظ کا ایک نکتہ مجھے ہمسمل کر گیا وہ یہ تھا "تم

فوجی لوگ ہو۔ میدان کارر از میں کام آنے کے لئے ہو۔ جب کبھی تمہارے جسم کے ٹکڑے ہونے لگیں تو دیکھنے والے کہہ انھیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے دوست کی جان سے الگ ہو کوئی پرزہ پڑا ہوا ہے۔ صحابہ کبار جب شہید ہوتے تھے تو انسانوں کے جھرمٹ میں ان کے اجسام مطہرہ کو ڈھونڈنے میں ذرہ برابر دقت یا دشواری نہیں ہوتی تھی۔ دور سے پہچانے جاتے تھے کہ کسی مقدس ترین ہستی کی دوستی کے طفیل جان جان آفرین کے سپرد کئے پڑے ہیں۔“

کچھ دیر وعظ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر اچانک اعلان ہوا کہ تھوری دیر کے لئے محفل ذکر ہوگی میں نے دل میں تہیہ کر لیا اگر تو اللہ کے ساتھ دوستی لگانے والی کوئی سبیل نظر آئی تو بیٹھوں گا ورنہ چل دوں گا۔ جو نئی وعظ نے ذکر شروع کر دیا میں نے دل کی گمراہیوں سے یہ پیغام نشر ہوتا ہوا سنا کہ ”اللہ کے ساتھ دوستی لگا لو۔ وہ تمہارا دوست بن چکا ہے“

وہ دن اور آج کا دن الحمد للہ ثم الحمد للہ۔۔۔۔۔ دوستی۔۔۔۔۔

میں ربع صدی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو کوئی ذی شعور انسان اندازہ کرے کہ اس دن والے وعظ مکرم کے احسان عظیم کو اب کیا نام دوں۔ بس محبت سے لبریز جذبات اور عقیدت سے بھرپور تلاطم خیز طوفانوں کو سینے میں چھپائے پھر تاربتا ہوں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ اپنے اس ابتدائی رہبر اور موجودہ شیخ کو میں کن الفاظ سے پکاروں۔ کیا اردو زبان کا کوئی لفظ اس معیار پر پورا اترتا ہے جو میں چاہتا ہوں حاشا وکالا۔ نہیں۔

اصل میں یہ جذبات کی زبان ہے اور اسکی ترجمانی الفاظ نہیں کیا کرتے صرف جذبات سے بھرپور قلوب ہی ایک دوسرے کی گہرائی کو سمجھتے ہیں۔

زمانے کا دھارا اپنے مخصوص انداز میں خراں خراں بہتا ہی رہتا ہے اس میں

اپنے خاص خزانوں سے عطا فرما جو تیری شان کے لائق ہے۔ انعام کا انتخاب میں تیری ذات مقدس پر چھوڑتا ہوں۔“ جواب میں مجھے ارشاد ہوا کہ تیرے اس ”مراد“ کو میں تیری دعا کے طفیل ایک ایسا انعام عطا کرنے لگا ہوں جو اس کے بعد امت محمدیہ میں اس طرح پھر کسی کے حصے میں نہیں آئے گا۔ میں ہمہ تن گوش ہوا تو اسکے قلب کو تجلیات ربانی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ اللہ کریم نے اپنے ذاتی کام یعنی فہم قرآن کے مقدس ترین انعام سے اس انداز میں نوازا کہ اب کبھی کبھار یہ قرآن کے نکات اس انداز میں اٹھاتا ہے کہ مجھے انگشت بدنداں کر دیتا ہے۔ آئندہ اس پائے کی قرآن فہمی اب کسی کے حصے میں نہیں آئے گی۔

میری کمزور فہم کے مطابق ”اسرار التزویل“ اسی انعام کا تسلسل ہے جس نے آج کے مغرب زدہ ذہن آلود قلب و ذہن کے حامل افراد کو صیقل کر دیا ہے۔

اپنے موجودہ شیخ المکرم کی شخصیت کے بارے میں میرا ایک انوکھا تاثر ہے کہ سلسلہ عالیہ کی ترویج یا نفاذ اسلام کی تحریک کے لئے کسی لمحہ جس خصوصیت یا قابلیت کا تقاضا ہے۔ وہ اسی لمحہ حضرت جی مدظلہ کو فوری القایا عطا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے انہیں علیحدہ سے کوئی مجاہد یا مطالعہ نہیں کرنا پڑتا۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ بعض اوقات کسی نہایت اہم اور مشکل مسئلہ پر کئی روز تک سوچ و چار میں غرق رہنے کے بعد بھی جب کوئی سبیل سمجھ میں نہیں آتی تو لاچار معاملہ حضرت جی مدظلہ کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ بارہا میں نے اسی قسم کی پریشانی میں مبتلا دفتر میں قدم رکھا۔ حضرت سے نگاہیں چار ہوئیں۔ سلام کا تبادلہ ہوا اور قلب پر اس مسئلے کا حل نقش ہو گیا۔ ازراہ تصدیق جب آپ سے وہ مسئلہ عرض کیا تو آپ نے وہی جواب فرمایا جو پہلے سے میں سمجھ چکا تھا۔

اب اس کیفیت کو میں الفاظ کا کونسا جامہ پہناؤں۔ کیا یہ حبرک لطافتیں قلوب

مزین اور سانسوں کی آہٹ سے لطیف تر پاکیزہ جذباتوں سے بھر پور کوئی سرسبز راہ  
 آشکارا کرنے چلے ہیں وہ ہمہ بھی اسی معیار کا حامل ہے جو آپ نے اپنی قلب و ذہن  
 میں ان باتوں کے لئے مقرر کر رکھا ہے ؟

کیسے ایسا ہو جائے کہ گذریوں کے جھرمٹ میں آپ چمکتے ہوئے ہیروں کی  
 تھیلی کھول بیٹھیں اور وہ انہیں کنکر سمجھ کر اپنے ریوڑ ہانکنے پر صرف کر دیں یا کہیں  
 آپ اس انجام کو جا پہنچیں جو تاریخ تصوف میں منصور حلاج کو بھگتنا پڑا۔ یہ بھی خارجی  
 از امکان نہیں کہ آج کے پرفتن دور میں امام احمد بن حنبلؒ کی تاریخ آپ پر ہی نہ دہرا  
 دی جائے۔

سلسلہ عالیہ کے ساتھ منسلک ہونے کے بعد بڑے حضرت جیؒ اور موجودہ شیخ  
 الکرم کی رفاقت میں اکثر اوقات ہم رکاب ہونے کی سعادت نصیب ہونے  
 لگی۔ غالباً اگست 1979ء کا ذکر ہے کہ بڑے حضرت جیؒ میرے غریب خانہ پر ملتان  
 جلوہ افروز تھے۔ مہربان تہذیب تذکرہ ایک دن فرمانے لگے کہ بچھلی دفعہ جب عمرہ پر  
 حاضری ہوئی اور حرم کعبہ میں طواف و داع کے بعد احباب گزر گزرا کر دعائیں مانگ  
 رہے تھے اور اپنے ظرف و ساط کے مطابق انعامات ربانی پارہے تھے تو میں نے محسوس  
 کیا کہ ”اکرم“ ان سب سے الگ تھلگ اپنے پرہجوم خیالات میں گہرا گم سم کھڑا  
 ہے۔ میں نے ازراہ شفقت قریب بلایا تو پھٹ پڑا۔ عرض کرنے لگا۔ ”حضرت مجھے  
 تو اس طرح بے ڈھب رونے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ لوگ آپ کی معیت سے  
 فائدہ اٹھا کر انعامات سے سرفراز ہو رہے ہیں۔ مجھے بھی کوئی طریقہ یا سلیقہ ارشاد  
 فرمائیں کہ کچھ تو حصہ پاسکوں“ حضرت جیؒ نے فرمایا مجھے اس کا یہ معصومانہ مطالبہ  
 بہت پسند آیا۔ میں نے صرف اسی کے لئے بیت اللہ کے خلاف کو پکڑ کر رب قدوس  
 کے حضور دعا کی کہ ”اے بارالہ! میرے اس مرید (نہیں۔ مراد) کو کوئی ایسا انعام



نبیب و فراز، محسن اور کشادگی آزمائش و کشائش شاہِ بھلا چلتے ہیں۔ کبھی انسان اپنے آپ کو وقت کے تھیمزوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور کبھی گردشِ ماہ و سال کو اپنے پیچھے لگانے کی سعیِ بیم شروع کر دیتا ہے۔ کامل و صوفیاء کرام اور مشائخِ عظام کا اندازِ زندگی ہی یہ ہوتا ہے کہ دو ایک روش پر چلتی ہوئی انسانیت کو ایسی کیف آگئیں منزلِ حیات سے روشناس کراتے ہیں کہ پھر ہمہ اپنی تمام توانائیاں معرفتِ حق کے لئے وقف کر دیتا ہے اور اس کارِ گاہِ حیات میں بڑے عجیب اور خوبصورت رنگ بھرتا ہے۔ اپنی شخصیت کے ایسے تاناک پناو سامنے لاتا ہے کہ اسکی دھنک میں گم ہونے کو جی کرتا ہے۔ الحمد للہ اس دن کے بعد تاحال میرے اندر کے انسان کی کیفیت کچھ اسی طرح ہی کی ہے۔ اس اندازِ حیات کو کہیں میرا کمال نہ سمجھ لیا جائے بلکہ ان ہستیوں کی نظرِ عنایت کا صدقہ ہے جن کے دامن کو تمام کر چل رہا ہوں۔

میں نے تصوف کے ابتدائی آٹھ سالوں میں جس طرح زندگی کا بھرپور لطف اٹھایا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اپنی آدھی صدی پر محیط حیات کا صرف یہی زمانہ عروج ہے تو شاید بے جا نہ ہو گا۔ اسکی وجوہات دو جہتی ہیں۔ اس دور کی زندگی کا ایک سر اس ہستی کے ہاتھ میں تھا جو امام الاولیاء امت محمدیہ اور حامل مقامِ عبدیت کہلانے کا انفرادی استحقاق رکھتا ہے اور دوسرا سر اب تک اس ہستی کے ہاتھ میں ہے اور انشاء اللہ سدا رہے گا جو امام صدیقین کا مبارک تاج سر پر سجائے ہوئے پوری شان اور آن بان سے ہم میں موجود ہے۔

میں اپنے اس مرثی و مزکی کے ساتھ رفاقتوں میں گزرے ماہ و سال کا کہاں تک ذکر کروں اور آخر کیوں کروں۔ بھلا یہ داستانیں کوئی الفاظ کے سپرد کرنے کے لئے جنم لیتی ہیں۔ پھر اس بات کی کیا تصدیق یا تفسی و تسلی ہے کہ آپ جس کے آگے حوروں سے نازک، مرغزاروں کی مہک میں گندھے ہوئے آغاروں کی کھنک سے

سے قلوب کو مسخر نہیں کرتیں؟

ایک بات اور عرض کئے دوں کہ سلوک و معرفت کی پرہیزگاری کے بانیوں میں جس کا چٹا قیادت و سیادت کے لئے من جانب اللہ ہو جائے۔ وہ اپنے شیخ کی توجہ کا مرکز و محور بننا شروع ہو جاتا ہے میرا شروع دن ہی سے یہ غیر جانبدارانہ اور نحوس نظریہ رہا ہے کہ اگر سلسلہ عالیہ کے جم غفیر میں سے اس وقت حضرت بنی مدظلہ کو او جمل کر دیا جاتا تو بڑے حضرت جی کے پاس باقی صرف مسکینوں کا تھمتا ناما لے کرتے ہوئے درویشوں کی بھید اور حضرت جی کے اعتصاب مبارک پر مسائل کا جواب لادنے والی جسموں میں ڈھکی چھپی چند سادہ روحوں کے علاوہ شاید کچھ کم ہی دیکھنے کو ملتا اس لئے کہ جب کوئی جوہری اپنے کسی نایاب ہیرے کو تراش کے لئے مخصوص کرتا ہے تو پرکھ رکھنے والی ہر نگاہ لاشعوری طور پر جھرمٹ کے شے میں سے صرف اسی ہیرے پر جا پڑتی ہے جو وہی طور پر کسی عظیم مقصد کے لئے چمکایا جا رہا ہوتا ہے۔

بس اللہ تعالیٰ میرے شیخ کو نظر بد و حاسد سے چائے۔ عمر نوح عطا فرمائے اور ان کا متبرک سایہ تادیر ہم جیسے کمزور و نحیف و نزاع صوفیوں پر قائم و دائم رکھے۔۔۔۔۔ ثناء آمین۔

صوفیاء 'محققین' علماء ربانین اور قرآن کریم کے مفسرین سے ایک بات اکثر سننے یا پڑھنے کو ملتی ہے کہ بعض اوقات من جانب اللہ ایک ایسا علم باجتماع نبوی علی صاحبہا کسی امتی کو ودیعت کیا جاتا ہے جس کا مافذ اسباب ظاہرہ نہیں ہوتے یہ استحقاق خالصتاً انبیاء کرام علیہم السلام کا رہا ہے کہ وہ عظیم ہستیاں کسی انسان کے آگے حصول علم کی خاطر زانوئے تلمذ دراز نہیں فرماتے ان کے قلوب مطہرہ پر علوم کے حار بے مثال منزل من اللہ ہوتے ہیں۔ وہ القائی 'الہامی' یا وحی ربانی کے ذریعے عطا کئے

جاتے ہیں۔ اس کو قرآن کی زبان میں علم لدنی کہا گیا ہے۔

نبی رحمت ﷺ کے معجزات مطہرہ کی طوائف فرست میں ایک معجزہ اہمیت بڑا عجیب اور محیر العقول ہے کہ آپؐ نے ظاہر انکس سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر بعثت مطہرہ سے لے کر ابد الابد تک کے علوم انسانی کا ماخذ آپؐ کا قلب المطہر یا زبان حق ترجمان ہے اور رہے گی۔ بلکہ جب جبرئیل امین پہلی دفعہ فارحائیں قرآن مقدس کے نزول کی اہمہ اکاثرہ بارگاہ رسالت پناہی میں منانے حاضر ہوئے اور عرض کی "اقرء (پڑھیے) تو آپؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ مگر تاریخ انسانی گواہ ہے کہ علوم ادیان وابدان آپؐ نے لائے ان کی بازگشت آپؐ کی بعثت مطہرہ سے قبل تھی ہے اور نہ اس کی نظیر آج تک کوئی پیش کر سکا ہے اور نہ ہی آئندہ ایسا ممکن ہو سکے گا۔ آپ ﷺ کے اس اعجاز مبین کو قرآن اہمیت کے لقب سے سرفراز فرماتا ہے۔

اسی اعجاز مصطفوی کا کوئی کرشمہ یا شمعہ امتی جو باتباع نبویؐ عطا ہوتا ہے تو یہ اہمیت کی ہی خوشہ چینی کہلاتا ہے۔

میرے عظیم و عجیب شیخ کسی معروف مدرسے یا خانقاہ سے مروجہ دینی علوم میں فارغ التحصیل نہیں ہیں مگر جب بڑے بڑے علماء کو ہم آپؐ کی تفسیر قرآن "اسرار التنزیل" (۱۰ جلدوں پر مشتمل) دکھاتے ہیں تو ورق گردانی کے بعد پہلا سوال جو سننے کو ملتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ آپؐ کے شیخ کون سی درسگاہ سے فارغ ہیں؟ انہوں نے دورہ حدیث کہاں سے پڑھا ہے؟ اور رموز قرآن کے لئے کتنے سفر کئے ہیں۔ تو میں بے دھڑک کہہ دیا کرتا ہوں کہ میرے اس متبرک شیخ کو علوم اور رموز قرآن سے مزین جتنے پر مشقت اور جانفشنا مجاہدات کرنے ضروری تھے۔ وہ ان کے شیخ معظمؒ نے ان کی جگہ پہلے کر چھوڑے تھے اس لئے انہیں اسکی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ صوفیاء کا ملین کے بعض مرید ایسے ہوتے ہیں جو مرید کم اور مراد زیادہ ہوتے

ہیں میرے موجودہ شیخ اپنے شیخ کے مرید نہیں بلکہ مراد ہیں اس لئے بڑے حضرت جی مسلسل پون صدی مجاہدات خود ادا فرماتے رہے اور ثمرات موجودہ حضرت جی مدظلہ کو عطا فرماتے رہے۔ یہ بھی تو صوفیاء میں امیت کی ہی ایک دلیل بادل ہے۔ جو تاریخ تصوف میں صدیوں کے بعد کبھی کبھی کوئی کسی کے لئے کیا کرتا ہے۔

میرے شیخ مقدس کی حیات مبارکہ کا ایک منفرد پہلو ایسا ہے جو صوفیاء کبار کے پر نور جہر مٹ میں انہیں ممتاز کرتا ہے اس کا پر تو ڈھونڈنے میں آپ کو قرون اولیٰ سے بھی آگے صحابہ کرام کی حیات مطہرہ میں جھانکنا پڑے گا۔

عمومی طور پر صوفیاء فیوض و انوارات کے بحر تلام خیز میں غلٹاں و پچاں تصرف یا خوارق سے عبارت زندگی گزارتے رہتے ہیں اپنے متعلقین و متوسلین کو زمانہ کی بے راہ روی سے چلانے کے لئے الگ تھلگ اور گمنام زندگیوں پر مبنی طرز حیات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر الحمد للہ ہمارے شیخ مکرم یا ان کے شیخ معظم و محترم عین سنت مطہرہ کے مطابق ہمیشہ بھر پور اور ہر شعبہ حیات میں قوت کار سے معمور زندگی گزارنے کی نہ صرف تلقین فرماتے رہے ہیں بلکہ ہر قدم پر ایک قابل تقلید نمونہ بھی بن کر دکھاتے رہے ہیں۔

حضرت جی مدظلہ نہ صرف ایک کامل صوفی ہیں بلکہ بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والے شاعر غزل و نعت و حمد و نظم ہیں۔

حساس اور باریک بین نگاہوں کے حامل سیاح جن کے سفر نامے منفرد اور دلپذیر انداز تحریر کے حامل ہیں۔ آپ منجھے ہوئے شکاری جو خنجر اب کی برف پوش چوٹیوں پر بسنے والے چیتوں سے لے کر پستول کی مدد سے اڑتے ہوئے کوئے پر اپنے نشانے کی دھاک اٹھانا جانتے ہیں۔ ایک تجربہ کار کاشتکار اور کونکے کی صنعت کے بہترین کامن ہونے کے علاوہ ملکی سطح پر مستحقین کے لئے معروف رفاہی ادارہ

”الفلاح“ کی سرپرستی فرما رہے ہیں

مقتدرہ نظام تعلیم کو چار اداروں کی وساطت سے نہایت خوبصورت اقدار کے تحت رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ سود کی لعنت سے مبرا ایک بہترین مالیاتی ادارہ پرائیویٹ سطح پر چلا رہے ہیں جس کا سالانہ منافع نہ صرف تسلی بخش ہے بلکہ سودی اداروں کے مقابل مضبوط معیار کا حامل ہے۔

آپ نے حال ہی میں ایک ایسی بین الاقوامی تحریک کا بیڑہ اٹھایا ہے جس کے تصور سے ہی آج کل کے علماء کرام خائف ہیں۔ وہ صرف درس و تدریس و وعظ و نصیحت اور تبلیغ و تعلم کو اسلام سمجھ کر مسجدوں، محرابوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی فسیلوں کے اندر مقید ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کی دہلیز کے باہر قومی سطح پر جو طاغوتی کھیل جاری ہے اس طرف توجہ دینے کو وہ اسلام کا شعبہ ہی نہیں سمجھتے جب کہ یہ مسئلہ آج پوری قوم، عالم اسلام بلکہ انسانیت کے لئے اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ تنظیم

الافخوان آپ ہی کے جذبہ نفاذ اسلام کا عملی ثبوت ہے جس دلیری اور بے باکی سے آپ نے نفاذ اسلام کے مطالبے کو قومی سطح پر اجاگر کیا ہے۔ اس سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں کسی عالم دین نے اس طرح مضبوط موقف اختیار نہیں کیا۔ بلکہ مروجہ انتہائی سیاست کی دلدل میں غرق ہوتے رہے ہیں اور اب بھی نہایت سادگی سے وہی روش اپنائے ہوئے ہیں۔ ایک ایسے سراپ کے پیچھے بھاگ رہے ہیں جس تک رسائی قومی تاریخ کے پچھلے 50 سالوں میں ممکن ہو سکی ہے اور نہ ہی آئندہ اس کا کوئی امکان ہے بلکہ اندیشہ زیان ہے۔

نفاذ اسلام بذریعہ انقلاب کے تصور سے ہی ہمارے علماء کی اکثریت لرزہ بردار اندام ہے۔ یہود و نصاریٰ کا یہودہ اور غلیظ پروپیگنڈہ جو جیاد پرستی، مذہبی دہشت گردی یا ردِ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے نام پر مسلسل کیا جا رہا ہے اس سے بالواسطہ یا بلا

واسطہ مرعوب نظر آتے ہیں۔ اندر خانے نفاذ اسلام کو ناممکن اور سعی لاحاصل سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس تناظر میں امیر تنظیم الاخوان تنہا طاغوتی یا غار کے سامنے سینہ پر ہیں۔ قوم کو نفاذ اسلام کا مژدہ مسلسل سنار ہے ہیں، حکمت وضع فرما رہے ہیں، قومی سیاست میں اپنا مقام بنا رہے ہیں، اسلامی قوتوں کو یکجا کر رہے ہیں اور اسلام کے مقدس دپاکیزہ نظام کے لئے راستہ ہموار فرما رہے ہیں۔

کیا مستقبل کا کوئی مورخ میرے شیخ مکرم کی ان شبانہ روز مساعی جمیلہ کو تاریخ اسلام کے ایک خوبصورت اور سنہری باب کے طور پر نہیں لکھے گا؟ یقیناً ایسا ہو گا بلکہ اس سے بھی آگے جب حقیقتاً انشاء اللہ اس خطہ زمین پر غزوہ ہند کا غلغلہ بلند ہو گا، امر نبوت کا پھر یہ الہائے گا، یہ مجاہد اسلام برسر اقتدار آئے گا تو انشاء اللہ تاریخ اسلام کا درخشندہ و تاملدہ باب معرض وجود میں آئے گا اور یہ سب کچھ خدام تنظیم الاخوان کر گزریں گے۔

مر نبوت علم بنا کر دنیا پر لرائیں گے  
دیکھنا یہ سیما تم اک دن آخر ہم کر جائیں گے

مجھ پر علماء ظاہرین کے ایک مضبوط طبقے (بلکہ کبھی کبھار خود اپنے احباب) کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں اپنے شیوخ مکر میان کو کوئی مافوق قسم کی مخلوق سمجھتا ہوں۔ زمین پر موجود کسی مدے کو ان کے مقابل خاطر میں نہیں لاتا۔ ان کے نام نامی کے آتے ہی بے مقصد جذباتیت اور بلند فشار خون کا شکار ہو جاتا ہوں یا پھر مشائخ کبار کے بارے کوئی ایسی بات جو میرے مزاج کو اس نہ آئے وہ سنتے ہی فوراً حزن تختہ پر اتر آتا ہوں۔ وغیرہ۔۔۔۔۔ وغیرہ۔

مجھے اس کے جواب میں اپنے قاری کو صرف یہی باور کرانا ہے کہ یہ الزامات نہیں بلکہ ہر سالک یا حصول فیض کے صحیح طالب کے مزاج کا جزو لاینفک اور خصائص

مہر کہ میں سے ہوتا چاہئیں تب ہی وہ اپنے شیخ سے کما حقہ فیض یاب ہو سکے گا۔ ورنہ  
فہم و خرد اور مزاجی اعتدال پسندیوں کی پرہیزگار محول بھلیوں میں ہمیشہ غلطیاں و پیچاں  
نامک ٹوئیاں مارتا پھرے گا۔ زندگی کی ناؤ ڈوبنے لگے گی اور وہ عشق حق کے مے خانے  
سے تشنہ لب واپس دھکیل دیا جائے گا۔

ورنہ میں تو ہر جگہ بر ملا کہتا ہوں کہ میرا شیخ بس ایک بندہ حق ہی تو ہے۔



## مرامیر کارواں

نسیم ملک

ذکر کرتے چند ہی روز گزرے تھے کہ تیز آنکھوں اور نوکیلی داڑھی والے ہمارے ذکر انچارج نے مجھے کہا ”میں تمہیں دو نصیحتیں کرتا ہوں“ انہیں پہلے باندھ لو اور سلسلہ عالیہ میں رہنے کے لئے ان پر ہمیشہ عمل کرنا۔“ ”ارشاد“ میں نے عرض کیا۔ ”پہلی بات یہ کہ استاد المکرم دامت برکاتہ کا ہمیشہ ادب کرنا۔ دوسری بات ہمارے سلسلہ کے اکابرین میں سے ایک ملک اکرم صاحب ہیں ان کے زیادہ قریب نہیں لگتا وہ بہت سخت بزرگ ہیں۔“ ”تعمیل ارشاد ہوگی جناب“ میں مرعوب سا ہو گیا۔ اور دونوں باتیں بڑے خلوص سے پہلے باندھ لیں۔ افسوس کہ پہلی نصیحت پر عمل نہ کر سکا۔ اگر رب کریم وہ وقت دوبارہ بھی واپس لے آئیں تو بھی میں اس ہستی عظیم کا کماحقہ ادب نہیں کر سکتا۔ جو عظیم انسان میرے جیسے شخص کی تربیت کر کے اسے دربار نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ السلام تک پہنچا دے۔ میں اس کے ادب کا حق کیسے ادا کر سکتا ہوں اس کے احسان کا بدلہ کیوں کر چکا سکتا ہوں، میں اس کے لئے صرف



دعا کر سکتا ہوں کہ رب کریم اسے میری طرف سے وہ جزا عطا فرمائے کہ جس کا وہ مستحق ہے۔

پر زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ دوسری نصیحت پر عمل میں بھی کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جناب ملک صاحب سے ملاقات 1975 کے منارہ کے اجتماع میں ہوئی۔ ان سے ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔ وہ اجتماع کے انتظامی امور میں مصروف رہتے اپنے ٹرک پر احباب کے لئے پانی اور گھر میں جلانے کے لئے لکڑیاں ڈھوتے ذکر پر آتے تو ہم دور سے دیکھ لیتے ویسے بھی ہماری پہلی ملاقات کوئی خاص قابل ذکر نہیں۔ نہ انہوں نے زیادہ لفٹ دی اور نہ ہی میں نے مارے نصیحت قریب ہونے کی کوشش کی۔ مگر جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو خود سے کہا کہ یہ بزرگ سخت ہوں یا نہ ہوں لیکن انتہائی وجہ ضرور ہیں۔ مگر یہ سخت نہ ہونے والی خوش فہمی بھی جلد ہی رفع ہو گئی۔ انہی دنوں منارہ سکول میں ایک سادھو نما شخص آگیا۔ وہ کسی اور پیر سے بیعت تھا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر اس نے اپنے پیر صاحب کی بزرگی کے قصبے سنا شروع کر دیئے کہ کس طرح وہ پورے سال میں صرف ایک بادام کھاتے ہیں۔ ہم خاموشی اور اشماک سے سنا کئے۔ اتنے میں جناب ملک صاحب تشریف لے آئے۔ انہوں نے اسے باہر بلایا اور کچھ دریافت کیا۔ معلوم نہیں کہ اس نے کیا جواب دیا کہ ملک صاحب نے ایک پچاسی نمبر کا زپاٹا اسے رسید کر دیا۔ دوسرا نوے نمبر کا۔ پھر اسے گرا لیا اور تین لاکھیں جزدیں۔ جب اس نے اٹھنے کا تکلف کئی بغیر ہی دوڑ جانے کی کوشش کی تو moreover کے طور پر ایک عدد لات اور رسید کر دی۔ میں اس حادثے کا قریبی اور یحییٰ شاہ تھا۔ ”ہمارا وہ ذکر ماسٹر ٹھیک ہی تو کہتا تھا“ میں نے خود سے کہا۔ بہر حال اس پورے اجتماع میں خود کو جناب ملک صاحب سے چا چا کر دور رکھنے کی کوشش میں خاصا کامیاب رہا۔

ان دنوں پنڈی رہتا تھا۔ ایک شام اطلاع ملی کہ صوبہ سرحد سے واپسی پر خانہ  
عبدالرزاق صاحب میرے غریب خانہ پر رات کا قیام فرمائیں گے۔ جب وہ تشریف  
لائے تو دیکھا ان کے ہمراہ ملک صاحب بھی ہیں۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اندوہ سے  
ناکافی تھا۔ میں قدرے پریشان ہوا۔ جناب ملک صاحب نے فرمایا "یار میں تو صوفے  
پر سوؤں گا" اور جواب کا انتظار کئے بغیر صوفے پر دراز ہو گئے۔ پاؤں صوفے سے  
فٹ باہر نکلے ہوئے۔ کروٹ نہ بدلی اور نہ ہی بدل سکتے تھے۔ صبح اسی طرح خوش و  
خرم۔ اتنا پیار کیا کہ میں حیران ہو گیا اور رخصت ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد جناب  
ملک صاحب نے اپنی مریدیز کار ایک خط کے ہمراہ مجھے بھیج دی کہ اسے چھ دو۔ میں  
نے بہت کوشش کی نہ سکی۔ جناب ملک صاحب کا خط موصول ہوا کہ مجھے رقم کی اشد  
ضرورت ہے کارپینے کی مزید کوشش کرو۔ میں پہلے ہی اپنی کوشش سے نااں بیٹھا تھا  
شاید چوں کے پرچے دیکھ رہا تھا اسی سرخ پفل سے فوراً جواب تھپیٹ دیا کہ جناب  
آپ کی اس کار نے مجھے بہت پریشان کیا ہے 'یہ بجے والی نہیں۔ اگلے ہی روز ملک  
صاحب کا خط ملا۔ "کار کی بات چھوڑو۔ مجھے تمہاری پریشانی نے پریشان کر دیا ہے۔  
تحریر کی سرخ روشنائی نے مزید فکر مند کر دیا ہے۔ کار کو بھول جاؤ، ڈرائیور بھیج دوں گا  
لے جائے گا۔ اپنی خیریت سے مطلع کرو" اس خط سے پہلی مرتبہ جتا ملک صاحب  
کے متعلق میرے خیالات میں ایک غیر محسوس Dentist پڑ گیا۔

اگلے اجتماع میں پھر اکٹھے تھے۔ اس مرتبہ جناب ملک صاحب نے ایک عجیب  
تماشا دکھایا۔ ایک شام ایک شخصے کی بوتل میں سانپ مد کر کے لے آئے۔ پتلا  
زہر یا سانپ 'تند خوانا کہ بوتل کو ڈسنے کی کوشش کرتا تھا۔ کہنے لگے۔ "میں نے  
کنویں میں ڈول ڈالا تو باہر آگیا۔" میں نے بوتل سامنے رکھ دی اور کہا کہ بوتل یا  
موت؟ یہ بوتل میں گھس گیا "ہم سب کافی محفوظ ہوئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ

یہ اصل کا منہ کھول کر اسے باہر نکال دیں اسے مار دیتے ہیں۔ جناب ملک صاحب نے کہا نہیں بھائی میرا اس وعدہ ہے۔ اس نے موت کے جائے لا تل چن لی تھی۔ اب میں اسے کسی دیرانے میں جا کر آزاد کر دوں گا۔“ وعدے کی اس طرح کی پابندی کم از کم مجھے بڑی اچھی لگی۔

ان دنوں استاد المکرم کی آبائی زمین کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ مزارع خالی نہیں کرتے تھے۔ میں ایک دن اسی سلسلے میں میانوالی گیا۔ چکڑالہ سے ہوتے ہوئے بہت دیر بعد منارہ پہنچا۔ صبح فیصلہ ہوا کہ ان مزارعین سے دوبدو بات کی جائے۔ جناب ملک صاحب کے ٹرک پر کافی سارے ساتھی عازم چکڑالہ ہوئے۔ جناب ملک صاحب ڈرائیو کر رہے تھے۔ میں ساتھ بیٹھا تھا اور میرے ساتھ جناب ہاشم بلوچ صاحب۔ چکڑالہ پہنچ کر زمین پر آئے (یہ وہی زمین ہے جہاں آج کل مرشد آباد ہے اور استاد المکرم محو استراحت ہیں) مزارعین سے بات کی اور واپس روانہ ہوئے۔ واپسی پر بھی میں جناب ملک صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ساری رات کا ”جگ راتا“ اور تھکان، تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے اپنا سر جناب ملک صاحب کے کندھے پر رکھا اور سو گیا۔ جناب ملک صاحب نے اپنا بازو اوپر کیا اور میرے سر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ تین گھنٹے وہ ٹرک چلاتے رہے اور میں آرام سے سوتا رہا۔ منارہ سے نیچے والے موڑ پر میری آنکھ کھلی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے ”یہ دیکھو میں یہ والا موڑ کیسے کاٹتا ہوں۔ رفتار بھی کم نہیں ہوگی اور چاروں ٹائر بھی سڑک پر رہیں گے“ میں نے خود سے کہا ”ہمارا وہ ذکر والا مشرب بالکل غلط کہتا تھا۔“

اور پھر جناب ملک صاحب سے میری شناسائی ہو گئی۔ البتہ میں نے یہ احتیاط ضرور کی کہ ان کے متعلق اپنی رائے کو احباب کی آراء سے متاثر نہ ہونے دیا اور حتی الامکان اپنی آزادانہ رائے قائم کی۔ میں اس معاملے میں کافی خود غرض واقع ہوا

ہوں۔ جب احباب نے پہلی بار مجھے سلسلہ عالیہ کی طرف دعوت دی تو انہوں نے یہ بھی Highlight کیا کہ ہمارا شیخ سب سے بڑا ولی اللہ ہے۔ اس پر میرا رد عمل یہ تھا کہ میں اس دعوے کو چیلنج تو نہیں کرتا لیکن مجھے جس بات سے غرض ہے وہ یہ کہ وہ میرے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ مجھے کتنا اچھا اور نیک بنا سکتے ہیں۔ یہی سلوک میں نے جناب ملک صاحب کے متعلق اپنی رائے سے کیا۔

ایک بات ضرور تھی کہ جناب ملک صاحب 'سلسلہ میں تمام احباب سے ممتاز و منفرد تھے۔ استاد الکترم کے ہاں انتہائی سنجیدہ محفل لگی ہوتی، جناب ملک صاحب تشریف لاتے تو استاد خوش ہو جاتے اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ ایک مرتبہ جناب ملک صاحب "سیف مرتضویہ" ہمراہ لائے اور پڑھ کر استادوں کو سناٹا شروع کر دی۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ استادوں کو معصوم بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے دیکھا۔

اسی اجتماع کے دوران میرا جناب ملک صاحب سے مریدین کا کار کا سودا ہو گیا۔ انہوں نے Try دی قیمت طے کی اور چالی میرے حوالے کر دی۔ مجھے بڑی خوش گوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے تمام شرائط میری مانیں۔ چالی لے کر خوش خوش منارہ سکول آیا تو جناب حافظ صاحب اور ملک خدا بخش صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اپنے کارنامے کا تذکرہ کیا تو بزرگ ایک دم باجماعت خفا ہو گئے۔ تم یہ گاڑی چلاؤ گے؟۔ انہوں نے ایک زبان استفسار کیا۔ "بالکل چلاؤں گا۔ مجھے کیا ہے۔" "تم یہ گاڑی ہرگز نہیں لو گے" بزرگ بالکل ہی خفا ہو گئے۔ "واپس کر دیہ چالی۔ ملک خدا بخش کو دے دو۔ یہ انہیں دے دیں گے۔" "لیکن یہ بڑی معیوب بات ہے۔ میں سودے سے کیسے پھر سکتا ہوں؟"۔ میں نے احتجاج کیا۔ "کوئی معیوب دیوبند بات نہیں ہے۔ لونی ملک صاحب چالی اور آگے دے دینا۔" میں نے پوچھا

دل کے ساتھ چائی حوالے کر دی۔ اگلے ہی روز جناب ملک صاحب سے ٹاکرا ہو گیا۔ میں انتہائی ندامت کے احساس کے ساتھ ملا۔ وہ انتہائی پیار سے ملے۔ تذکرہ تک نہیں کیا۔ کبھی نہیں کیا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ استاد المکرم کو یہ کہتے سنا کہ ”تم سارے میرے مرید ہو صرف اکرم میری مراد ہے۔“ تو بڑا حیران ہوا۔ میں خود تو نیا ساتھی تھا مگر ہمارے اکابرین میں تو بڑی بزرگ باکمال ہستیاں موجود تھیں۔ اسی شام بعض احباب رات دیر سے پہنچے۔ دور سے آئے تھے اور کھانا بھی نہیں کھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اندھیرے میں سے جناب ملک صاحب نمودار ہوئے۔ سر پر چپاتیوں کی پنڈ اور اس پر دال کا دیگچہ۔ ”یار دیر تو نہیں ہو گئی؟“ اصل میں آج روٹی نہیں چنی تھی۔ جب تک گھروالوں نے آنا گوندھا میں نے تندور جلا دیا اور روٹی جلدی پک گئی۔“

تب علم ہوا کہ جب سے سلسلہ عالیہ قائم ہوا اس کے اجتماع کے تمام اخراجات جناب ملک صاحب برداشت کرتے تھے۔ ان کی زمین کی ساری گندم اجتماع کے لئے استعمال ہوتی، اگر کچھ بچ جاتی تو وہ خود استعمال کرتے۔ یہ گندم وہ خود دیتے کھاتے اور صاف کراتے۔ ان کے گھر والے احباب کے لئے خود کھانا تیار کرتے اور اس سارے کام میں تمام خاندان خوشی اور فخر محسوس کرتا۔ احباب کی خدمت کا محور یہ ایک خاندان تھا۔ ایک مرتبہ بات ہوئی تو ہنس دیے۔ ”نسیم تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ تمہارے پاس جو چھتا ہے وہ اس راہ میں دیتے ہو۔ میرا سب کچھ اسی راہ میں ہے۔ جو بچ جاتا ہے وہ خود استعمال کرتا ہوں۔“ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب احباب کا لنگر دار العرفان منتقل ہوا تو جناب ملک صاحب کی والدہ محترمہ اور اہلیہ محترمہ دنوں روتی رہیں کہ آپ لوگوں نے ہمیں اس عظیم سعادت سے محروم کر دیا۔ میرے ایک ماموں دیوبند فاضل، مستند عالم دین تھے۔ مضبوط بلکہ ذرا سخت

طبیعت کے مالک 'حضرت مدنی کے براہ راست شاگرد تھے۔ ایک دن ان سے کہہ دینا کہ میں لطائف کرتا ہوں۔ انہوں نے کوئی لفٹ نہیں دی۔ میں نے آگے کہہ دیا کہ مراقبات بھی کرتا ہوں۔ انہوں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بولے "وہ لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے جو یہ کام کرتے تھے"۔ میں نے کہا "میرے شیخ روحانی بیعت بھی کراتے ہیں" ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "مجھے ابھی ساتھ لے چلو۔" ہم منارہ سکول آگئے۔ ماموں جان سارا دن بیٹھے آہستہ آہستہ روتے رہتے۔ دو تین دن تو میں خاموش تماشاائی بنا رہا۔ آخر تنگ آکر پوچھ لیا۔ جواب میرے لئے کوئی خاص حوصلہ افزا نہیں تھا۔ کہنے لگے "تمہیں یہ سب انعامات مفت مل گئے ہیں جس طرح گلی میں چوں کو بیٹے ہیں۔ تمہیں ان کی عظمت کا احساس ہے اور نہ ہی قدر۔ ہم سے پوچھو ہماری ساری عمر ان کی آرزو اور جستجو میں صرف ہو گئی۔ اب جب کہ پاؤں قبر میں جا چکے ہیں 'جسم میں جان نہیں' وہ بے نیاز اب اس بحر فیوضات تک لے آیا۔" ان دنوں جناب ملک صاحب روزانہ فجر کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ ماموں جان مجھ سے پوچھنے لگے۔ "یہ جو مولانا اکرم صاحب درس دیتے ہیں۔ یہ کہاں سے فارغ التحصیل ہیں؟"۔ "کیس نے بھی نہیں" میں نے جواب دیا "کیا مطلب؟"۔ "مطلب یہ کہ کسی بھی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔" ماموں جان بالکل ہی ناراض ہو گئے۔ "تم خود احمق ہو یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟۔ جو نکات مولانا بیان کرتے ہیں 'میں نے دیوبند میں بھی نہیں سنے۔ قرآن فنی کے ساتھ معاملہ فنی بھی اعلیٰ درجے کی عطاء ہوئی اور عقل و دانش کے جس Level سے ان کی بات آتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں نہ کیس دیکھا نہ کیس سنا۔ اس وصف نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ بات کرنے اور سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

تین سال کی جان پہچان کے بعد میں نے سوچا کہ جناب ملک صاحب سے محدود

اور محتاط تعلق داری میں کوئی خاص خطرہ نہیں۔

اور پھر میری اہلیہ ہمار ہو گئی۔ اس کی ہماری نے مجھے ہلا دیا۔ استاد المکرمؒ کی خدمت میں عرض کیا تو فکر مند ہوئے۔ فرمایا "انشاء اللہ عارضی تکلیف ہے" جناب ملک صاحب کو غم ہوا تو ہنس دیئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ بظاہر لا تعلق رہنے والی اس ہستی نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ دارالعرفان کے پورے اجتماع کے دوران میری اہلیہ کو اپنے گھر مہمان کے طور پر رکھا اور اسکی احسن طریقے سے دیکھ بھال کی۔ پھر جب میں اپنی اہلیہ کو گھر چھوڑ آیا تو مجھے سمجھایا کہ اسے اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔ واپس لے آؤ اور ساتھ رکھو۔ ہماری اس تکلیف کے دوران جس طرح جناب ملک صاحب نے شفقت فرمائی، ہمارا حوصلہ بڑھایا اور ساتھ دیا۔ اس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کے اس احسان کا بدلہ دینا تو دور کی بات ہے ہم اسکا شکریہ تک ادا نہیں کر سکتے۔

اور پھر سلسلہ عالیہ کی تاریخ کا سانحہ عظیم پیش آیا۔ 1984ء میں استاد المکرمؒ ہمیں اپنے سائے سے محروم کر گئے۔ اس نازک وقت پر جناب ملک صاحب نے جس حوصلے اور بلند ہمتی سے احباب کو سنبھالا اور حوصلہ دیا وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ سلسلہ عالیہ کے احباب نے متفقہ طور پر جناب ملک صاحب کو اپنا شیخ تسلیم کیا اور ان کے دست اقدس پر بیعت کی۔ حضرت شیخ المکرم مدظلہ العالی نے سلسلہ عالیہ کی باگ ڈور اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر احباب کی تربیت انتہائی دلکش اور دلنشین انداز میں شروع فرمائی۔ استاد المکرمؒ نے جس عمارت کی مضبوط بنیادیں استوار فرمائی تھیں۔ حضرت مدظلہ العالی نے اس کا باقی حصہ اسی طرح مضبوط اور خوبصورت طریقے سے تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ تربیت کا انداز انتہائی حسین اور چھوٹی چھوٹی باتیں جو انسان کی زندگی کا رخ بدلنے کو کافی ہو جائیں۔ "سب سے بہترین

انسان ایک مسلمان ہوتا ہے اور سب سے بہترین مسلمان ایک صوفی۔“ دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ ہرگز نہیں بنانا چاہیے اور نہ ہی دین پر عمل کو دنیاوی مسائل کا علاج سمجھنا چاہیے یہ مذاہب باطلہ کا خاصہ ہے۔“

آخر کار مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا جو تقریباً گیارہ سال میرے ذہن سے چپکار ہا کہ حضرت مدظلہ العالی کو احباب اتنا سخت کیوں سمجھتے ہیں؟ اصل میں ہم سب نے الا ماشاء اللہ اپنے اوپر دو خول ضرور چڑھا رکھے ہوتے ہیں۔ اندر انانیت کا اور اوپر مفادات کا۔ ہما وقت یہ خول اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ ہماری اصلی شخصیت ہماری نگاہوں سے بھی او جھل ہو جاتی ہے۔ ہم جس شخص سے ملتے ہیں اسے مفادات کے ترازو میں تولتے ہیں کہ یہ شخص ہمارے لئے کتنا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی تجارتی برتاؤ ہم شیخ کے ساتھ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ مجھے ممتاز مفتی مرحوم نے بتایا کہ میں ایک پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سواریہ نیاز پیش کی۔ انہوں نے مجھے چند وظائف بتائے کہ پڑھا کر۔ میں نے عرض کی کہ حضرت اگر وظائف میں نے ہی پڑھنے تھے تو سواریہ آپ کو کیوں دیتا۔ یہ سواریہ تو دیا ہی اس لئے ہے کہ میری طرف سے یہ وظائف آپ پڑھا کریں۔

ہم بھی غیر شعوری طور پر اپنے شیخ کو اسی ترازو میں تولتے ہیں۔ دوسرا خول اس سے بھی مضبوط تر ہے۔ نماں خانہ دل میں بڑائی کا خیال نہ سہی لیکن منفرد شخصیت Self-Recognition کی طلب ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ جب کہ شیخ اپنی توجہ اور شفقت سے ایسے تمام خول اتار کر اندرونی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ دوسری بات کہ حضرت مدظلہ العالی کی اپنی شخصیت پر کوئی خول ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ان کے اندر ہے وہی باہر۔ He is what he is ان کی شخصیت میں صرف کھرا پن ہے۔ پرالم جب شروع ہوتا ہے جب ہم اپنے خول میں مدہرہ کر



ان سے معاملہ کرتے ہیں لیکن اگر ایک مرتبہ یہ بات سمجھ میں آجائے تو مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ان سے تعلق داری بہت آسان ہو جاتی ہے۔ میرے ذاتی خیال میں He is the easiest person to get along with۔ انسان ان کے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے، ان کی شخصیت کی عظمت سے مرعوب لیکن محاس سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ اس قدر سادہ، محبت کرنے والا، دکھ درد میں شریک، تکالیف میں ساتھ دینے والا، Pure اور شیریں انسان جو کسی کو نہیں دھکارتا، کئی کو واپس نہیں کرتا، بلکہ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اسے اپنے چشمہ دل سے محبت کا زمزم پلاتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ میں اس کی انگلی تھام کر اللہ کے قرب و معرفت کے راستے پر قدم قدم چلاتا ہے۔ اپنے وجود کی روشنی اور گرمی سے اس کے وجود میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت اور ادب کے چراغ جلاتا ہے۔ جو سب کو خوشیاں بانٹتا ہے اور سب کے غم میں شریک رہتا ہے۔

خوشیاں بانٹوں جہاں بھر کو میں دکھ جہاں بھر کے دل پہ سستا ہوں

ہم جیسے Multi-Complexes میں مبتلا اشخاص کا ایک ایسی ہستی سے کہ جس میں کوئی Complex نہ ہو، تعلق رکھنا ایک بڑا عجیب دلچسپ تجربہ ہے۔ جن احباب کو ان کے ساتھ قرمت کے لحاظ نصیب ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس دوران زندگی کا مفہوم ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں دو سال کوئٹہ میں رہا اور اس عرصہ میں غریب خانے کو پانچ مرتبہ شرف میزبانی بخشا۔ خدا گواہ ہے کہ جب قیام پذیر ہوتے تو محسوس ہوتا کہ گھر میں جنت اتر آئی ہے۔ نہ وقت کا احساس رہتا، نہ بے پناہ مصروفیت کی فکر، نہ مہمانان گرامی کی تشریف آوری سے مسئلہ۔ ایک عجیب سی خوشی، اطمینان، سکون اور محبت کا احساس پورے وجود کو شاد و آباد رکھتا۔ ایک ایسا احساس جو اپنے وجود سے بے نیاز کر دے زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ اگر روح مطمئن اور

خوش ہو تو بدن کی تکلیف محسوس تک نہیں ہونے دیتی۔

زندگی تو اسی کو کہتے ہیں

جو ہر تیرے ساتھ ہوتی ہے

چلے جاتے تو گھر کے ساتھ ساتھ دل کو بھی ویران کر جاتے۔ حالانکہ مسلسل رابطہ رہتا لیکن وصل اور فراق کے معنی اپنی شدت کے ساتھ دل پر واضح ہو جاتے رہے۔ تب محسوس ہوتا کہ اس ہستی کا ہمارے ساتھ کس قدر محبت اور اپنائیت کا رشتہ ہے۔ کیونکہ جتنی محبت ہم اپنے شیخ سے کرتے ہیں وہ دراصل اس محبت کا عکس ہوتا ہے جو شیخ ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ محبت کے چشے بھی فراز سے نشیب کو پہنچتے ہیں۔

ایک مرتبہ شیخ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ”ہم اگر کچھ دن حضرت کی خدمت میں رہتے تو لطائف اس طرح درد کرنے لگتے گویا سینے میں میخیں ٹھک گئی ہوں۔ جھک کر کوئی چیز اٹھاتے تو درد محسوس ہوتا“ میں نے جب یہ بات سنی تو بڑی عجیب لگی۔ سوچا حضرت مدظلہ العالی فرماتے تو صحیح ہوں گے لیکن ایک روحانی احساس کا جسمانی احساس میں تبدیل ہو جانا ہے بڑی عجیب بات۔ کچھ ہی روز بعد حضرت مدظلہ العالی کے ساتھ ہر دن ملک جانے کا شرف نصیب ہوا۔ حضرت کی سیٹ آگے Leg Space والی تھی، میری پیچھے تھی۔ ٹیک آف کے کچھ دیر بعد میں حضرت کے سامنے رکھے ہوئے ہیک پر جا کر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے کی محفل کے بعد

حضرت نے آرام کا عندیہ دیا تو میں پیچھے آگیا۔ مڈلش ایر کی فلائٹ تھی۔ انہوں نے کھانا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی سکرین پر ایک فلم لگادی جس میں ایک خاتون کا رقص اور گانا تھا۔ اول تو کھانے میں حرام کا واضح اور غالب عنصر، پھر شراب اور اس پر مستزادہ رقص اور گانا۔ ایسے ماحول کی نحوست کی شدت کا صحیح اندازہ صرف

وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس میں گزرے ہوں۔ دفعتاً ایسے لگا کہ میرے سارے لطائف اور پھر پورے وجود کا ایک ایک ذرہ اللہ کے ذکر سے منور ہو گیا ہو۔ وہ ناقابل تردید احساس جو مجھ جیسے شخص کو بھی محسوس کرنے پر مجبور کر دے۔ پھر معاً پورا جہاز روشن ہو گیا۔ اس کی ناقابل برداشت نحوست پر برکات چھا گئیں۔ میں نے حضرت الکزم مدظلہ العالی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا سر سیٹ کی پشت سے لگائے گویا آرام فرما رہے تھے۔ یہ احساس اس قدر شدید ہو گیا کہ جیسے میرا وجود اور جہاز پھٹ جائیں گے۔ تب یہ بات عملاً سمجھ میں آئی کہ عظیم المرتبت اہل اللہ ماحول کو کیسے متاثر اور تبدیل کرتے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً دو ہفتے قیام تھا۔ وہی شب و روز کی مصروفیت بغیر تھکاوٹ۔ چوتھے دن میں کوئی چیز اٹھانے کے لئے جھکا تو سینے میں عجیب سا احساس ہوا۔ لطائف اس طرح درد کرنے لگے گویا سینے کے آر پار میخیں ٹھک گئی ہوں۔ بیٹھا بیٹھا درد جو زیادہ ہوتا گیا۔ جب بھی ٹیس اٹھتی میں مسکرا دیتا کہ یوں سمجھ میں آتی ہیں عجیب باتیں۔

1993ء میں حضرت الکزم نے الاخوان قائم کر دی۔ سارے ساتھیوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ مگر جب حضرت مدظلہ العالی نے بات سمجھائی تو احساس ہوا کہ یہ تو اہم ترین کام تھا جو اب شروع ہو رہا ہے۔

قرآن کریم نے آقائے نامدار ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد دین حق کا تمام مذاہب پر غلبہ ارشاد فرمایا ہے اس کے لئے جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض مقدسہ کے تین پہلو ارشاد ہوئے ہیں۔ اول تلاوت آیات یعنی دعوت و تبلیغ کہ اس پیام حیات آفریں کو چار دانگ عالم تک پہنچایا جائے، دوم تزکیہ، یعنی جو اس دعوت کے سامنے سر جھکا دے اس کے باطن کی صفائی اور پاکیزگی۔ سوم مہتاب و حکمت کی تعلیم۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان تین پہلوؤں میں کم از کم اپنا حصہ ضرور

حاصل کرے اور پھر کسی ایک میں مہارت حاصل کر لے۔ لیکن ہمہ وقت یہ مقصد اسکے پیش نظر رہے کہ اس نے پورے دین پر خود بھی عمل کرنا ہے اور دین مبین کو ایک مکمل ضابطہء حیات کے طور پر پورے عالم میں نافذ کرنے کے لئے جمادِ مسلسل میں مصروف رہنا ہے۔ اور اس ضمن میں ہر اس فرد یا جماعت سے تعاون کرنا ہے کہ جو اسی مقصد کے لئے کوشاں ہو۔ فرمایا یہ لازم نہیں کہ ہر مسلمان 'سلسلہ عالیہ' میں شامل ہو بلکہ جو بھائی باہر رہ کر بھی اس عظیم ترین مقصد میں تعاون کرنا چاہتے ہیں، الاخوان ان کے لئے ایک وسیع البنیاد پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔

اس بطلِ جلیل کی شب و روز کی محنت شاقہ نے چھ سال کے عرصہ قلیل میں الاخوان کو پورے ملک میں مضبوط طریقے سے متعارف کرادیا ہے بلکہ اب تو بین الاقوامی طور پر بھی مثبت اور منفی رد عمل کا اظہار ہونا شروع ہو گیا ہے۔ الاخوان کے بنیادی نعرے :-

|                       |   |                        |
|-----------------------|---|------------------------|
| تیرا ایمان میرا ایمان | - | رب کی دھرتی رب کا نظام |
| الاخوان کا پیغام      | - | پاک وطن میں پاک نظام   |
| جان و مال کی بقاء     | - | نفاذ دین مصطفیٰ ﷺ      |
| تیری بقاء میری بقاء   | - | الجماد الجہاد          |

لاکھوں افراد کی زبان کے گیت اور دل کی دھڑکن بن چکے ہیں۔ عوام میں شعور جس قدر بیدار ہو رہا ہے انہیں اس بات کا یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس وقت سوال ان کی فلاح کا نہیں بلکہ بقاء کا ہے۔ اور ان کی بقاء و فلاح کی ضمانت صرف ایک ہی نظام دے سکتا ہے۔ وہ نظام جو ان کے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اور اس کے نفاذ کی کوشش میں وہی افراد مخلص ہوں گے جنہیں حکومت، دولت اور شہرت کی کوئی طلب نہ ہو بلکہ وہ صرف دین کا نفاذ چاہتے ہوں۔ اس بات



سردار عبدالقیوم کے ہمراہ ملک انشورنس فنڈ کی تقریب میں "حیثیت مہمان خصوصی"



96 میں فیہ الحق قذافی پرویز مشرف کے ساتھ

کو جان کر کئی لاکھ افراد اس میر کارواں کے ہاتھ پر موت کی میعت کر چکے ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ جب سیل رواں پورے معاشرے 'ملک اور انشاء اللہ پوری دنیا کو اپنی پیٹ میں لے لے گا۔

بات بے جا عقیدت و محبت کی ضمیم اور نہ ہی بلا وجہ تعصب و تنقید کی۔ ایسی کسی دوسری جماعت کی نشاندہی فرما دیجئے جو اپنے آقائے نامدار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کا اس قدر خیال رکھتی ہو۔ جس کے افراد شب و روز دین کی اشاعت و ترویج میں مصروف ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کی جبین سجدہ ہائے تہجد کی لذت سے آشنا ہو 'ان میں سے ہر ایک کا سینہ الحمد للہ نکات نبوت ﷺ سے منور ہو۔ دین کی بنیادی تعلیم کا حصول ان کے لئے ضروری ہو اور مقررہ نصاب کی تکمیل ان کی روحانی ترقی کے لئے لازم قرار پائے۔ ایسے روشن جبین اور منور قلوب والے احباب جو بعثت نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلیٰ ترین مقصد یعنی احیاء 'سر بلندی اور نفاذ دین کے لئے ہمہ وقت اپنی پوری قوت اور صلاحیت کے ساتھ مصروف عمل ہوں۔

پچھلے ہی دنوں ایک ساتھی سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ اگر رب کریم مجھے ایک اور مرتبہ زندگی عطا فرمائیں اور ساتھ یہ کہہ دیں کہ اسے تم صرف ایک آدمی کے ساتھ بسر کر سکتے ہو تو مجھے دوسری بار سوچنا نہیں پڑے گا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی دوسرا انسان نہیں دیکھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اتنے کمالات یکجا کر دیئے ہوں۔

اور ان کے علاوہ اسے یہ کمال بھی عطا ہو کہ جس نے کام کی بھی ابتداء کرے 'قلیل مدت میں اس کے انتہائے کمال کو پہنچ جائے۔ ایسا صاحب سلسلہ شیخ کہ جس کی ایک توجہ سے تمام وجود منور ہو کر مراقبات مٹا شیک راستہ مکمل جائے۔ ایسا مفسر

قرآن جو کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ ہو مگر اس کی تفسیر علماء اور عوام کو یکساں متاثر کرے۔ صاحب فہم و فراست جو معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے اور اس کا اعلیٰ ترین حل بتا دے۔ ایک وقت اعلیٰ درجے کا ادیب اور شاعر۔ ماہر شکاری جو نہ قانی چیتے کو دوہو و شکار کر سکے۔ ایسا صاحب خرد جو کمپیوٹر سمیت تمام جدید ایجادات کو یکساں آسانی اور مہارت سے استعمال کر سکے۔ ایسا ماہر تعلیم جو معاشرے کو ایک یکساں 'نیا اور بہترین نظام تعلیم رائج کر کے دکھا دے۔ بلا سود مکاری اور اسلامی تجارت کا ماڈل بنا کر پیش کر دے۔ ایسا سیاح جس نے پوری دنیا دیکھ ڈالی ہو اور اس کے ہر گوشے میں اپنی وجود کی روشنی سے دوسروں کے دلوں کے دیپ جلاتا آیا ہو۔ ایک صاحب درد جس نے انسانیت کی فلاح کے لئے ایک فاؤنڈیشن قائم کر دی ہو۔ پھر ایک ایسا دو جہہ انسان جس کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور دل گرم۔ جب بات کرے تو الفاظ کیفیات کا روپ دھار لیں۔ اور جس کی صحبت میں اللہ اور اس کی رسول ﷺ سے تعلق تازہ اور منبوط ہو جائے۔ اتنے سارے کمالات کسی ایک انسان میں جمع ہو جانا محال ہے۔ یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے کہ وہ اس ہستی کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا مقرب غلام ہو کہ اس کی شخصیت میں اس کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا عکس جھلکنے لگے۔ اور یہ سب کچھ ایسے نہیں ہو جاتا۔ وقت 'صدیوں ان کا منظر رہتا ہے۔ اور ان کے اثرات قرنوں کو محیط ہوتے ہیں۔ یہ انقلاب آفرین لوگ زمانے اور تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ دین کی نشاط ثانیہ اور اسلام کی سر بلندی کے کارواں ہیں یہ۔

## چوہدری ملا سے شیخ المکرم تک کا سفر

عبدالودود شاہ

خواجہ نقشبند خاص خواجہ جب حضرت کا ذکر فرماتے تھے تو یہ شعر ارشاد فرماتے تھے :-

دیوانہ شد کے کہ رخ ما  
کم گرد ہر دیاچو دیوانہ نئی

اس لئے حضرت مدظلہ العالی کا ذکر خیر مجھے بھی دیوانہ مانتا ہے۔ لیکن دل پہ جبر کر کے ارشاد شیخ کے مطابق چند اے سیدھے خیالات اور پریشان انکار سپرد قلم کرتا ہوں ہو سکتا ہے کسی کا بھلا ہو جائے۔

گر کیوں شرح از حال مردان نیست بھر  
ذکر ان بہتر کہ اندر کالے زمر



میت سے پہلے زندگی ایک اونٹ بے مہار کی سی تھی۔ کہ جہاں سے دل کو بھایا وہاں سے کھایا جہاں دل چاہا وہاں چر لیا۔ اور یہی زندگی کا خلاصہ ہے۔ میت سے پہلے کی زندگی کے لمحے لمحے سے اپنے حصے کی لذت لے چکا ہوں۔ ہر واقف اور پسندیدہ ذرے سے اپنے حصے کی رعنائیاں چوس چکا ہوں۔ زندگی کا یہ طویل عرصہ 18 سالوں پر محیط ہے۔ جس میں لذت پسندی و نفس پرستی کو اپنی استعداد و قوت کے مطابق انتہا پر پہنچایا تھا۔

لیکن اس دور کی ایک بات بتاتا چلوں اس طویل عرصہ میں چودھویں چاند ات کو ایک عجیب قسم کی مقرراری طاری ہو کر تھی اس لئے چودھویں چاند رات کو کبھی سویا نہیں ہوں۔ چاند رات کو اس بے نام بے قراری کو دور کرنے کے لئے مناسب اقدامات بھی کرتا تھا۔ زندگی بظاہر خوش و خرم گزاری تھی جس میں ناوٹ ریاکاری اور تصنع کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب کسی کام کو کرنا ہوتا تو کر ہی گزرتا۔ زندگی کا ہر کام پورے اخلاص۔ دیانت داری۔ صداقت اور مکمل مردانگی سے سرانجام دیا۔ دنیا جیسے سیکمائی نہیں۔ ہاں دبانے میں اور دوسروں کو اپنی ذہانت اور چکنی چڑی باتوں سے رام کرنے میں انتہائی ماہر تھا۔ اور شاید ہوں لیکن اس دوران میری ہر قسم اور ہر قوم کے فلسفہ کی کتابوں تک رسائی ہو گئی جس کے مطالعہ سے مزاج کی قدرتی سخت گیری و تغیری و مگریمی بیجانی طبیعت اور دل کی بے قراری کو ظاہری سکون مل گیا۔ مگر اسکا ایک شعوری یا لاشعوری نقصان یہ بھی ہوا کہ مذہب سے دور ہوتا گیا۔ مذہبی عقیدہ اور اعمال کو فرسودہ نظریات خیال کرتا رہا۔ ثواب و عذاب کو ضعیف الاعتقادی سمجھتا رہا۔ ان فلاسفوں کو پڑھنے سے پہلے بڑے کام میں اگر کوئی جھجک محسوس کرتا تھا تو اب دین بحدہ دین دشمن فلسفیوں نے وہ جھجھک ہمیشہ کے لئے دور کر دی۔ اب مذہب کی فلسفیانہ تعلیمات احکامات اور

رسم و رواج اور حدود و قیود کی من پسند فلسفیانہ توجیح کرتا اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان خود ساختہ دلیلوں سے نہ صرف خود بھی متاثر ہوتا اور دوسروں کو بھی متاثر کرتا بلکہ اگر کوئی ناجائز کام کرنا چاہتا تو فلسفہ کی ان کتاہوں سے کوئی نہ کوئی جواز مل جاتا اور ہر شریف و صالح کو کچھ ان دلائل سے کچھ سماجی اور حکومتی حیثیت سے لاجواب کرتا۔

بہر حال زندگی اس ڈگر پر گزر رہی تھی جس میں نیک و بد کا تصور میرے اپنے مقررہ کردہ معیارات کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ ہر وہ کام نیک ہوتا جو میں کرنا چاہتا۔ اور جو کام میں بوجہ نہیں کر سکتا تھا وہ بد ہوتا۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ بے شمار دلیلوں کے باوجود دل میں کبھی بکھار خصوصاً چاندنی رات کو ایک تظیف دہ سی ہوک اٹھتی۔ اس ہوک میں اپنے اعمال بہت بڑے لگتے یہ اور بات ہے کہ یہ ہوک یا خیال اس قدر قوی نہ ہوتا کہ مجھے ان کاموں سے روک لیتا۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا یا میرے خون کی پاکیزگی تھی 'میری طلب کا کھر اپن تھا۔ میرا اخلاص اور سچاپن تھا یا میری زندگی کے حالات کا نتیجہ تھا کہ صرف حضرت شیخ المکرم مدظلہ العالی کا نام سننے ہی میں منارہ جانے کے لئے تیار ہوا کون لے گیا کیسے لے گیا یہ پھر کسی اور وقت پر بیان کروں گا۔ منارہ جانے کا فیصلہ ایک منٹ میں کیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ شیخ المکرم کا ذکر ویسے باتوں کے درمیان آیا تھا۔ دراصل وہ لوگ میرے پاس کچھ کام کے لئے آئے تھے بہر حال میں ان لوگوں کو ان کے ارادے کے بغیر ستمبر 1995ء کو اپنے ساتھ فوری خود ہی منارہ لے آیا۔ حضرت سے دفتر میں ملاقات ہوئی تو دل بہت خفا ہوا کیونکہ حضرت اس وقت حضرت نہیں نظر آتے تھے۔ بلکہ اس وقت میرے خیال میں یہ شخص پورا الما چوہدری تھا اور ثابت بھی یہی ہوا۔ کیونکہ شیخ کی قیام گاہ ایسی نہ تھی جیسی صوفیوں کی ہوتی ہے چونکہ میرے خیال کے مطابق خانقاہ کو چند کچے اور غلیظ کمروں پر مشتمل ہونا چاہئے ہے جس کے ساتھ ہمیشہ ایک عالی شان مسجد

ہوتی ہے اس سادہ خانقاہ میں ایک ملا سبز لباس میں بیٹھا ہوتا ہے جو بے چارہ آدمی کو  
 ہوتا ہے اور کپڑے ہمیشہ میلے رہتے ہیں اکثر چہرے کو چھپائے رکھتا ہے تاکہ یہ گناہ  
 گار اس کو مزید داغ دار نہ کریں۔ جب کہ ملا چوہدری کا دفتر جدید سولتوں سے  
 آراستہ تھا۔ شیخ کا لباس بھی ماڈرن تھا۔ شیخ فون پر انگریزی رسالہ میں اسلام کے خلاف  
 چھاپے گئے ایک مضمون پر کسی سے انگریزی میں Discuss کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی  
 ساتھ ایک بڑے مک میں کافی بھی پی رہا تھا۔ میں نے چودھری ملا کے دفتر میں ایک  
 کپیوٹر بھی دیکھا جبکہ دفتر میں داخل ہوتے وقت دفتر کے دروازے پر ایک گن مین  
 بھی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری ملا کے دفتر میں بعض نوادرات بھی دیکھے۔ بڑا  
 عجیب خالگا۔ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ خواخواہ اس شخص سے ملنے کے لئے تم نے  
 پانچ گھنٹے کا سفر کیا وقت اور تیل ضائع کیا اس آدمی کو خود پاس بلا لیتے۔ لیکن دل میں  
 سوچا کہ چلو لگتا ہے کہ دین کی باتیں بطور فلسفہ ذکر ہوتی رہیں گی اس چودھری کو اپنے  
 کسی مایوس حالات نے ملا دیا ہے۔ بے چارہ شاید مرد میدان نہ تھا اور حالات سے  
 بھاگ کر خانقاہ میں پناہ لی ہے اور ملا کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ تاکہ اس طرح زیادہ لوگوں  
 کو بلا خوف و خطر اطمینان سے لوٹے۔ لیکن ہم سے اس نے کیا لینا ہے۔ اس کے ساتھ  
 یارانہ من جائے گا۔ وہ دہنگ سا آدمی ہے دوستی میں وفادار ثابت ہو گا سچا سا آدمی ہے  
 اپنی لوٹ میں شاید ہمیں بھی مناسب حصہ دے گا۔ مگر ہمیں کیا خبر تھی۔ جس طرح  
 خواجہ نقشبندیہ کا خلیفہ خاص بول اٹھا تھا۔

منکر نہ شوی بہ حالات زندان

ہر چہ ترا نیست کسی را بود

بہر حال یہ میری چوہدری ملا سے پہلی ملاقات تھی۔ ان کی باتیں عجیب اور  
 دارالعرفان کا ماحول ڈراؤنا سا لگا۔ جہاں میرے اس وقت کے خیال میں دین کے سوا

سب ہم مل سکتا تھا۔ مغرب کا وقت تھا۔ ستمبر 1995ء تھا۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا تھا مگر میں نے اپنی ظاہری آنکھوں سے صرف دارالعرفان کی چار دیواری کے اندر سورج کی شعاعوں جیسی کرنیں دیکھیں جو شاید صاحب کشف لوگوں کے نزدیک انوارات ہوں گی مگر اتنا میں ضعیف الاعتقاد تو نہیں تھا۔ میرے نزدیک اس وقت یہ سورج کی شعائیں تھیں جو کہیں سے چھن کر آتی ہوں گی۔ حالانکہ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا بہر حال بیعت کا برائے نام معمول ہوا۔ دستور العمل ایک چھوٹی سی کتاب ملی۔ جس میں ذکر و لطائف اور کچھ اور ادا امر کا ذکر تھا جس کی بیعت کے بعد پابندی لازمی تھی بھلا اتنا جھوٹا سا کتابچہ اتنی وسیع کائنات میں بھرپور زندگی گزارنے کا احاطہ کسی طرح کر سکتا ہے۔ اس چودہری ملا اگرچہ پیارا سا شخص تھا لیکن ذرا بے مروت نکلا۔ نہ آتے وقت۔ نہ جاتے وقت نہ ٹھٹھے وقت چائے کا پوچھا۔ بڑا عجیب سا لگا۔ لیکن ہم نے سوچا چلو چودہری ملا کی یہ بے مروتی ہم چند دعوتیں کھلا کھلا کر نکال لیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بات بہت اچھی لگی کہ میرے ساتھ گئے ایک صاحب مجاز کو فرش پر بٹھایا۔ اور ہمیں ایک تخت پہ بٹھایا اس اکرام سے اور فرق مراتب سے دل خوش ہوا۔ کہ چلو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چودہری ہمیں وزن دار اور با وقعت شخصیت ماننے پر مجبور ہو گا۔

بہر حال نماز مغرب پڑھے بغیر منارہ سے نکلا اور 11/12 بجے رات کو گھر پہنچا تو دل میں خیال آیا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا ہے اور نہ یہ ہونے کا کام ہے اور ساتھ ہی دل میں خیال آیا کہ چودہری ملا کو اس بارے میں ایک خط بھی لکھو کہ ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ بے چارہ چودہری ملا ہمارا انتظار کرتا ہو گا لیکن خط اس وجہ سے نہ لکھا کہ چودہری ملا کو دکھ ہو گا کہ اچھی بھلی مرغی ہاتھ سے نکل گئی۔ تو میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ اسکے دل کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے ملا چودہری کی ساری

باتیں طریقہ ذکر اور بیعت وغیرہ سب بھول گیا اور زندگی حسب معمول گزرنے لگی۔ اس ہفتہ مجھے دوستوں کی ایک خاص محفل و ماحول میں جانے کا اتفاق ہوا جو صورت رات تھی۔ حسب معمول کپ شپ جاری تھی کہ اسٹے میں ماحول سر زد ہو گیا۔ ہر کسی کے روتختے کھڑے ہو گئے کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہر طرف سے اللہ ہو کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ہر کوئی اپنی مادی سماعت سے سننے لگا یہاں تک کہ گھاس اور پلیٹ اور بک بھی اللہ ہو کی آواز سے لرزنے لگے میں ڈر اور جلدی میں جا کر غسل کیا اور واپس آیا تو اب اللہ ہو کی گونج تیز ہو گئی اور سارے بسم سے اللہ ہو کی آوازیں نکلنے لگیں۔ موقع پر موجود احباب مجھے عجیب ڈراؤنے انداز میں دیکھنے لگے اور کہنے لگے شاہجی تم سید آدمی ہو ہمیں مفت میں کیوں دلا رہے ہیں تمہیں تو کوئی نکال لے گا۔ ہمارا کیا بنے گا۔ بہر حال جسم پہ ایک لرزہ طاری ہونے لگا۔ عجیب با قابل میان سا خوف محسوس ہوا اور ساتھ ہی ایک نفیس آواز سب کی موجودگی میں سننے لگا اب شیخ المکرم مدظلہ العالی کے سوا کوئی چاہنے والا نہیں۔ رات کے دو بجے تک اس ساری محفل نے با قابل میان صورت حال کو برداشت کیا ہر لمحہ میری پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور میں بے انتہا خوف محسوس کرنے لگا اس لئے بے اختیار ہو کر کار لے کر سید حانوارہ آیا۔

منارہ میں آنا بہت ہی قابل نفرت لگا۔ ہم صبح 8/9 بجے پہنچے تو ملا چودھری اپنی ذیلی کیمن میں گھر ہاشٹ کے لئے جا رہے تھے۔ ان سے گاڑی میں ٹلیک سلیک ہوئی بہت برا لگا کہ عجیب چودھری ملا ہے ہمیں کچھ سمجھتا ہی نہیں کہ جیسے ہمیں ہاشٹ کی ضرورت نہیں۔ اور چودھری ملا مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔ اسٹے میں دیکھا کہ چند ادازیوں والے نو عمر لڑکے دنیا داریاں اور خاص کر ہمارے جیسی عظیم شخصیت و ہستی سے لاپرواہ اور ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور جب چوہدری ملا ہمارے پاس رکا

تھا۔ تو مجھے بڑے رشک آمیز انداز سے دیکھ رہے تھے بہر حال ہمیں بے انتہا غصہ آیا کہ ہم اتنی دور سے آئے ہیں اور یہ چوہدری ملا ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتا اپنے آپ کو اتنا برا سمجھتا ہے کہ ہماری پیشوائی کے لئے گاڑی سے بھی نہ اترا۔ جس کا ہمیں بے انتہا صدمہ ہوا۔ میں نے بے بسوں اور لاچاروں کی طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کیا اور اس ملک میں ہم نے اس سے پہلے کسی بڑے آدمی کا بھی دو تین منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کیا تھا اس کے علاوہ ہمارے استقبال کے لئے نہ نوکر آیا نہ کسی نے دروازہ کھولا نہ جٹھنے کے لئے صوفہ تھا اور نہ کوئی A-C والی انتظار گاہ۔ اور ان دازھی والوں پر سخت غصہ آیا کہ تم نے ہمارے لئے گاڑی کا دروازہ نہ کھولا۔ اور ہمارا استقبال نہیں کیا۔ کہ جیسے ان کی تو یہ ذمہ داری تھی کہ میرے جیسی عظیم شخصیت کا استقبال کریں۔ بہر حال ان جان لیوا حالات سے گزرتے بلا ملاقات واپسی کا فیصلہ کیا۔ مگر ایک نایدیدہ قوت کے ہاتھوں بلا سبب ظاہری کے رک گیا۔ بہر حال یہ ناقابل بیان سختیاں جھیل کر جب چوہدری ملا اپنے دفتر میں ایک شان سے آیا تو ہمیں بھی بلایا گیا۔

دفتر کے اندر داخل ہوتے ہی ساری خانی و نوالی کا فور ہو گئی۔ اور وہی رات والا سحر زدہ ماحول Replay ہو گیا جس سے ڈر کر میں منارہ آیا تھا لیکن اس وقت میں ڈر نہیں رہا تھا بلکہ اس وقت رقت طاری تھی چوہدری ملا کو رات والا واقعہ سنایا تو گھورنے کے انداز میں جواب دیا کہ ہاں شاہ جی اس طرح تو ہوتا ہے ذکر کے ماحول کے بغیر تو ایسا ہوتا رہے گا۔ اور جب چوہدری ملا نے ذکر کے بارے میں پوچھا تو ہم نے بے دھڑک شاہانہ و گستاخانہ انداز میں جواب دیا کہ یہ ناگوار عجیب سا کام ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی آسان سانسخ یا طریقہ یاد ہے تو بتا دو۔ چوہدری ملا نے میرے اس شاہانہ جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے نظریں مجھ پر گاڑتے ہوئے کہا کہ شاہ جی متذکرہ معمول چند منٹ کے لئے کر لیا کرو۔ سویرے نہیں اٹھ سکتے تو نماز تضا پڑھ

کر چند منٹ کے لئے معمول کر لیا کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو گا اور نظریں دوبارہ  
 گاڑ کر کما کہ چند منٹ معمول کر لیا کرو۔ اگر فرق نہ پڑا تو میں ذکر چھوڑ دوں گا  
 اور آپ کا دوست بن کر آپ والے کام شروع کر دوں گا۔ اس وقت دل میں خیال آیا  
 کہ اب ملا چودھری ہم سے Impress ہو گیا ہے اور ہماری لائن پر آگیا ہے اس  
 خیال کے آتے ہی تیسری بار نظریں گاڑ دیں۔ جس پر لرزہ طاری ہو گیا اور عجیب  
 ناقابل بیان سا خیال آیا اس خیال کے آتے ہی بے اختیار زندگی میں پہلی بار کسی  
 دوسرے شخص کی موجودگی میں رو پڑا بہر حال چودھری ملا میرے رونے سے لا پرواہ  
 تھے نہ ہمیں منایا۔ نہ تسلی دی بلکہ اپنی کرسی سے اٹھنے لگے جس پر مزید غصہ آیا اور  
 فرمایا کہ شاہجی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب تم صحیح  
 عمر صحیح جگہ میں مضبوط ترین طاقتور ترین ہاتھوں میں آئے ہو اور جاتے ہوئے کہہ  
 گئے کہ کبھی کبھار خط لکھا کرو۔ اس سے توجہ ملتی رہتی ہے الفاظ یہ تھے یا کچھ اور لیکن  
 منسوم بالکل یہ تھا جس مجھے یہ باتیں روایتی پیروں والی لگیں۔

اور میں نے دل میں آپ کو دوسری بار چودھری ملا کا خطاب دیا اور میں نے جب  
 اجازت چاہی تو فوری اجازت دے دی نہ اپنی کرسی سے اٹھے اور نہ ہماری رخصتی کے  
 لئے دفتر سے باہر آئے اس نے دفتر میں نہ چائے کا پوچھا اور نہ پانی کا بے انتہا غصہ آیا۔  
 کہ عجیب آدمی ہے شکل صورت و جسامت اور رنگ ڈھنگ سے اچھا خاصہ چودھری  
 لگتا ہے مگر ملائیت نے کتنوس بنا دیا ہے۔ مگر ساتھ دل میں خیال آیا کہ ملائیت اس کے  
 پاس سے بھی نہیں گزری۔ کیونکہ ہمارے ہاں غریب لاچار اور بے نوا شخص کو ملا کہتے  
 ہیں جو ان پڑھ اور غریب ہو اور ہمارے شایان شان استقبال اس کی مجبوری  
 ہو۔ بہر حال چودھری ملا نے مسمان نوازی اور عالی شان لوگوں کا اکرام سیکھا ہی  
 نہیں تھا۔ لیکن میرے دفتر سے نکلنے پر چودھری ملا نے ایک فائر کر دیا کہ جا کے فکر

میں چائے پی لویہ بات گولی کی طرح لگی کہ اب ہم پراتا برا وقت آگیا ہے کہ ہم نگر والی چائے پیئیں گے۔ اس لئے میں غصے میں بغیر ناشتہ کئے منارہ سے نکلا اور راستے میں ڈرائیور نے آداب مہمان نوازی کا ذکر کر کے مزید دماغ خراب کر دیا جو ہمیشہ اچھی بھلی مہمان نوازی کا عادی تھا 4/5 گھنٹہ کے سفر کے بعد شام کو گھر پہنچا اور زندگی کی پہلی شام گھر پر گزاری رات کو عجیب سا احساس تھا جس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب میرے دل کی گمراہیوں سے آوازیں آنے لگیں کہ یہ شخص چودھری ملا نہیں۔ شیخ المکرم ہے یہ تمہارا اکرام کیوں کرے تیرے اکرام کرنے والے کیا اور تھوڑے ہیں۔ تیرے اندر انسانوں والی بات کونسی ہے۔ اس قسم کی بے شمار باتیں ہوئیں۔ جس میں شیخ المکرم کی باقاعدہ جسمانی موجودگی محسوس کرتا رہا۔ ٹھیک 4 بجے اٹھ گیا اور بے اختیار رونا آیا اس رونا اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ آواز سنی کہ یہ شخص چودھری ملا نہیں شیخ المکرم ہے۔ اس کو اللہ نے تیرے لئے اور صرف تیرے لئے پیدا اور مختص کیا ہے اور ایک دفعہ تمہیں شیخ کی شکل میں بھی دکھایا تھا جو تم بھول رہے ہو۔ ذہن پر زور دے کر یاد کر لو اور تم ”ہم“ نہیں ہو۔ بلکہ تم صرف تم ہو۔ اور حضرت کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہم تمہاری اتانیت کو سلب کر رہے ہیں سب دل سے غبار چھٹ گیا رونا ختم ہوا۔

اب ہر چند ایک واضح مگر بدلی ہوئی نظروں سے چیزوں کو دیکھنے لگا اور جب اس وقت میں نے طریقہ ذکر کی سختی اور دیگر شرائط و ضوابط کی سختی میان کی تو ایک نفیسی آواز نے تسلی دی اور سمجھایا۔ کہ جب فوج میں بھرتی ہو چکے ہو تو لازمی سروس کے وہ تمام قوانین اپنانے ہوں گے جو ایک فوجی بھرتی ہونے کے بعد خواستہ یا بادل تا خواستہ اپناتا ہے اور اتنے میں ایک آواز مزید گھمبیر ہو گئی کہ شاہجی یہ تو انین و ضوابط اپنی مرضی و خوشی سے اپنالو ورنہ اس سلسلہ میں تم پر جبر اور زبردستی بھی کی جائے



گی۔ س سے پہلے اس قسم کی گستاخی کا عادی نہ تھا مگر پہلی دفعہ اس آواز سے ڈرنے لگا کہ واقعی زبردستی کی جائیگی اور تمہارے خلاف قوت و جبر استعمال کیا جائے گا۔ اور میں تمام ہدایات و قوانین کی پابندی کرائی جائے گی۔

ان نادیدہ قوتوں اور آوازوں سے مجبور ہو کر فوری نماز پڑھی چند منٹ ذکر کیا جو سارا رونے میں گزر گیا اب یہ حالت ہو گئی کہ چند منٹ کی فراغت ہو جاتی تو میں کسی ان دیکھی قوت کے زیر اثر اس میں ذکر کرتا رہتا بہر حال یہ ایک طویل قصہ ہے جس کو ادھر ہی چھوڑ رہا ہوں۔ تیسری ملاقات ماہ ستمبر کے آخری دنوں یا اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوئی۔ اب دل سے سارے شکوک نکل چکے تھے اب حضرت جی کے پیارے چہرے پہ نظریں ڈال کر حضرت جی کی موجودگی میں روتا رہتا اور ایک دن اپنی نالائقی اور بے کاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہہ اٹھا کہ حضرت میں نالائقی ہوں یہ کام مجھ سے شرائط کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور شیطان مجھے دوسو سے دلا رہا ہے کہ یہ کس معیبت میں پڑے ہو کوئی آواز سانپ کی طرح پھینکارتی رہتی ہے۔ یہ چیزیں چھوڑ دو۔ حضور میں کمزور آدمی ہوں مجھے تمام کر رکھیں۔ تو حضرت نے واضح طور پر بتایا۔ الفاظ تقریباً یہی تھے کہ شاہ جی فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ ہمیشہ ہمارا ساتھ رہے گا۔ اب تم واقعی صحیح جگہ آگئے ہو۔ اب ہم تم کو نہ چھوڑیں گے اور نہ بھائیں گے باقی شیطان کے ساتھ اپنا فیصلہ خود کر لو میں اس میں کیسے آسکتا ہوں۔ ہر آدمی اپنی ذات کا خود مکلف ہے۔ بس یہ حضرت سے تبدیلی کے بعد پہلی ملاقات تھی چونکہ زندگی میں ہر کام نہایت اخلاص و جرات مضبوط دل اور مردانگی سے کیا ہے آدھے دل کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا ہے۔ آدھی دوستی آدھی دشمنی کا قائل نہیں ہوں اور ہر کام بھرپور طریقے سے انجام دیا ہے۔ اب اللہ کا کرم اور شیخ کی توجہ اور بے انتہا شفقت کا کمال تھا کہ ذکر و مراقبہ میں مقدور بھر وقت لگا تا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ

شیطان کے بسہکاوے جاری تھے شیطان سے خوب ہٹ مباحثے ہوتے رہے اور مباحثوں میں اکثر شیطان سے گالیاں کھاتا رہتا ایک بار جب ایک مباحثہ میں شیطان جو کہ دلائل عتقیہ سے اچھی طرح لیس تھا ہڈ چڑھ کر پوری قوت سے حملہ آور ہو رہا تھا تو تبدیل زندگی میں پہلی بار شیخ المکرم مدظلہ العالی کی روحانیت کی طرف متوجہ ہوا۔ اور امداد کا ملتی ہوا۔ تو شیخ کی عظیم توجہ بے مثال شفقت اور روحانی قوت کام آئی اور شیطان سے فیصلہ ہوا کہ آئندہ کے لئے یہ تین چیزیں طریقہ ذکر 'سلسلہ عالیہ اور عظمت شیخ یہ تینوں عنوانات Not-negotiable ہیں۔ شیطان شریف آدمی تھا۔ حضرت کی توجہ سے لاچار ہو کر agree کر گیا شیخ کی توجہ سے ملتی ہوں کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح شیطانی لغزشوں سے چائے رکھیں۔ یہ میرے سفر کا وہ قصہ تھا جو میں نے چودھری ملا سے لے کر شیخ المکرم مدظلہ العالی تک طے کیا ہے اب تو دل ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ حضرت شیخ المکرم کے قدموں میں سب کچھ لٹا دیا جائے جہاں سے نفرت اور کھن آتی تھی وہاں مر مٹنے کو دل چاہتا ہے وہی نقشبندیہ کے خلیفہ کا شعر آخر میں کام آیا

مر جویم شرح و مضمّن ہر دوام

بجز و عمہ و مکر دو این تمام

اور اغیار کے بارے میں وہی تو ہے

مگر سوی بد حالت زند دلائل

یا ہر چہ ترا نیست کسی را نبود

سنائے کہ ہر شیخ سلسلہ کی مراد ہوتی ہے کاش میں بھی شیخ کی مراد ہو تاکاش کاش۔

## محیثیت شیخ المکرم مدظلہ العالی

عبد الودود شاہ

حضرت مدظلہ العالی کی یہ حیثیت یا تو اکابرین سلسلہ جانتے ہوں گے یا سلوک کے اسرار و رموز سے واقف حضرات کو علم ہو گا۔ مجھے تو بس یہی علم ہے کہ تابعین کے بعد حضرت مدظلہ العالی جتنے عظیم درجے کا صوفی نہیں گزرا ہے۔ جو ایک طرف عالم حکوین میں امام العدلیقین کے منصب پر فائز ہیں تو دوسری طرف سلوک میں حجابات الوہیت کے کسی حجاب میں سیر فرما رہے ہیں۔ مجھے یہ علم تو نہیں کہ حضرت حجابات الوہیت میں کون سے حجاب میں ہیں مگر اتنا علم ہے کہ تابعین کے بعد آج تک حجابات الوہیت میں اس مقام پر کوئی بھی صوفی نہیں پہنچا ہے جسے حضرت مدظلہ العالی نے 3/4 سال پہلے فرمایا تھا کہ میں اس وقت سلوک کے ایک ایسے مقام پر ہوں جس کا پہلے کسی صوفی نے ذکر نہیں کیا ہے اور نہ اس مقام پر کوئی اور صوفی نظر آتا ہے جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ اس مقام پر جانے کے وقت حضرت جسمانی طور پر انتہائی

حدت محسوس فرماتے تھے اور اس حدت کو کم کرنے کے لئے گھمیا تو یہ استعمال کئے جاتے تھے۔ اور یہ راز اس وقت کھلا جب ایسی حدت والی صورت حال حاضریں کی موجودگی میں پیدا ہوئی تو حاضریں میں کسی نے اس کو جسمانی مرض سمجھ کر ڈاکٹر بلانے کا مشورہ دیا تو حضرت مدظلہ نے انکار فرمایا اور یہ فرمایا کہ جسم کی حدت و گرمی کسی جسمانی نقص یا بیماری کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ جسمانی حدت سلوک کے ایک خاص مقام پر جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے تصوف اور سلوک کے مقامات کے بارے میں اتنے واضح وسیع اور جامع ارشادات کسی بھی صوفی نے بیان نہیں کئے ہیں۔ ہاں اگر کسی کو میرے اس مشاہدہ یا ذاتی تجربے کے بارے میں شک ہو تو بازار میں سلوک کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں کسی بھی ایک کتاب یا ان ساری کتابوں کے مجموعوں میں سے سلوک کے بارے میں حضرت کی ایک تقریر یا تحریر کے مقابلے میں مواد پیش کیا جائے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ تاریخ تصوف میں پہلی بار سلوک کے بارے میں اتنی ہمہ گیر معلومات اور خاص کر مقامات کے بارے میں پہلی بار دی گئی ہیں۔ اب یہ ثابت ہے کہ حضرت مدظلہ العالی کے اتنے بڑے مقامات ہیں تو لازماً آپ مدظلہ العالی کی محبت کے اثرات بھی اس قدر قوی ہوں گے جس کا تعلق تجربہ سے ہے مگر شرط صرف یہ ہے کہ طالب میں خالص طلب ہو کمری عقیدت ہو شیخ کا ادب و اطاعت تہہ دل سے کرتا ہو صحبت شیخ شرائط کے ساتھ ہو۔ خالی خانہ پری نہ ہو۔ پھر ہر کسی کو اندازہ ہو جائے گا کہ صحبت شیخ درحقیقت کیا ہے؟ اس کی مکمل حقیقت بیان ہی نہیں کی جاسکتی ہے اس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً آپ کسی نامرد شخص کو نکاح کے بعد کی صورت حال کیسے سمجھا سکتے ہیں۔ اللہ ہمیں شیخ کی توجہ سے دنیاوی اور سلوک دونوں میں نامردی سے چائے۔ اگر صحبت شیخ شرائط

کے ساتھ نصیب ہو تو روحانی طور پر تو چھوڑیے۔ جسمانی طور پر بھی صحبت کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے گو جس سے ہم مکمل طور پر مستفید نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہماری اپنی بد قسمتی اور نالاغی ہے جس کا بنیادی سبب ہماری ناقص طلب 'لولی لنگڑی عقیدت اور ریاکاری والا ادب و اطاعت ہے۔ جو توجہ شیخ کے سمندر سے خود ہی اپنے اپنے حصے کے دریاؤں کے دھانوں میں بند باندھ کر اپنے لئے فیوضات کا سرچشمہ ہی بند کرتے ہیں اب اگر شیخ بھی چاہے تو فیض نہیں دے سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں تو انبیاء علیہ السلام فیض نہیں دے سکتے ہیں تو پھر شیخ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم انسانیت چھوڑ کر اخلاص کے ساتھ طلب لے کر شیخ کے ساتھ سچی عقیدت، کھری طلب غیر مشروط ادب و اطاعت کریں تو شیخ چاہے یا نہ چاہے فیض ملتا رہے گا ورنہ نہیں ملے گا۔ خواہ شیخ کا اپنا بیٹا کیوں نہ ہو مگر ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم صرف دکھاوے کے لئے ظاہری طور پر شیخ سے تعلق کا دعویٰ کرتے ہیں اور زور و شور سے اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں اور حضرت شیخ کے سامنے چکنی چپڑی باتوں سے حصول فیض شیخ کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ بہ باطن ہم شیخ کو اپنا بڑا یا بڑا تو چھوڑیے۔ استاد ی میں اپنے ہی شیخ کو اپنے شاگرد کے برابر سمجھتے ہیں اب ایسی گھناؤنی صورت حال میں حصول فیض کا دعویٰ اپنے کو دھوکہ دینا ہے اور چونکہ شیخ اپنی عظمت اور ہماری عدم طلب سے واقف ہوتا ہے اس بنا پر خاموش رہتا ہے۔ لیکن ہم اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اگر میں غلط ہوں تو شیخ ہی مجھے کہے کہ تمہیں فیض نہیں مل رہا ہے۔ تو جب میں اپنے رویے اور خیالات پر نظر ثانی کروں گا۔ بھنسی شیخ کو کیا پڑی ہے؟ کہ شیخ خواجہ خواجہ چیز آپ کو دینا چاہے جس کے لینے سے نہ صرف آپ انکار کرتے ہیں بلکہ خلوص قلب سے اس طلب کی زدید بھی کرتے ہیں۔ شیخ کی اہمیت اپنی جگہ مگر شرائط متذکرہ

نہ ہوں تو نبی ﷺ کی محبت کام نہیں آسکتی ہے۔ چہ جائیکہ شیخ۔ مگر اس سے مراد یہ نہ لیا جائے کہ میں شرائط کے ساتھ سلوک سیکھ رہا ہوں۔ تو اب اسکے ساتھ ہی ساتھ مزاج شیخ کو بھی مکرر کرتا رہوں اور مجھے فیض ملتا رہے گا۔ یہ بھی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ ایسی صورت میں بھی فیض کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ اس لئے فیض شیخ سے سیراب ہونے کے لئے مندرجہ بالا شرائط کے علاوہ مزاج شیخ کا خصوصی خیال رکھنا چاہئے۔ جہاں تک میں حضرت کی صحبت سے حضرت کی تعلیمات کو سمجھ سکا ہوں اسکا خلاصہ میں اپنے لئے اور دیگر سالکین کے لئے درج کر رہا ہوں شاید کہ مجھ جیسے بھولے بھٹکے کو راستہ ملے۔

## سلسلہ اویسیہ کی عظمت

جہاں تک صوفیائے عظام میں طرز تربیت میں اختلافات کا تعلق ہے۔ صوفیاء عظام اپنی اپنی تعلیمات و برکات، کچھ طرز تربیت اور کچھ زمانے، علاقوں اور مختلف قومی مزاجوں کی وجہ سے چار سلاسل یعنی چار گروہوں میں منقسم ہوئے۔ ورنہ دراصل تصوف کے سلاسل بے شمار ہیں۔ جن میں تمام کی سند شجرہ حدیث کی سند کی مانند مسلم اور مصدقہ ہے۔ ان صوفیاء عظام نے نہ صرف کردار سازی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے تعلیمات نبوت اور برکات نبوت کی مدد سے عقائد اعمال اور اخلاص کی مکمل تصحیح کی اور اپنے قول و فعل ہی سے تعلیمات نبوت اور برکات کو محفوظ رکھا۔ تمام صوفیاء کی تربیت کا نصاب تعلیمات نبوت اور برکات نبوت پر مشتمل ہے۔ تعلیمات اور برکات نبوت سے افراد کی اس طرح تربیت کی۔ کہ وہ ایک ماڈل مسلمان بن گئے۔ اگرچہ صوفیاء عظام میں طریقہ تربیت کے بارے میں بوجہ فطری استعداد کچھ اختلافات ہیں۔ لیکن مقصود کی یکسانیت اور ہمہ گیریت کی وجہ سے تربیت کے طریقوں کے ان اختلافات کے باوجود ان سے فیض کے حصول میں کوئی

رکاوٹ یا کوئی حجاب نہیں۔ اگرچہ تصوف میں طالب کی مخصوص استعداد اور شیخ کے مخصوص رجحان کے لحاظ سے بے شمار تربیت کے طریقے رائج ہیں اسلئے تربیت کے ان طریقوں کو آسانی کے لئے دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے پہلے طبقے کے نزدیک "جلب اخلاق حمیدہ" اور "سلب اخلاق ذمیرہ" کے بعد سالک کو آگے چلایا جائے اور انس الہی کے بڑھنے کے لئے تھوڑا سا ذکر بھی کرایا جائے۔ اسی طرز تربیت کو سلوک کہتے ہیں۔ دوسرے طبقے کے نزدیک یہ طریقہ ضروری نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے ذکر الہی پر لگایا جاتا ہے۔ تاکہ ذکر کی برکت سے اخلاق 'عقائد' معاملات اور عبادات کی اصلاح خود بخود ہو جائے اور اتباع شریعت مزاج انسان بن جائے۔ اسی کو طریقہ جذب کہتے ہیں دور تا بعین سے لے کر اب تک امت مسلمہ کی تربیت و کردار سازی کا یہی طریقہ جاری و ساری ہے۔ اور تاریخ تصوف میں طریقہ جذب سے تربیت کا عام انداز بہت کم اپنایا گیا ہے۔ طریقہ جذب کے ذریعے سے تصوف میں تربیت کا بہت سرسری ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ جس کو اصطلاح میں نسبت اویسیت کہتے ہیں تاریخ اویسیت کا مطالعہ ثامت کرتا ہے۔

کہ نسبت اویسیہ کو اس وقت ترقی دی جاتی ہے جب عام معاشرہ میں کفر و طاغوتی قوتیں زور پکڑتی ہیں۔ سرکشی اور تمرد سکھ رائج الوقت بن جاتا ہے۔ معاشرے میں بد اخلاقی اور بد کرداری عام ہو جاتی ہے۔ جس سے عام مذہبی ماحول بھی کثافت زدہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کثافت زدہ ماحول سے مسلمانوں کے قلوب بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام شرعی اعمال کی انجام دہی مشکل ہو جاتی ہے اور سرزد اعمال کے ثمرات پر بھی گرد پڑ جاتی ہے مذہبی عقائد اور اعمال کا سرعام مذاق اڑایا جاتا ہے اور معاشرہ کی یہ مروجہ اقدار دینی افراد کی ہر وقت تذلیل کرتی ہیں۔ بد کرداروں کو شاباش دی جاتی ہے اور نیک لوگوں کو بد کردار اور



بد مذہب کہہ کہہ کر ان کی تذلیل کی جاتی ہے اور پریس کا ایک خاص دانشور مذہبی طبقہ اسلام کے خلاف اسلام ہی کے نام پر مسلمان ہی کی زبان سے زہر اگلتا ہے۔ جس پر پشیمانی اور ندامت کی جگہ فخر کیا جاتا ہے۔ تعلیمات نبوتؐ کو کسی فلاسفر کے خیالات سے مآخذ شدہ اور دینی رویہ اور اعمال کو بنیاد پرستی کہہ کہہ دین اللہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہمارے اس دور میں ہمارے اسلامی معاشرہ اور ملک میں جہاں گناہ پر فخر اسلام کے اعمال پر شرم اور طنز مسلمان عقیدہ کو پسماندہ اور ترقی کے مخالف اور عمل و کردار کے مسلمان کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ جہاں گناہ کی ترغیب کے بے شمار تقشیری ذرائع سے تبلیغ عام کا سلسلہ جاری ہے۔ نیکی کی راہ میں ہر کس و نا کس بے شمار رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اسلام اور اسلام کے نظریہ حیات کے بارے میں ہر کوئی ناگفتہ بہ باتیں سر عام کرتا ہے۔ ترغیب گناہ کی تبلیغ پریس اور الیکٹرانکس میڈیا پر باقاعدہ ہوتی ہے۔ ہر کوئی مجتہد، مفسر، محدث، فقہ، اور مبلغ بتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور عمل میں رکاوٹوں کے پہاڑ اپنے ہی مسلمان کھڑے کرتے ہیں اور یہ سب کچھ چوری چھپے نہیں کسی لاعلمی اور بے خبری کی بنیاد پر نہیں بلکہ ڈکٹے کی چوٹ پر علی الاعلان کیا جاتا ہے۔

تو ایسے حالات میں رحمت حق کو وہی جوش آتا ہے جو انبیاء کے مبعوث ہونے کے وقت آتا تھا۔ چونکہ اب نبوتؐ کا دروازہ تاقیامت بند ہے تو پھر اللہ کا یہ دستور ہے کہ اپنی معرفت کے حصول کے طریقہ کار کو مروجہ طریقوں میں ایک مزید قوت کا اضافہ فرما کر اس کے حصول کو عام اور آسان کرتا ہے اور اس کے اثرات و ثمرات کو بھی عام کرتا ہے۔ اس لئے اللہ کریم سلاسل تصوف میں اپنی معرفت کے حصول کے جاری طریقہ کار کو اویسییت ہی کے ذریعے مزید قوت اور طاقت دیتا ہے۔ تاکہ مروجہ اعمال اللہ پر عمل آسان ہو اور اس کے ثمرات جلدی مرتب ہو جائیں اور محسوس ہوں اسلئے ہمارے سلسلہ یا اویسییت کو باقی تمام سلاسل پر دو وجوہ کی بناء پر

ذوق حاصل ہے۔

۱۔ ہمارے طرز تربیت کی بنیاد اویسییت پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ روح

سے روح کو فیض نصیب ہوتا ہے اور روحوں میں یہ قوت موجود ہے کہ آپس میں فیض لیں اور دیں۔ اور روح سے روح کو فیض صرف ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کا طرہ امتیاز ہے۔ باقی سلاسل میں عمریں لگا کر اور مجاہدات جمیل کر اگر کوئی سالک الجذولی سے آگے بڑھنے کی استعداد رکھتا ہو تو ان کو نسبت اویسیہ نصیب ہونے کے بعد آگے ترقی ملتی ہے۔

۲۔ ہمارے سلسلے کی عظمت کا دوسرا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم برکات نبوت کو

براہ راست حضرت محمدؐ کے سینہ اطہر مبارک سے صرف ایک واسطہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ذریعے سے لیتے ہیں۔ جو کائنات میں انبیاء کے بعد افضل ترین شخصیت ہیں۔ اور آپؐ انسانوں میں واحد غیر نبی ہیں جن کو معیت ذاتی بغیر کسی شرط کے نصیب ہے اور آپؐ ﷺ کے واردہ برزخ ہونے کے بعد آپؐ کے ظاہری اور باطنی تمام کمالات و برکات نبوت کے وارث بن گئے۔ بہر حال باقی سلاسل میں حصول فیض اور توجہ شیخ کے لئے شیخ کی خدمت میں جانا پڑتا ہے۔ اور اتحاد عالم کا ہونا فیض از شیخ کی شرائط میں سے ہے جبکہ ہمارے سلسلہ میں ایسا نہیں، ایک دفعہ جب شیخ المکرم آپؐ کا رابطہ روح سے قائم کرادیں تو مشائخ سلسلہ سے از خود بغیر اتحاد عالم کے فیض کا نزول و حصول شروع ہوتا ہے۔ چونکہ مشائخ سلسلہ کو فیض درمیان میں صرف بارہ واسطوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصیب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فیض زیادہ اور طاقتور ہوتا ہے اور ہمیں سے سالکین کو فیض ملتا ہے۔

## حضرت مدظلہ العالی کی تربیت کا طریقہ

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان روح و جسم کا مرکب ہے اور فانی نہیں ہو گا ہاں اس کے فنا کی صورتیں بدلتی ہوں گی۔ انسان کی رہنمائی ذہن و عقل سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ انسانیت کی رہنمائی صرف انبیاء علیہ السلام کر سکتے ہیں۔ جو اس مقصد خصوصی کے لئے مائے گئے تھے۔ آپؐ سے پہلے کے انبیاء علیہ السلام مخصوص وقت قوموں اور علاقوں میں مبعوث فرمائے گئے اور پیغمبروں کی دعوت میں ہمیشہ تسلسل رہا یعنی عقائد میں سب متفق تھے۔ احکام عبادات وغیرہ کے طریقوں میں ضرور فرق ہے۔ سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو بھیجا جن کو اور خطابات کے علاوہ رحمت اللعالمین کا خطاب دیا گیا۔ آپؐ کی عمومی رحمت سے تمام کائنات اور اس میں موجود مخلوق اور رحمت خاصہ سے مسلمان اپنی اپنی استعداد و عقائد کے مطابق فیض یاب ہوتے ہیں بہر حال آخری نبیؐ کی دعوت کے دو حصے ہیں جن میں ایک تعلیمات اور دوسرے کبریات کہتے ہیں۔ جس طرح تعلیمات کو حفاظت الہی نصیب ہے یعنی قرآن و حدیث کے الفاظ اور معنی محفوظ ہیں۔ ہتھیہ کبریات بھی اسی

طرح محفوظ ہیں۔ ورنہ ختم نبوت کا تصور باطل ہو گا اور حفاظت الہیہ کا عقیدہ بھی خطرہ میں پڑ جائیگا۔ نبوت کے دونوں پہلوؤں سے استفادہ کرنے کے لئے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ضروری ہے اور بالقلب کی تصدیق صرف برکات نبوت سے ہو سکتی ہے جو یا تو نبی کی صحبت سے یا ان برکات کے حامل افراد سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے شیخ کامل کے لئے محض عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت پر عامل برکات کا حامل اور برکات کو تقسیم کرنے والا ہو اور برکات کے اس حصول یا فیض کے حصول کے لئے کوئی انسانی شرط یا مجاہدات وغیرہ نہیں ہیں بلکہ جو آدمی شرائط فیض یعنی طلب، عقیدت، ادب اور اخلاعت سے مزین ہو تو ان برکات کو بعد از تصحیح عقائد، اتباع شریعت، تصحیح اعمال اور تصحیح اخلاص کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے۔ سلاسل کا بنیادی کام ہی تعلق بالرسول اور تعلق باللہ کے قیام کے لئے توفیق عمل کی قوت دینی ہوتی ہے۔ اور سلاسل توفیق عمل کی قوت کو ذکر و اذکار، مراقبات اور مجاہدات سے قوی کرتے ہیں۔ انسانی مزاج، واقعات، حالات اور ماحول کے مطابق ان اذکار، مراقبات، مجاہدات کی نوعیت اور صورتیں بدلتی رہتی ہیں مگر مقصد اور ذرائع ہمیشہ ایک رہے ہیں۔

یہی ذرائع یعنی ذکر و اذکار، مراقبات اور مجاہدات ہمارے سلسلے میں بھی اپنائے گئے ہیں لیکن ہمارا زیادہ زور ذکر پر ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعے روح قوت حاصل کرے اور مقامات سلوک طے کرے اور ان مقامات پر روح کے جانے سے جسم کے لئے توفیق عمل کی قوت زیادہ ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ذکر کا تعلق ہے۔ ہر امر کی پابندی اور ہر نہی سے چمنا ذکر شرعی کہلاتا ہے لیکن اسکے علاوہ بھی ذکر اسم ذات کا حکم اور پھر کثرت سے ذکر کرنے کا حکم پایا جاتا ہے۔ تو مشاہیر صوفیاء لسانی ذکر سے ذکر کا ماحول پیدا کرنے کے لئے قلبی ذکر کی طرف گئے۔ جب کہ ہمارے مشائخ اسم ذات

کی کثرت کے حکم کی پابندی براہ راست ذکر قلبی سے کرتے ہیں جو کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں بلکہ واحد شرط یہ ہے کہ ذکر میں ایسا طریقہ نہ اپنایا جائے کہ جو خلاف شریعت ہو۔ جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جسم انسانی میں چند اعضائے ریسہ ہیں جس سے بدن کی صحت اور خود بدن قائم ہے بالکل اسی طرح روح کے بھی چند اعضائے ریسہ ہیں جس پر روح کی صحت و بقا کا دار و مدار ہے۔ جس طرح جسم کی مادی غذا ہے اسی طرح روح کی غذا ذکر اللہ ہے روح کے ان اعضائے ریسہ کو اصطلاح تصوف میں لطائف کہا جاتا ہے۔ اگرچہ روح میں ان اعضائے ریسہ کے مقام کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ان کے وجود کا کوئی انکاری نہیں ہے جہاں تک لطائف کی جسم میں جگہ کے اختلافات کا تعلق ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اگر کوئی معدہ کو سینہ میں پھپھڑوں کو پیٹ میں دل کو پاؤں اور دماغ کو ہاتھوں میں بھی قرار دے۔ تو جگہ کی اس تبدیلی سے صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ بشرطیکہ یہ اعضائے ریسہ صحیح طور پر اپنا وظیفہ سرانجام دے رہے ہوں۔ ورنہ اگر ان کو اپنے اصلی مقام پر تسلیم بھی کر لیا جائے اور یہ اپنا کام نہ کرتے ہوں تو جسم کی صحت اور بقا کو خطرہ ہو گا بعینہ یہی مثال روح کے لطائف کی بھی ہے۔ اس کو جہاں بھی تعین کوئی کرے تو جسم ہی کے اندر کرے گا اور اگر ان کو صحیح طریقہ سے ان کی خوراک یعنی ذکر الہی پہنچائی جائے تو روح کی صحت برقرار رہے گی اور جسم میں جگہ کے اختلاف سے روح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

ہمارے سلسلے میں روح کے لطائف قلب روح سری، خفی، اخفی، نفس اور سلطان الاذکار ہیں۔ موخر الذکر دو لطائف نہیں ہیں جن کی تفصیل اور ذکر کا طریقہ کتابوں میں ملتا ہے اور حضرات مدظلہ العالی اس کا ذکر اور طریقہ ذکر بار بار فرماتے ہیں۔ شرائط سے ذکر اور حدود قیود میں صحبت سے لطائف منور ہو جاتے ہیں اور روح

میں قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس راستے پر سفر کر سکے۔ جس راستے پر آپؐ معراج کو تشریف لے گئے تھے جہاں ان کیفیات اور سفر کو سلوک کے لحاظ سے کچھ مقامات کا نام دیا گیا ہے تاکہ سالک کو اپنے سفر کی طوالت اور اپنی محنت کے ثمر کا مسلسل احساس ہو تا رہے۔

حضرت کا ذکر اور طریقہ تربیت ذکر یہ ہے کہ ذکر میں منہ، آنکھیں بند ہوں، سانس ناک سے تیزی سے لی جائے جسم کو حرکت دی جائے اور توجہ اس بات پر لگی رہے کہ جو سانس اندر جا رہی ہے ساتھ ”اللہ“ لے جا رہی ہے اور باہر آنے والا سانس ”ہو“ کو باہر لا رہا ہے۔ ضرب وغیرہ کا ذکر عملی مثال سے سکھایا جاسکتا ہے یہ پڑھنے والا راستہ اور طریقہ نہیں ہے۔ ناک کے ذریعے تیز سانس اور جسم کی حرکت کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو توجہ ”اللہ ہو“ پر قائم رہتی ہے اور دوسرا یہ کہ جسم میں ایک خاص درجہ حرارت پیدا ہوتا ہے جو پرواز روح کے لئے بطور شرط ہوتا ہے اور روح کی پرواز میں بھی معاون ہوتا ہے چونکہ یہ طریقہ خلاف شریعت نہیں بلکہ مشائخ عظام کا آزمودہ طریقہ ہے اس لئے حث و مباحثہ میں پڑنے کے بجائے ساری توجہ اپنے کام پر لگانا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی مزید ریسرچ کرنا چاہتا ہے تو وہ کہیں تصوف کے مدرسہ میں داخلہ لے کر باقاعدہ طور پر سلوک کے نظریات کا علوم حاصل کرے۔ مگر بات یہ ہے کہ سلوک تو نظریاتی چیز ہے ہی نہیں بلکہ کرنے کا کام ہے اور کرنے کے کام میں مشائخ کی نقل کرنی چاہئے نہ کہ ان کے ساتھ حث و مباحثہ یا سوالات اور نہ شیخ اپنے سلسلہ کے طریقوں کی فلاسفی بتانے کا مکلف ہے ہاں اگر شیخ اس کو بیان فرماتے ہیں تو ان کا احاطہ و عنایت ہے۔

ذکر کے فوائد میں یہ بات ہے کہ اس سے روح میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور روح کی استعداد ہی لطائف کرانے کا مقصد ہے۔ ذکر پر مداومت متوجہ الی اللہ بنتا

صحبت بد سے پرہیز اور طہال طیب غذا 'یہی روح کی استعداد کو بڑھاتی ہے۔ جس سے روح میں شیخ کی فیوضات کے جذب کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور جب روح میں جذب کی یہ استعداد بڑھ جاتی ہے تو توجہ شیخ کو بھوک لگ جاتی ہے اور سالکین کی طرف خود خود اس طرح متوجہ ہو جاتی ہے جس طرح ایک دودھ پلانے والی ماں اگر بازار میں گھومے تو اس کے سینہ میں دودھ آ جاتا ہے۔ تو اسکو یعنی ماں کو علم ہو جاتا ہے کہ چہ کو بھوک لگی ہے۔ یہی مثال توجہ شیخ کی بھی ہے اور جب روح کو شیخ کی توجہ مل جاتی ہے تو روح کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مجلس شیخ سے مستفید ہونے کے لئے صدیاں نہیں چاہئیں بلکہ مطلوبہ شرائط کے ساتھ چند لمحے گزارنے والا شخص شیخ کی مجلس میں بے شرائط صدیوں سے رہنے والے شخص سے زیادہ حاصل کر جاتا ہے۔

اور اگر ان دو صفحات کو غور سے پڑھا جائے تو فیض شیخ میں رکاوٹ ذکر میں تیزی کیوں؟ 'ناک سے ذکر کیوں؟۔ توجہ شیخ اور استعداد جذب 'سلوک کے لوازم اخذ فیض کے حصول 'مانع فیض 'رویہ اور صحبت شیخ کے فوائد 'ذکر کا طریقہ وغیرہ اور دیگر اس قسم کے سوالات خود خود ختم ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ واضح ہو گا کہ خلاف شیخ جانا اس راہ کی بڑی رکاوٹ ہے روح میں قوت آنے کے بعد حضرت مدظلہ العالی سالک کو راہ سلوک پر چلا تے ہیں۔ جس میں کافی سارے منازل عالم خلق میں ہیں اور اس سے زیادہ منازل عالم امر میں ہیں جو روح کا اصلی مسکن ہے اور اس سے زیادہ منازل حجابات الوہیت میں ہیں۔ سلوک کے یہ تمام مقامات ہٹانے کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس پر چلنے والا شخص خود خود ان کو جان اور سمجھ جاتا ہے راہ سلوک میں اوپر جانے کو عروج اور نیچے آنے کو نزول کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ راہ سلوک میں عروج کی نسبت نزول کی اہمیت ہوتی ہے۔ کہ جتنا ایک کامل 'نام شخص کی طرح

شریعت کے مطابق زندگی گزارنا ہے وہی مرد کامل ہے اور مرد کامل کی حیثیت کا تعین اس کے نزول کے درجات سے کیا جاتا ہے۔ حضرت مدظلہ العالی کے سلوک میں مقامات سلوک کا حصول مقصود نہیں۔ بلکہ مقامات سلوک کی کیفیات کا حصول مقصود ہے۔ جو سالک اپنی عملی زندگی میں اپنا کر اپنی زندگی شریعت کے مطابق گزارتا ہے اور شریعت کے سامنے مرد و بدست زندہ ہو جاتا ہے۔ جس کا حضرت جی اپنے بیانات میں بار بار ذکر فرماتے ہیں۔ ذکر و مراقبہ و اتباع شریعت پر کچھ شرائط کے ساتھ مداومت پر ہر سالک کو توجہ کی یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔ جس کا درجہ ہر سالک کی اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس توجہ کی یکسوئی سے اس کو کچھ کیفیات نصیب ہوتی ہیں جو کشف یا وجدان کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

1- جب جسم روح کا تابع ہو جاتا ہے۔ تو دنیا میں جسم میں روح کی وہی قوت آجاتی ہے جو روح کو بد زخ میں نصیب ہوتی ہے۔ اور جسم روح کی آنکھوں سے بھی دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اسکو کشف کہتے ہیں۔

2- اور اسی طرح جب بدن روح کا تابع ہو جاتا ہے تو اب جسم بدن کے آلات سے بڑھ کر روح کے اور امکات سے کام کرتا ہے اس کو کرامت کہتے ہیں۔

3- ذکر و مراقبہ و اتباع شریعت میں استقامت کے نتیجے میں بدن میں اپنی حیات کے لئے طاقت نہیں رہتی ہے بلکہ بدن جو کچھ کرتا ہے روح کی ترقی و قوت کے لئے کرتا ہے۔ اس وقت شرح صدر نصیب ہو جاتی ہے۔ وہ چیزوں کی حقیقت جان جاتا ہے۔ اور اس پر علوم نزول شروع ہو جاتا ہے۔

بہر حال کشف و وجدان کی معلومات کو شریعت پر پیش کرنا ضروری ہے۔ موافق شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے اور خلاف شریعت کو چھوڑنا



چاہئے۔ بعض سالکین پر راہ سلوک میں چلتے ہوئے کچھ مجاہدات آتے ہیں۔ جو اس راہ کا خاصہ ہے اور ہر کسی کو اس کا سامنا اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق کرنا پڑتا ہے عام طور سے اس کا سبب متعلقہ مقامات کے لئے جن اعمال و نوافل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سالک سے بوجہ چھوٹ جاتے ہیں۔ اس کی کوپورا کرنے کے لئے اس پر مجاہدات مسلط کئے جاتے ہیں۔ جو مال پر، جان پر، یا عزت پر وارد ہوتے ہیں۔ مجاہدات سے ظہیریت گزرنے کے صرف دو طریقے ہیں کہ صبر سے صورت حال کا مقابلہ کیا جائے اور تقویٰ مدت کر اپنے اعمال کی کمی کو دور کیا جائے۔ حضرت مدظلہ العالی کے طریقہ تربیت کے خاتمے کے ساتھ ایک بات ہمیشہ مد نظر رہے کہ کوئی ایسا کام، اپنا طریقہ، ایسی سوچ نہ اپنائی جائے جو شیخ المکرم کے بتائے ہوئے طریقوں کے خلاف ہو۔ ورنہ نہ صرف موجودہ کمائی ہاتھ سے نکل جائے گی بلکہ جتنی پہلے کمائی تھی وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

عبدالودود شاہ

## تعلیمات شیخ کا خلاصہ

ضرورت و تاریخ نبوت :

انسانیت کی تاریخ واضح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانیت کی فلاح و بقا و نجات کے لئے نبوت کا ہونا نا شد ضروری ہے جو خود رب العالمین کی صفت ربوبیت کا تقاضا بھی ہے کہ ہر ضرورت مند کی ضرورت ہر جگہ ہر وقت اور ہر صورت میں پورا کرے۔ لیکن بد قسمتی سے بعض افراد اس ضرورت نبوت کا انکار کرتے ہیں اور اکثر افراد رواداری میں نبوت کی ضرورت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس تسلیم پر ان کے اپنے اعمال تک گواہ نہیں ہوتے۔

اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ میں حضرت مدظلہ العالی کی تعلیمات سے ثابت کروں کہ انسانیت کی فلاح و نجات صرف نبوت ہی سے ممکن ہے اس کے سوا کوئی اور ذریعہ ایسا نہیں کہ انسان نبوت سے مبرا ہو کر نجات حاصل کریں۔ لیکن نبوت کی ضرورت و اہمیت تب سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جب تخلیق کے عمل

و مراحل کو سمجھا جائے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو لفظ "کن" سے پیدا فرمایا اور ان تمام مخلوقات میں انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور اسے احسن تقویم کا خطاب دیا اور احسن تقویم کا خطاب مشروط تھا معرفت خداوندی کے ساتھ کیونکہ انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت و معرفت کے لئے کی تھی اب سوال یہ ہے کہ انسان کو اس وجہ معرفت کا مکلف کیوں بنایا۔ اس میں وہ کوئی خولی یا انسانی چیز تھی جس کی بنا پر یہ معرفت کا مکلف ہو اور باقی مخلوقات کو اس کا مکلف نہیں بنایا۔

اس سلسلہ میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ مخلوقات دو قسم کی ہیں ایک غیر مکلف مخلوق ہے جو اطاعت الہی کی غیر شعوری طور پر پابند ہے کیونکہ غیر مکلف مخلوق کے وجود کی بقاء اطاعت الہی میں مضمر ہے۔ جہاں ان سے اطاعت چھوٹی ہے وہیں سے ان کا وجود فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور دوسری مکلف مخلوق میں انسان جن فرشتے اور شیطان شامل ہیں۔ اب اس مکلف مخلوق میں سے انسانوں میں خصوصی طور پر ایک استعداد رکھی گئی ہے جس کو Discretionary Power کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکلف مخلوق اپنی مرضی و اختیار سے اس-Discretionary Power کو استعمال کر کے کسی بھی قسم کا عقیدہ اپنا سکتی ہے اب سوال یہ ہے کہ انسان میں اس خصوصی استعداد رکھنے کا سبب کیا تھا۔ کیوں کہ جب ہم اس خصوصی استعداد کے رکھنے کے سبب کا جائزہ لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سے چار قسم کی مخلوق مکلف ہے۔

- 1- شیطان :- جن کی تخلیق آگ سے کی گئی ہے۔ شر ہی شر ہے۔ اور ان سے خیر کا صدور محال ہے خلق شیطان کے وقت یہ "ونفخت فیہ من الروحی" کے مخاطب نہیں تھے۔

2- جن :- یہ بھی شیطانوں کی ایک قسم ہے اور آگ کی ایک خاص حدت سے ان کی تخلیق کی گئی ہے ان سے خیر و شر دونوں کی صدور ممکن ہے لیکن یہ بھی "و نکت فیہ من الروحی" کے مخاطب نہیں مگر مکلف یہ بھی ہیں ان کے ساتھ جنت کا وعدہ نہیں ہاں گناہ پر عذاب کا وعدہ ہے چونکہ یہ اس خطاب کے مخاطب نہیں تھے اس لئے ان میں بھی نبوت کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کیونکہ ان کی خصوصی تخلیقی نوعیت ہی ان کو نبوت کی ضرورتوں سے مبرا کرتی ہے۔

3- فرشتے :- ان کی تخلیق نور سے کی گئی ہے خیر ہی خیر ہیں ان سے شر کا صدور محال ہے۔ اطاعت الہی پر مجبور محض ہیں لیکن یہ "و نکت فیہ من الروحی" کے مخاطب نہیں ان کی جسمانی ساخت و تخلیقی ضروریات ان کو نبوت سے مبرا کرتی ہیں۔

4- انسان :- انسان ہی دراصل اس کائنات کا خلاصہ ہے جس کی تخلیق ایک خاص مقصد یعنی معرفت خداوندی کے لئے کی گئی اب معرفت خداوندی کے حصول کی شرائط کے مطابق ہمیں انسان کی اس استعداد کا جائزہ لینا ہو گا اور جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم انسانوں میں دو قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔

۱۔ مادی جسم ۲۔ روح جو امر رلی میں سے ہے

لیکن جب ہم جسم انسانی کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ انسانی جسم چار عناصر آگ + پانی + ہوا اور مٹی کی باہمی ترکیب استرجاعی سے بنایا گیا ہے۔ جن میں اہم جز مٹی کا ہے اور یہی مٹی یعنی ارض اسی جسم کی تمام ضرورتوں کا

مرکز ہے۔ جس جسم میں انسان کی تمام ضرورتوں کے عام عناصر رکھے گئے ہیں جس کی ان مادی ضرورتوں کے پیش نظر انسان کو ایک دماغ دیا گیا ہے جو شعوری طور پر چیزوں کو سوچتا اور سمجھتا ہے۔ جس کو کام میں لا کر مٹی سے اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ روز اول سے لے کر آج تک اور روز قیامت تک انسان کی ضرورتیں ہمیشہ ایک جیسی رہیں گی ہاں ان ضرورتوں کے ذرائع بدلنے رہیں گے۔ دماغ کو اگر تربیت اور تعلیم سے سکھایا جائے تو اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ضرورتوں کی تسکین کے علاوہ اپنے لئے سہولیات بھی ایجاد و دریافت کر سکتا ہے۔ ضروریات کی تسکین اور سہولیات کی فراہمی کے لئے انسان کا کسی مذہب یا عقیدہ کا پابند ہونا ضروری نہیں کیونکہ یہ چیزیں مذہب کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

بہر حال جب یہ چاروں عناصر انسان میں ایک خاص ترکیب و توازن سے ملے تو انسان میں مزید دو اضافی چیزیں شامل ہو گئیں۔ جس میں ایک کو نفس کہتے ہیں اور دوسرے کو روح حیوانی یا روح سفلی کہتے ہیں اور اسی شجر پر انسان میں روح حقیقی پھونکی جاتی ہے اور روح حیوانی سے اس میں حیات پیدا ہوتی ہے اور نفس جسم کی ضروریات و سہولیات کے لئے محرک کا کام دیتا ہے۔ چوں کہ نفس کی تخلیق ان مادی عناصر سے کی گئی ہے اس لئے اس کا طبعی میلان ان چاروں عناصر کے اندر ودیعت شدہ قوتوں کی طرف ہوتا ہے اور ان عناصر اربعہ کا طبعی مزاج نفس کو اپنی اپنی قوتوں کی وجہ سے، مختلف اسباب کی وجہ سے متحرک کرتا ہے چونکہ نفس مادہ ہی کی ایک لطیف صورت ہے اس لئے جسم سے لطیف ہے۔ مگر اس کا قدرتی رجحان اپنے اعمال و میلانات کی وجہ سے ہے۔ اس کے مختلف درجات مثلاً نفس لوامہ، نفس امارہ، اور نفس مطمئنہ کے نام سے متعارف ہیں اور نفس کی اپنی قوتیں صرف دو ہیں۔ قوت غضبیہ اور قوت شہوانیہ اور نفس کی ان دو اعمالی قوتوں کے درجات کو ا- افراط و- اوسط

iii۔ تفریط کہتے ہیں۔ جس میں مطلوبہ درجہ انسانیت کی اپنی دنیاوی بقا کے لئے بھی اور آخرت کی بقا کے لئے اوسط درجہ ہے۔ جس کی تمذیب ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اس کی تربیت و تمذیب نہ کی جائے تو جسم کے اپنے بنیادی اجزاء پانی، ہوا آگ اور مٹی ہیں۔ جن کے طبعی اور فطری رجحانات ہیں اور نفس کا ادھر کو متوجہ ہونا فطری ہوتا ہے۔ مثلاً آب و ہوا کا مزاج۔ ہوا و حرص 'پانی کا' پیچان و شورش 'آگ کا' غصہ و شہوت پسندی 'اور مٹی کا اپنا مزاج زلت و انکساری ہوتے ہیں جن سے نفس متاثر رہتا ہے اور وہی اعمال سرانجام دیتا ہے جو ان عناصر کا اپنا طبعی مزاج اور میکان ہے اسلئے نفس کبھی افراط کبھی تفریط کے اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لئے تمذیب نفس و جسم انسانی ضروری ہے تاکہ نفس اسی تمذیب کے مطابق جو روح سے منذب اعمال یعنی مطلوبہ درجہ اوسط کے اعمال سرانجام کروائے اور اسی تمذیب کو سکھانے سمجھانے کے لئے نبوت کی ضرورت پڑتی ہے۔

### کیونکہ

یہ جسم انسانی 'مادی اور غیر مادی اشیاء کا مرکب ہے۔ مادی اشیاء کا ذکر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس جسم کا دوسرا اہم عنصر "ونفخت فیہ من الروحی" ہے جس کی بناء پر انسان مکلف ہے یعنی اسمیں ایک ایسی چیز ڈالی گئی ہے جو متعدد تخلیق یعنی معرفت خداوندی کے حصول کی قوت و استعداد رکھتی ہے۔ لیکن مجرد روح یا مجرد جسم میں معرفت خداوندی کے حصول کی استعداد نہیں ہوتی ہے بلکہ جسم سے مل کر یا جسم کا جز ہو کر خاص اعمال 'طرز حیات اور عقیدہ اپنا کر اپنا متعدد تخلیق حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے لئے اس پیدائشی استعداد کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ روح کیا ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟ اور کون اس کی تربیت کر سکتا ہے؟

ہمارے لئے بس اتنا ہی ضروری ہے کہ روح "من امر ربی" میں سے ہے اور عالم امر سے آئی ہوئی ہے۔ من امر ربی سے ہونے کی وجہ سے صفات باری سے متعلق ہے۔ اور صفات باری کو فنا نہیں ہاں۔ صفات باری اپنی صورتیں بدلتی رہتی ہیں اس وجہ سے روح ابدی ہے اس کو فنا نہیں۔ ہاں روح اور جسم کے باہمی تعلق کے درجات سے "فنا کا لفظ عارضی طور پر بولا جاتا ہے۔ لیکن دائمی طور پر یہ جسم نہ فانی ہے اور نہ روح فانی ہے دراصل روح و جسم دونوں فانی ہیں لیکن اس دوائی سفر میں اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اب جب یہ ثابت ہوا کہ انسان دو چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک مادی جسم ہے جو عناصر اربعہ سے بنا ہے۔ جس میں غالب عنصر مٹی کا ہے اس وجہ سے جسم کی تمام مادی ضرورتوں کا مرکز بھی مٹی ہے اور ان مادی ضرورتوں کے حصول کے لئے انسان کو دماغ دیا گیا ہے کہ وہ اس کا شعوری استعمال کر کے اپنے لئے ضروریات و سہولیات مہیا کرے۔ جہاں تک جسم کے دوسرے حصے یعنی روح کا تعلق ہے جو امر ربی میں ہے اس کا تعلق عالم تخلیق سے نہیں ہے۔ بلکہ عالم امر سے ہے اس لئے روح کی سہولیات اور ضروریات دونوں کا سامان اور لوازمات عالم امر میں رکھے گئے ہیں۔ جو اللہ کی شان و رویت کو ثابت کرتی ہے۔ اس لئے روح میں جسم کے مادی دماغ کی طرح ایک قوت رکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عالم امر سے اپنا تعلق قائم کر سکتی ہے اور وہاں سے اپنی ضروریات پوری کرتی ہے اب سوال یہ ہے کہ روح عالم امر سے اپنی ضروریات کیسے پوری کر سکتی ہے اور وہ ضرورت کیا ہیں؟

دراصل روح کی اپنی غذا تعلق باللہ کے قیام میں ہے جتنا جتنا تعلق باللہ قائم ہوتا ہے۔ اتنی ہی روح کو طاقتور غذا ملتی ہے اور روح کی صحت پر قرارہ کر طاقتور ہو جاتی ہے۔ اور عالم امر کی طرف اس کا آنا جانا رہتا ہے۔ اور یہ تعلق باللہ جتنا کمزور ہو گا اتنا ہی اس کا رابطہ عالم امر سے کم ہو گا۔ اتنی ہی روح کی اپنی غذا مقدار اور کوالٹی میں

کم ہو جاتی ہے عالم امر سے روح کے تعلق کے درجات سے روح کی صحت و بیماری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عالم امر سے کم تعلق ہونے کی وجہ سے روح بیمار ہو جاتی ہے اور اس کو طبعاً نیک اعمال ایسے ہی برے لگتے ہیں جس طرح جسم بیمار ہو جاتا ہے تو اچھی بھلی غذا کڑوی و دیر لگتی ہے یہاں تک کہ عالم امر سے روح کا تعلق منقطع ہونے کی وجہ سے روح کو ایک قسم کی موت آ جاتی ہے جس پر غضب خداوندی وارد ہو جاتا ہے روح کی موت کوئی مادی چیز نہیں۔ بلکہ غضب الہی کا وارد ہونا ہی روح کی موت ہے۔ اب جب روح کا عالم امر سے رابطہ اور تعلق اتنا اہم ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کا عالم امر سے تعلق در رابطہ کون پیدا کرے گا؟ تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیا مجرد روح میں جسم کی طرح کوئی دماغی یا کوئی ایسی دیگر قوت ہے کہ اس کو کام میں لا کر عالم امر میں اپنا تعلق اس طرح قائم کریں کہ جس طرح جسم اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دماغی قوتوں کو کام میں لا کر اپنی ضروریات پورا کرتا ہے۔ لیکن مجرد روح میں ایسی قوت نہیں۔ ہاں عالم امر میں آنے جانے کی استعداد موجود ہے۔ روح اپنی اس ضرورت کے سلسلہ میں دماغ کو متحرک کرتی رہتی ہے کہ جسم کچھ ایسے اعمال اپنائے کہ اس سے اس کا عالم امر سے تعلق قائم ہو جائے اور مرنے سے بچ جائے اور انسان کے اندر کی یہی استعداد انسانوں کو نبوت کے ماننے کا مکلف بناتی ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات اپنی شان ربوبیت کے مطابق تب تک خلق کو کسی چیز کا مکلف نہیں بناتی ہے۔ جب تک اس تکلیف کے تمام ذرائع اور اسباب مہیا نہ فرمائے۔ چونکہ مجرد جسم و مجرد روح یا دونوں میں عالم امر سے براہ راست تعلق کے قیام کی استعداد نہیں پائی جاتی ہے۔

تو اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی شان ربوبیت کے مطابق انبیاء علیہ السلام کو اس ربط و تعلق کے قیام کے ذریعے اسباب و طریقوں کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور



انسانوں کے سوا دیگر مخلوقات میں انبیاء علیہ السلام کو اس لئے مبعوث نہیں فرمایا۔ کیوں کہ ان کی تخلیقی نوعیت تعلیمات نبوت سے مبرا ہیں اس لئے انبیاء کو صرف انسانوں میں مبعوث فرمایا تاکہ انسانوں میں رہ کر ان کی رہنمائی کریں۔ اور دعوت الی اللہ اور تزکیہ کے ذریعے ان کا تعلق عالم امر سے قائم کر دیں جس کے نتیجے میں انسان کو علم و حکمت نصیب ہو جاتی ہے اسلئے نبی تخلیقی طور پر نبی ہوتے ہیں۔ ان کو کسی مدرسہ، کالج، یونیورسٹی اور اکیڈمی میں نہیں بنایا جاتا ہے۔ نبی تخلیق سے لے کر ابد الابد تک نبی رہتا ہے۔ اور کسی بھی وقت اور حالت میں ان سے نبوت کی نفی نہیں کی جاتی ہے یہ اس لئے کہ نبوت وہی ہے اور ولایت کسی ہے۔ اب نبی کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کا تعلق عالم امر سے قائم کر دیں تاکہ تعلق باللہ قائم ہو جائے جس سے روح کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس لئے تعلق باللہ کا قیام تعلق بالرسول یا اتباع النبوی کی مرہون منت ہے۔ یعنی تعلق بالرسول کے بغیر تعلق باللہ کا قیام ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے پیغمبروں پر ایمان لانا عقیدے کا اہم جز ہوتا ہے اور عیسٰی اس سے قبل یا بعد کے فلاسفوں اور جدید دور کے دانشوروں کے عقائد و خیالات کی تردید ہو جاتی ہے۔ میات انسانی میں بے شمار انبیاء کرام آئے اور ہر نبی نے تعلق باللہ کے قیام کی کوشش کی۔ پھر آپ مبعوث ہوئے۔ ہر نبی کے بعد دوسرا نبی اس وقت آتا ہے۔ جب اس سے پہلے کے نبی کی تعلیمات و برکات معدوم ہو جاتی ہیں انبیاء کی ان کوششوں کا خلاصہ یہ ہے۔

1۔ بعض نبی دعوت الی اللہ کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ بنا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

2۔ بعض انبیاء خود سلطان بن گئے۔ یا کسی اور کو اپنا جانشین بنا کر دنیا سے چلے گئے۔

3- بعض انبیاء اپنی دعوت کے نتیجے میں شہید کر دیئے گئے۔

4- بعض انبیاء بغیر کسی صالح معاشرہ کے قیام کے وارد عالم ہر زخ ہوئے۔

نبوت کی یہ تاریخ جاری تھی کہ انبیاء آتے رہے اور جاتے رہے تو سب سے آخر میں اللہ نے آپ کو مبعوث فرمایا اور آپ کو خاتم نبوت کا خطاب دیا گیا۔ اب قیامت تک دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ اور یہی دین محفوظ ہو گا چونکہ دین تعلیمات و برکات کا مجموعہ ہے اور ہمارے دین کی تعلیمات ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ الفاظ کے لحاظ سے بھی اور معانی کے لحاظ سے بھی۔ تو یقیناً برکات بھی محفوظ ہوں گی اور اگر برکات محفوظ نہیں ہوں گی تو دین کی حفاظت کا الہیہ عقیدہ غلط ثابت ہو گا۔ اس لئے کہ یہ عقیدے کا ایک اہم جز ہے کہ اس دین کی تعلیمات اپنے معانی الفاظ اور برکات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اب تعلیمات دین محفوظ کرنے والے 'مفسر محدث فقہیہ وغیرہ کے نام سے مشہور ہوئے اور برکات نبوت کے محفوظ کرنے والے زاہد 'عابد' صوفی کے نام سے مشہور ہوئے اور یہی سلاسل تصوف کا بنیادی فلسفہ 'اسول' اور طریقہ ہے آپ کا طریقہ تہذیب و تربیت قرآن سے اس طرح ثابت ہے۔

## 1- تلاوت کتاب

اس سے مراد دعوت الی اللہ ہے تاکہ انسانوں کا تعلق باللہ قائم ہو جائے۔ آپ ﷺ نے دعوت الی اللہ اور تعلق باللہ کے قیام کے لئے کچھ ضروری احکامات دیئے ہیں۔ جن کو اوامر اور منہیات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوامر میں فرض 'واجب' سنت 'اور مستحب اعمال شامل ہیں۔ جب کہ منہیات میں حلال حرام مکروہ مباح شامل ہیں۔ اوامر اور منہیات کی پابندی ہی عقائد کی گواہ ہوتی ہے۔ جن کی پابندی سے تعلق باللہ قائم ہو جاتا ہے اور تعلق

• باللہ کے درجات ہی ثواب کے درجات کو گناتے اور بڑھاتے ہیں۔ ان ہی ادا امر اور منہیات کے قیام و نفاذ کے لئے آپؐ نے مدینہ میں ایک ریاست تشکیل دی جس کی حدود آپؐ کے وارد و برزخ ہونے کے تینیس سال کے اندر اندر معلوم دنیا کے تین چوتھائی حصوں پر پھیل گئی بہر حال ان افعال و اعمال کے بعد دوسرے درجہ آتا ہے۔

تزکیہ

اتباع نبویؐ اور تلامذت کے بعد آپؐ نے اپنی صحبت کے ذریعے برکات نبوتؐ کو تقسیم کیا ہے۔ آپؐ کی صحبت کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ آپؐ کی صحبت میں آنے والا ہر فرد صحابیؓ کے بلند ترین منصب پر فائز ہے جو انبیاء کے بعد کا درجہ ہے اور آپؐ کے صحابہؓ کے درجات اتنے بلند ہیں کہ آپؐ کے صحابہؓ پر ایمان لانا پرانے الہامی مذاہب میں عقیدوں کا ایک اہم جز رہا ہے۔

### 3۔ تعلیم و حکمت!

جب کسی کا تزکیہ ہو جاتا ہے جو تعلیم کتاب اور صحبت نبویؐ سے ہوتا ہے تو اس کو انعام میں علم و حکمت دی جاتی ہے۔ تب سے لے کر ابد الابد تک صحابہؓ کی علم و حکمت کی مثال نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ آپؐ نے ان پڑھوں کو عالم اور گذریوں کو جرنیل بنایا۔ جنہوں نے دنیا کی تاریخ پر ابد تک اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔ غرض آپؐ نے علم و حکمت کی ایسی نرسری لگوائی کہ جہاں سے دنیا ابد الابد تک سیراب ہوتی رہے گی۔ دنیا جتنی بھی ترقی کرے یا ترقی کرے گی، صحابہؓ کے علم و حکمت کے خزانوں سے دنیا خوش چینی کرے گی اور صحابہؓ کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگائیے کہ اگر آج کوئی ایسی صورت

حال پیدا ہو جائے جس میں کوئی صحابی زندہ ہو جائیں اور وہ فرمادیں کہ نمازیں پانچ نہیں دو ہیں تو ساری امت اپنے اپنے قبہوں کی کتابیں دفن کر دے گی اور ساری مسلم امہ اسی ایک شخص صحابی رسولؐ کی بات ماننے کی مکلف ہوگی اور یہی ان کی اصلی عظمت ہے۔

سلاسل!

آپؐ کے طرز دعوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ جس میں تعلیمات نبوتؐ ہر کوئی عالم استعداد کے ساتھ بلا شرط عقیدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور ہمیں بے شمار غیر مسلموں کے بارے میں علم ہے کہ وہ تعلیمات نبوتؐ میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ جہاں تک برکات نبوتؐ کے حصول کا تعلق ہے۔ برکات نبوتؐ کے حصول کی شرائط تصحیح عقیدہ تصحیح اعمال اور تصحیح اخلاص ہے جس کے بغیر برکات نبوتؐ کا حصول ناممکن ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپؐ کے وارد برزخ ہونے سے برکات ختم نہیں ہوئیں۔ بلکہ تعلیمات دین کی طرح باقاعدہ سند کے خاص محفوظ ہیں۔ آپؐ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ جامع کمالات نبوتؐ ہوئے۔ آپؐ کے بعد یہ برکات حضرت عمرؓ کو جامع طور پر ملیں۔ آپؐ کے بعد یہ برکات جامع طور پر حضرت عثمانؓ کو ملیں اور حضرت عثمانؓ کے بعد یہ برکات جامع طور پر حضرت علیؓ کو ملیں لیکن حضرت علیؓ کے دور میں پھر کوئی ایسا شخص نہیں رہا کہ اس بات کی استعداد رکھتا ہو کہ جامع طور پر یہ برکات وصول کر سکے۔ یعنی بحر نبوتؐ کی بحر صدقؐ سے گزر کر بحر فاروقیت سے ہو کر بحر غنا میں داخل ہو کر بحر شجاعت و علم میں جمع ہوئیں۔ بعد میں استعدادوں کی کمی کی وجہ سے یہ لہریں ندی نالیوں میں

مٹ گئیں۔ اس لئے حضرت علیؑ ہی کے زمانے میں برکاتِ نبوتؐ کے حصول کے لئے مجاہدات کی ضروری پڑی تاکہ کمالاتِ نبوتؐ کے حواصل کی استعداد پیدا ہو سکے اور ہر عالم تکمیل درجہ کے بعد حالمینِ برکات کی صحبت میں رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام سلاسل کی ابتدا حضرت علیؑ سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات اتنا چلوں کہ برکاتؐ کے حصول کے لئے یا برکاتِ نبوتؐ کے فیض دینے کے لئے تعلیم بطور شرط کبھی نہیں رہی۔ صرف طلبِ عقیدت، ادب و اطاعت کی شرائط ہیں۔ اور یہیں سے سلاسلِ تصوف سرگرم عمل ہو گئے۔ ہر سلسلے کا اپنا طرزِ تربیت ہے۔ لیکن بنیاد وہی ہے کہ ایسے مشروع طریقوں سے اپنی استعداد بڑھائی جائے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ برکاتِ نبوتؐ حاصل ہو جائیں۔ اسلئے ہر سلسلے کے اپنے اذکارِ مراقبات و مجاہدات مقرر ہیں اور ہر سلسلے کا اپنا طرزِ تربیت ہے۔ چونکہ یہ لوگ برکاتِ نبوتؐ سے سیراب تھے اور ان کو تعلیماتِ نبوتؐ کے تقاضوں کا علمی و عملی مشاہدہ نصیب ہوتا ہے جس طرح اسلامی معاشرہ کے ارتقاء کے پہلے دور ہی میں فقہی مکاتب متعارف ہوئے اور قانون کی درجہ بندی ہر لحاظ سے مکمل ہوئی بالکل اسی طرح صوفیانہ طرز کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ صوفیاء عظام کے نزدیک مسلم معاشرہ کا مذہبی وجود تعلیماتِ نبوتؐ کے ساتھ ساتھ برکاتِ نبوتؐ کا بھی مہیون منت ہے۔ بالکل اسی طرح طرزِ تصوف کی تربیت میں بھی درجہ بندی ہوئی۔ صوفیائے عظام کے نزدیک مسلم معاشرہ کی وحدانی حیثیت کو صرف اور صرف تعلیماتِ نبوتؐ اور برکاتِ نبوتؐ ہی کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے اور اسکو بھی وسعت دی جاسکتی ہے اس سلسلے میں صوفیائے

عظام نے تربیت کا وہی مزاج اور وہی طریقہ کار جاری کیا جو خود دور نبوت اور دور صحابہ کرام میں مروج تھا۔ صوفیائے عظام کی ان ہی برکات سے اب تک اسلامی معاشرہ کی وحدانی حیثیت اپنی اصل صورت پر قائم ہے۔ حکومتوں اور علاقوں میں تقسیم ہونے کے باوجود پاکستان کا مسلمان اور اندلس کا مسلمان اپنے طرز عمل میں مکمل مماثلت رکھتا ہے۔



## مرشد کامل

ایک نگاہ نفسیات اور نفسیات دانوں پر بھی !!

نحہدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن

الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میری زندگی کا جوہورت دن 'محترمہ بشریٰ اعجاز صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ تا  
کمل اجنبی مگر خط میں مذکور ایک نہایت معتبر حوالے نے اجنبیت کی دیواریں پل بھر  
میں گر کر دلوں کو محبت کی تاروں سے جوڑ دیا۔ یوں لگا جیسے ہم ایک ہی تسبیح کے  
موتی، ایک ہی دیوار کی اینٹیں اور ایک گھر کے باسی ہیں۔ جی ہاں! یہ حوالہ ہے سید  
الاستاذ شیخ المکرم حضرت امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی کا، جو ایک نگاہ سے دلوں  
کو جوڑنے کا فن جانتے ہیں جن کا حوالہ بھی نگاہ کا کام کرتا ہے۔

محترمہ حضرت کی حیات مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ایک

کتاب ترتیب دے رہی ہیں۔ حکم ہوا۔ آپ کا موضوع نفسیات ہے۔ حضرت مدظلہ العالی کے ساتھ نفسیات کے حوالے سے اپنے تجربات تحریر کر کے جلد از جلد آپ کو ارسال کروں اللہ کے کرم کا بے تحاشا احساس ہوا جس نے اس ذرہ بے توقیر کو اپنے محترم و محبوب شیخ کے بارے کچھ لکھنے کی سعادت نصیب فرمائی اس استاد کے بارے جس نے ایک ماہر نفسیات کی حقیقی علم نفسیات کی طرف راہنمائی فرمائی۔

استاد المکرم کے بارے کچھ لکھنے کی جسارت کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بات علم نفسیات کے بارے ہو جائے۔ علم نفسیات کا موضوع دراصل انسانی واقعات و کردار کا مطالعہ کر کے اس طریق زندگی کی تلاش ہے جس سے انسان معاشرے میں ایک مفید اور موثر کردار ادا کر سکے تاکہ وہاں اس کے ارد گرد کے لوگ مل جل کر سکون و اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔

بد قسمتی سے جتنے غلام نفسیات موجودہ دور میں پڑھائے جاتے ہیں وہ مغرب اور امریکہ کی ان تحقیقات کا نچوڑ ہیں جو ان کے اپنے خدایزادہ معاشروں کی مخصوص اقدار و مسائل کو سامنے رکھ کر خالصتاً غیر اسلامی ماحول میں کی گئی ہیں۔ جو معاشرہ جس بات کو درست تصور کرتا ہے اس کی تحقیقات کا رخ بھی اسی سمت مڑ جاتا ہے۔ مذہب انسان کا ذاتی مسئلہ تصور کیا جاتا ہے اور مذہب کو نفسیاتی طریقہ علاج میں استعمال کرنے سے منع کیا جاتا ہے کہ ماہر نفسیات صرف مہموں کے مہموں سے تعلق کی بات کرے مگر خالق کو درمیان میں نہ لائے کہ یہ مریض کا ذاتی مسئلہ اور معاملہ ہے۔ جو ماہرین نفسیات مذہب کی بات کرتے ہیں وہ زیادہ تر خود بھی مذہب کی بنیادی روح سے واقف نہیں ہوتے۔

علم نفسیات میں جدید ترین تحقیقات اور جدید ترین نفسیاتی طریقہ علاج کی دریافت کے باوجود ماہرین نفسیات انسانی مسائل کا موثر حل تلاش کرنے میں ناکام



رہے ہیں معاشروں کا زوال 'نفسیاتی امراض' میں روز افزوں اضافہ 'اور دن بدن بڑھتی ہوئی بے راہ روی' بے چینی اور نامعلوم خوف ماہرین و محققین نفسیات کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نفسیاتی مریضوں میں صحت یابی کا تناسب 3 سے 10 فیصد ہے۔ باقی مریض وقتی طور پر نفسیاتی علاج کے طریقوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد انہی علامات یا مختلف علامات کے ساتھ واپس نفسیاتی علاج گاہ کا رخ کرتے ہیں۔

نفسیاتی علاج میں ناکامی کا ایک سبب معاشرتی نا انصافی و نا ہمواری اور مریض کی ہسپتالوں میں صحت یابی کے بعد ایک Stressfull environment میں واپسی بھی ہے۔ معاشروں میں بے چینی کے چند بڑے اسباب جدید تحقیق کے مطابق تعلیم کی کمی 'معاشی اور معاشرتی بد حالی' ازدواجی و خاندانی جھگڑے 'نا انصافی' بد امنی 'اور یورپی اور امریکی اقوام میں دوسری قویوں کے خلاف پایا جانے والا شدید تعصب اور تشدد کے رجحانات شامل ہیں۔ مغربی معاشروں میں Individualism یعنی فرد کے ذاتی کردار اور حقوق پر زور دیا جاتا ہے۔ خاندانی زندگی کا تصور پرانے زمانے کی بات اور شخصی آزادی میں رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔

نفسیاتی علاج کرنے کے لیے ماہرین نفسیات میں چند بنیادی شخصی خصائص کا پایا جانا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ دوران تربیت ان شخصی خصائص کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے ان میں 'ذہانت' 'برجستگی' 'ہوشیاری' مریض کی بغیر کسی-Judge ment کے قبولیت یعنی (Unconditional Positive regard) 'سننے کی صلاحیت' (Listening ability) 'اعتماد حساسیت' (Sensitivity)۔

دوسروں کے دکھ کو محسوس کر سکنے کی صلاحیت (Empathy) 'مہربانداشت' نفسیاتی طریقہ ہائے علاج میں مہارت اور تحقیقی ذہن وغیرہ شامل ہیں۔

مختلف پس منظر کے لوگوں کے علاج کے لئے ماہرین نفسیات کے لئے مختلف مذاہب کے بارے چیدہ چیدہ معلومات رکھنا معاشرے کے رجحانات اور اسکے حالات پر نظر رکھنا معاشرتی مشکلات سے آگاہی ان کے حل کے لئے معاشرے میں میا مختلف سولیات کے بارے میں معلومات رکھنا شامل ہیں۔

اتنی وسیع معلومات اور کڑی تربیت کے باوجود ماہرین نفسیات خود بے چینی بے سکونی اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ یہ بے سکونی اور بے اطمینانی مسلمان ممالک کے نفسیات دانوں میں بھی پائی جاتی ہے خصوصاً تب جب نفسیات میں مغربی اور امریکی نقطہ نظر اسلامی اقدار و قوانین سے ٹکراتا ہے۔ ماہرین نفسیات کی اپنی تربیت میں مذہب کا عمل دخل نہیں ہے۔ جامعات اور ہسپتالوں میں زیادہ تر چوٹی کے ماہرین نفسیات نہ صرف مذہب کی روح سے ناواقف ہیں بلکہ اس کے نفسیات میں عمل دخل کے سخت مخالف بھی ہیں۔ وہ یورپ کے مذہب کو ذات تک محدود رکھنے کے نقطہ نظر کے شدت سے حامی ہیں۔

نفسیاتی طریقہ علاج میں شخصیت کے عقلی جذباتی اور عملی پہلوؤں پر توجہ دی جاتی ہے۔ یہ تین Schools of thought اپنے طریقہ علاج میں ایک شخصیت کے کسی ایک پہلو پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اور اسکی مدد سے دوسرے دونوں پہلوؤں کی بہتری کے لیے کام کرتے ہیں۔ مثلاً عقلی پہلو (Cognitive aspect) کے مطابق فرد کی سوچ ہر جذبے اور عمل کے پیچھے کار فرما ہوتی ہے۔ اور اسے بدلا جائے تو جذبہ اور عمل دونوں بدلے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دوسرے ماہرین نفسیات جذبات پر کام کر کے سوچ اور عمل کو اور تیسری طرح کے ماہرین نفسیات عمل کی تبدیلی کو سوچ اور جذبے کو بدلنے میں مددگار تصور کرتے ہیں۔ جدید تحقیقات اور طریقہ کار اب ان تینوں طریقوں کو ایک ساتھ استعمال کر کے انسانی

کردار کی بہتری کے لئے کوشاں ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں کئے گئے سروے کے مطابق Asians خصوصاً مسلمانوں میں ذہنی صحت کا معیار دوسری اقوام کی نسبت نامساعد حالات کا شکار ہونے کے باوجود ان سے بہتر پایا گیا ہے۔ دوسرے درجے پر وہ لوگ ہیں جو مذہب پر عمل کرتے ہیں گزشتہ دہائی میں ماہرین نفسیات کی دلچسپی مذہب اور اس کے ذہنی اور نفسیاتی طور پر مثبت اثرات کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس پر تحقیقات جاری ہیں۔ بے سکونی اور بے چینی کا شکار انسان سکون کی تلاش میں ہے اور کسی پناہ کی تلاش میں بھی۔

نفسیات کے میدان میں احقر کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جن سے بہت سے سوال ذہن میں پیدا ہوتے رہے۔

- 1- مریضوں میں صحت مند ہونے کا تناسب اتنا کم کیوں ہے؟
- 2- باوجود ایک لمبا عرصہ مریضوں کے ساتھ محنت کرنے کے اور ہر معلوم طریقے سے علاج کے باوجود مریضوں میں بہتری کا عمل رک کیوں جاتا ہے؟
- 3- اس وجود کو کیسے توڑا جاسکتا ہے؟
- 4- معاشی اور معاشرتی بے انصافیوں کے شکار مریضوں کی کس حد تک مدد کی جاسکتی ہے اور کیسے؟
- 5- مریضوں کے Relapse rates یعنی دوبارہ بیمار ہونے کے تناسب کو کس طرح کم کیا جاسکتا ہے؟
- 6- ماہرین نفسیات خود احساس عدم تحفظ بے چینی اور بے سکونی کا شکار کیوں ہیں؟
- 7- باوجود علم رکھنے کے وہ کونسی چیز ہے جو عادات کو بدلنے میں شدید مزاحمت کرتی ہے؟

8- مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے سے ہم خوفزدہ کیوں ہیں؟  
 9- نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ہمیں نفسیاتی عوارض و ذہنی امراض کیوں نظر نہیں آتے؟

10- کیا دین اسلام میں کوئی ایسی بات ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے 'باوجود مذہب کا علم رکھنے کے اور اس کی افادیت تسلیم کرنے کے اس پر عمل کیوں نہیں ہو پاتا۔

سینکڑوں سوال ذہن میں گردش کرتے رہے۔ بہت سی کانفرنسیں، تقاریر، ورکشاپس attend کیں، نفسیات کا پہلو عقلی لحاظ سے بہت متاثر کن تھا۔ مگر اس کے باوجود معاشرہ، دن بدن زوال پذیر ہے۔ معاشرہ جو افراد سے بنتا ہے۔ بے سکون افراد کی مدد کی کیا صورت ہو کہ معاشرے کو ترقی اور بہتری کی راہ پر ڈالا جاسکے۔ قرآن حکیم کے ترجمے کو پڑھنا شروع کیا تاکہ دیکھ سکوں کہ دین اسلام اس کا کیا حل پیش کرتا ہے پڑھنے سے یہ تو یقین ہو رہا تھا کہ جواب اس میں ہی ہیں مگر جواب کے مختلف حصے علیحدہ علیحدہ رہے۔ Links بن پائے۔ دماغ نے اسکی حقانیت تسلیم کی، مگر عملی زندگی میں عمل ندارد۔ اس صورت حال میں صحیح سمت میں رہنمائی کی طلب اور بے چینی رب جلیل کے درپری مئی۔

حمد للہ اللہ نے رہنمائی فرمائی اور آخر کار شعبہ کلیکی نفسیات نے مذہب اور ذہنی صحت کے موضوع پر چند لیکچرز کا اہتمام کیا۔ محترم جناب کرمل مطلوب حسین صاحب اور قبلہ آفتاب اقبال صاحب کے یکے بعد دیگرے ایک ماہ کے دورانیے میں 4 لیکچرز ہوئے۔ بتایا گیا کہ قرآن حکیم سکون قلب کا جو نسخہ تجویز کرتا ہے وہ اللہ کا ذکر ہے اور یہی نفسیاتی امراض کا شافی علاج بھی ہے ذکر سے اللہ سے محبت پیدا ہوتی ہے اور جس سے محبت کی جائے اس کی بات ماننے کو جی چاہتا ہے۔ خالق کائنات

اللہ تعالیٰ کو ہم تسلیم کرتے ہیں مگر اسکے بتائے ہوئے اصول و ضوابط کے تحت یعنی قرآن و سنت 'شریعت مطہرہ کے تحت زندگی نہیں گزارتے۔ کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے سے محبت الہی پیدا ہوتی ہے اور اللہ پر یقین پختہ ہوتا ہے یہ یقین اور محبت مل کر عمل میں آسانی پیدا کرتے ہیں یوں جب خالق کائنات کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق حقوق و فرائض کی ادائیگی ہوتی ہے تو بہتر انسان اور بہتر معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس میں ہر شخص دوسرے کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور ایک مضبوط معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جب سب کو ان کے حقوق ملتے ہیں تو سب چین و سکون سے زندگی گزار سکتے ہیں اور نفسیاتی امراض حملہ آور نہیں ہو پاتے۔

نفسیاتی طریقہ علاج میں 'میں بے شمار قسم کی Relaxation Exercises آزما چکی تھی۔ سوچا یہ بات تو دل کو لگتی ہے اسے بھی آزما دیکھنا چاہیے۔ اللہ کے کرم سے ذکر اللہ شروع کیا۔ پہلے سے حیرت انگیز طور پر بے تحاشا سکون محسوس ہوا۔ پھر دنوں میں اپنی ذات کی کوتاہیاں اور خامیاں کھل کر سامنے آئیں۔ اپنے گناہوں کا شدید احساس ہونے لگا کیسے اور کس طرح کی زندگی گزار دی دل کا حال خراب ہونے لگا سوچا یہ سب 'سالوں کی نفسیات کے ساتھ وابستگی کے دوران کیوں نظر نہیں آیا۔ آخری لیکچر حضرت مدظلہ العالی کا تھا۔ اس لیکچر کے صرف 10 منٹ میسر آ سکے۔ لیکچر کے چند آخری جملے سننے کو مل سکے اور پھر سوال و جواب شروع ہو گئے۔

جیسے پہلے عرض کیا کہ اپنے سوالوں کے جواب کی مستاشی تھی اور مختلف لوگوں سے رابطہ کر چکی تھی ایک مشہور عالم دین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی انہوں نے فرمایا وہ عورتوں سے نہیں ملتے۔ دل کی تڑپ زیادہ ہو گئی۔ پھر کہاں جاؤں کس سے



جسٹس خٹام محمد و مرزا بریگیڈیئر اکرم اور راجہ منور DSP کے ہمراہ شکار پر ہے۔



حضرت ملک اکرم اعوان، منیر نیازی اور دیگر احباب کے ساتھ

پوچھوں۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھا مولانا مرد تو دین کا علم حاصل کرنے کے لیے باہر جاسکتے ہیں تلاش کر سکتے ہیں خواتین کیا کریں۔ فرمانے لگے خواتین مرد حضرات سے سرخی پاؤر کی فرمائش کر سکتی ہیں دین سیکھنے کی کیوں نہیں کر سکتیں۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ جہاں یہ Facility نہ ہو کیا کریں؟ مگر پیکچر ختم ہو چکا تھا۔ سوال دل میں رہ گیا اور مولانا تشریف لے جانے لگے۔ میں تیزی سے پیچھے لپکی شاید بات کرنے کا موقع مل جائے پوچھوں۔ آپ سکھادیں گے مجھے؟ مگر موقع نہ مل پایا۔ ان چند لمحات میں اعتبار کا ایسا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ مجھے دل میں جیسے یقین ہو گیا کہ میرے سوالوں کے جواب وہیں سے ملیں گے۔

اللہ نے اپنے خاص کرم سے وسیلہ بنایا اور حضرت سے ملاقات کا بارہا شرف حاصل ہوا۔ کئی مرتبہ آپ کیساتھ ذکر نصیب ہوا۔ کئی پیکچر سننے کا موقع ملا۔ آپ کے انکارِ عالیہ میری آنکھیں کھول رہے تھے اور نگاہیں اور دل۔ اپنی گزشتہ زندگی خوف پیدا کر رہی تھی ساری زندگی گناہوں میں ضائع کر دی۔ کیا حشر ہو گا؟ جواب آیا باقی زندگی جس لمحے درست کرنے کا عہد کر لیں وہ غفور الرحیم ہے معاف فرمادیتا ہے۔ مگر پتہ کیسے چلے معافی مل گئی؟ فرمایا۔ زندگی کا سفر گناہ سے نیکی کی طرف ہو جائے اور زندگی میں سکون آجائے تو سمجھ لو رحمت باری نے بڑھ کر تمام لیا۔

الحمد للہ۔ اللہ کی رحمت کا احساس ہونے لگا۔ خوف کی جگہ سکون آنے لگا اور شک کی جگہ یقین نے لے لی۔ زندگی میں تیزی سی آنے لگی۔ قرآن حکیم پڑھنے کو نہ صرف دل چاہنے لگا بلکہ سمجھ آنے لگا۔ کڑیوں سے کڑیاں ملنے لگیں اپنے اندر ایک الارم سسٹم محسوس کیا جو ہر وقت گناہوں سے Warn کرتا ہے۔ اپنے اندر اعتماد محسوس ہونے لگا۔ دل میں خوشی آنے لگی۔ زندگی خوبصورت ہو گئی لوگوں کی پردہ کے بغیر رب کریم نے درست فیصلوں کی توفیق دی۔ غلط کاموں سے انکار کر

دیا۔ بہت ناراضگیاں ہوئیں مگر مجھے نہ صرف خوشگوار حیرت ہوئی بلکہ بہت اعتماد محسوس ہوا جب میں نے کسی فرد کے ذرے اپنے درست فیصلے تبدیل نہیں کئے۔ نہ لوگوں سے نفرت اور دوری کا رویہ اپنایا۔

چند ہی دنوں میں آپس میں اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ اور بے تحاشا تجربات ہوئے۔ اللہ کریم نے اپنے خاص کرم سے مشاہدات سے نوازا۔ مجھے ذرہ بے وقعت کو اپنے حبیب ﷺ کی زیارت سے مشرف بار کیا۔ اس در سے آشنا فرمادیا۔ اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کے اس حبیب غلام کے قدموں میں حاضری کے طفیل جتنا عطا کیا ان قدموں کی خاک سے جتنا پایا اس کے قابل نہ کبھی تھی اور نہ ہوں اور نہ کبھی ہو پاؤں گی۔ جتنے تجربات ہوئے۔ نہایت عجیب تھے مگر ہر تجربہ ہر احساس یقین اور اعتماد میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ جہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا کہ زندگی میں اب کیا تبدیلی لاؤں؟ کیوں؟ کیسے؟ محسوس ہوتا کائنات کے ہر ذرے کو زبان مل گئی ہو، درخت کا ہر پتہ، پھول کی ہر پتھری۔ کتاب کا ہر ورق۔ لوگوں کا لفظ لفظ کائنات کی ہر حرکت۔ دل کی ہر دھڑکن کو یا پیغام دیتی محسوس ہوئی۔ یہ تبدیلی لاؤ۔ اس لئے۔ ایسے۔ ہر سوال کا جواب ملنے لگا۔ قرآن حکیم پڑھنا شروع تو بہت عرصے سے کیا تھا مگر اب سمجھ آنے لگا۔ لگتا تھا روزانہ کے سبق میں اللہ رب العزت زندگی گزارنے کا طریقہ خود تعلیم فرما رہے ہیں ایک طلب پیدا ہو گئی میں کون ہوں؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مجھے زندگی کیسے گزارنا ہے۔ جواب ڈھونڈنے لگی اور جواب ملنے لگے ہر جواب تیزی سے آس پاس سے ہی مل جاتا۔

نفسیات کی انہیں کتابوں سے جو پڑھا تھا۔ دوبارہ پڑھا تو نئے نکات سامنے آنے لگے جو پہلے کبھی سمجھ نہ آئے تھے۔ کام اور وقت میں رکت ہونے لگی۔ دل میں اتنی خوشی محسوس ہوئی دل چاہا ہر شخص اس سکون اور خوشی کو حاصل کر لے۔ حمد للہ۔



اللہ نے لوگوں تک اپنا نام پہنچانے کی توفیق دی ان کا بھی یہی حال پایا۔ چند دنوں کے اندر ان کی حالت میں خوشگوار تبدیلی آنے لگی۔

نفسیاتی مرینوں کو دوسری قسم کی Relaxation Exercises کرنے کے جائے اللہ کا نام بتانا شروع کیا۔ ماہرین نفسیات خود کشی پر مائل مرینوں کو فوراً ہسپتال کے دماغی امراض کے شعبے میں بھیجتے ہیں تاکہ اس کو دوا دی جاسکے اور Under Observation رکھا جاسکے کہ وہ خود کشی کی کوشش نہ کر سکے اور اس کا موڈ بہتر کیا جاسکے۔ ان مرینوں کے علاج کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

ایک بہت شدید ڈیپریشن کی شکار مرینہ نے جو خود کشی پر مائل تھی۔ مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت میں Ph. D کے لئے لندن آنے کی تیاری میں مصروف تھی اور کوئی ایسا نیا مرینہ نہیں لے رہی تھی جس کا علاج لمبا ہو۔ تاکہ میرے جانے کے بعد اسے نئے سرے سے کسی دوسرے therapist کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں مشکل نہ ہو۔ میں نے اسے کسی دوسرے سائیکولوجسٹ کے پاس بھیجنا چاہا اس نے انکار کر دیا۔ سو چا اللہ کا نام لے کر شروع کرتے ہیں۔ اور دوران سیشن اسے Convince کرنے کی کوشش کروں گی کہ کسی اور کے پاس چلی جائے۔ بہت بہتر لوگ موجود ہیں۔ پہلے Session میں اس کو ذکر اللہ بتایا اور اللہ کی رحمت پر بھروسہ کو کہا۔ اسے کہا صبح شام ذکر کرو۔ ہو سکے تو دن میں زیادہ بار کر لو۔ 12 دن کے اندر 6- ذکر اللہ کے Session ہوئے اور اس کے بعد اس کے ڈیپریشن کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی -ہیلیاں اس کے آس پاس کے لوگ اسکی شخصیت کی خوشگوار تبدیلی سے حیران تھے۔ جو کل تک سب کے لئے درد سر تھی آج انہی کو سکون کا نسخہ بتا رہی تھی 'سبحان اللہ' 'کل یوم حونی شان'۔ ساتھی ماہرین نفسیات

نے اس قدر تیزی سے تبدیلی کو ناممکن قرار دیا اور اسے مریض کی مٹاؤٹ قرار دیا تاکہ Therapist کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

اگر ایسا ہوتا تو دوسرے لوگ اس کی شخصیت کی تبدیلی کو نوٹ نہ کرتے اور مجھے وہ خود کہہ چکی تھی کہ اسے اب میری ضرورت نہیں ہے اللہ کا ساتھ اسے محسوس ہوتا ہے اور اللہ ہی اسے کافی ہے۔ 4- برس کے بعد اب بھی ماشاء اللہ وہ متحرک اور فعال ہے اور اللہ کا نام آگے پہنچانے میں مصروف ہے۔

دوسری مریضہ بھی شدید ڈیپریشن کا شکار تھی کہ کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی تھی یہ میڈیکل کی ایک ذہین طالبہ تھی۔ اس نے نہ صرف میڈیکل کالج جو ان کیا بلکہ انتہائی محنت سے اپنی کلاس میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ آج بھی اپنی فیملی کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے خوش باش ہے۔ نفسیات کی دنیا میں اس بیماری کی شدت میں اتنی Speedy recovery کی مثال نہیں ملتی۔ جبکہ صحت یاب افراد دوبارہ بھی اس مرض یا کسی اور نفسیاتی مرض کا شکار نہ ہوئے ہوں۔ یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ دونوں مریضوں کو دوران مرض اساتذہ کے ساتھ ذکر کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کی اہمیت آپ پر مضمون کے باقی متن میں واضح ہو جائے گی۔

اس روحانی طریقہ علاج میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ قرآن حکیم میں ذکر اللہ کا بے سکونی کی دوا ہونا پڑھا تو تھا مگر اس تبدیلی کا تجربہ اپنی اور اپنے مریضوں کی ذات میں اس قدر تیز اور خوبصورت تھا کہ شدید تجسس اور لگن پیدا ہوئی کہ دیکھا جائے کہ یہ کیسے کام کرتا ہے؟ اہل اللہ اس خوبصورت سائنس سے کیسے کام لیتے ہیں؟ بارہا ایسا ہوا تھا کہ میں اپنے سوال یا مسئلہ دل میں لے کر جاتی تھی اور بغیر پوچھے Exactly مجھے اس کا جواب مل جاتا تھا۔ روحانی معالج کی تشخیص کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟ اس قدر مختصر الفاظ میں اور بعض مرتبہ صرف خاموشی سے صرف

نگاہ کے اثر سے 'صحت کے اثر سے اس قدر تیز تبدیلی کیسے آتی ہے؟ بغیر کچھ مٹائے  
 ذہن اللہ مسئلے سے کس طرح آگاہ ہو جاتے ہیں۔ بغیر کچھ کئے علاج کیسے کر دیتے  
 ہیں؟ شخصیت کی خوبصورت تعمیر کا یہ کون سا انداز ہے؟

اگر مجھے خود ذاتی طور پر یہ تجربات نہ ہوئے ہوتے تو شاید میں اس کو ادوروں کی  
 طرح تو ہم پرستی سمجھتی، مگر اپنے تجربے کو جھٹانا ممکن نہ تھا۔

حضرت میں 'میں نے روایتی پیروں والی کوئی بات نہ دیکھی' طبیعت انتہائی سادہ،  
 نہ اونچی مندیں، نہ کرد فر، کھراپن طبیعت کا خاصہ، میں نے انہیں دین و دنیا کی  
 بہترین تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتے پایا، چاہتے ہیں لوگ دین کے اصولوں پر سختی  
 سے عمل کریں اور بہترین دنیاوی تعلیم بھی حاصل کریں۔

مجھے دو سال پہلے P.H.D کے لئے سکا ر شپ مل چکا تھا۔ امریکہ میں داخلہ  
 ہوا مگر ویزہ نہیں ملا۔ دو سال میں 'میں نے خود زیادہ کوشش نہیں کی۔ میں خوفزدہ  
 تھی کہ کیس وہاں جا کر اسی معاشرے کا رنگ قبول نہ کر لوں۔ اپنے اوپر ذرا اعتماد اس  
 بارے محسوس نہ ہوتا تھا اللہ کے ذکر نے بہت اعتماد دیا، اللہ کی معیت کا احساس  
 ہونے لگا تھا۔ خوف آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا مگر اب بھی فیصلے کی ہمت نہ  
 پڑی۔ حضرت سے ضمانت کر کیا تو آپ نے فرمایا ضرور کرو P.H.D ضرور جاؤ یہ تو  
 بہت اچھی بات ہے۔ امریکہ کا ویزہ نہیں ملا، طانیہ میں کر لو۔ حضرت کے کہنے میں  
 ایسی بات تھی۔ دل مائل ہوتا چلا گیا۔ اللہ پر بھروسہ کر کے apply کیا۔ اللہ کے  
 کرم 'حضرت کی دعا سے فوراً داخلہ ہو گیا۔

اسی اثناء میں رسول کریم کی زیارت سے مشرف بار ہوئی۔ محسوس ہوا 'حکم ہوا  
 ہے ذکر پر تحقیق کرو۔ حضرت سے عرض گزار ہوئی۔ آپ نے فرمایا "آپ کا  
 موضوع نفسیات ہے ذکر کے "انسانی نفسیات" دماغ اور سوچ پر اثرات" کا اپنے

شاگردوں میں مطالعہ کر کے یکجا کریں۔

”یہ سب کیسے ہوگا؟ اس کا زیادہ اندازہ نہ تھا“

بہر حال P.H.D کے لئے برطانیہ آگئی۔ خود پر مغربی معاشرے کا رنگ چڑھ جانے کا کچھ خوف محسوس ہوتا تھا۔ حضرت کو خط لکھا۔ آپ نے تفصیلی جواب عنایت فرمایا۔ فرمایا ”بیٹے آپ اعتماد سے رہیے۔ آپ کو وہاں ڈرنے کی ضرورت نہیں، سب کمزوریاں انسان کے اندر ہوتی ہیں۔ باہر سے کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ اچھے لوگ وہاں بھی ہیں انہیں اچھے ساتھ اور خلوص کے ساتھ راہ ہٹانے والوں کی ضرورت ہے۔

خط پڑھ کر بہت حوصلہ بڑھا۔ اللہ پر اعتماد اس کے ساتھ پر یقین اصل بات ہے۔ خوف انسان کے اندر کی کمزوری ہے۔ گویا اعتماد کی کمی خوف کا باعث ہے دوسرے لوگ یا معاشرتی اثرات نہیں۔ ساتھ ہی فرمادیا کہ مجھے ایک اچھا ساتھ بنا ہے اور خلوص کے ساتھ اللہ کا پیغام پہنچانا ہے بے شک بظاہر کیسے لوگ ہوں ہر شخص کو اس گندے معاشرے سے نکلنے کے لیے Support کی ضرورت ہے۔ ان کے اندر تڑپ اور اچھائی کا راستہ معلوم کرنے کی خواہش موجود ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایک اچھا اور مضبوط ساتھ مہیا کریں۔ ایک با عمل اور با کردار زندگی گزارنے کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ ساتھ ہی رابطہ بذریعہ خطوط کی ہدایت بھی فرمادی۔

آج اپنی تحقیق کے آخری مرحلے پر آکر مجھے پتہ چلا کہ حضرت مدظلہ العالی میرے محترم و شفیق استاد نے اس وقت میری تحقیق کے رزلٹ ہی مجھ سے بیان فرما دیئے تھے آپ نے کس خوبی سے انسان کی شخصیت، معاشرے کے اثر اور اس کی بہتری کے بہترین نکات ارشاد فرمادیئے ہیں۔

اعتماد اور خوف کے اس تعلق کو جدید ترین تحقیقات ثابت کر رہی ہیں۔ میری اپنی تحقیق کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ شخصیت میں اعتماد کا فقدان خوف پیدا کرتا ہے۔ ایک پر خلوص اور اچھا ساتھی اس خوف سے نکلنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے یعنی معاشرے میں Social Support کی quality دوسرے مشکل میں گھرے انسانوں کے لیے خوف سے نکلنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اور اس طرح ایک خوبصورت معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

شخصیت میں اعتماد اللہ پر بھروسے پر منحصر ہے۔ زندگی میں واضح مقاصد ان لوگوں کے ساتھ رابطہ جو کہ سیدھا راستہ بنا سکتے ہیں۔ (گویا سیدھا راستہ اور سیدھا راستہ بنانے والوں کی 'دونوں کی اپنی اہمیت ہے) اور خلوص کے ساتھ بنا سکتے ہیں انسان کو زندگی کی مشکلات سے اور اپنی ذمہ داریوں سے اصول و ضوابط کے تحت عہدہ براء ہونے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے دوسری طرف خلوص سے راہ بنانے والے کو اچھا ساتھی قرار دیا۔ گویا بے خوف اور پر اعتماد شخص ایک ایسی مضبوط شخصیت کا حامل ہوتا ہے جو ایک اچھا ساتھ اور مضبوط سارا سمیا کر سکتا ہے دوسروں کو خوف سے نکلنے کی راہ دکھا سکتا ہے۔ اعتماد کا فقدان خوف کا باعث ہے اور خوفزدہ شخص اندر سے کمزور ہوتا ہے۔

ان دونوں طرح کی شخصیات کو قرآن حکیم شجرۃ طیبہ اور شجرۃ خبیثہ کی مثال سے واضح فرماتا ہے۔

شجرۃ طیبہ :- وہ درخت جس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی ہیں۔ تناسل و حاد اور مضبوط اور شاخیں گہنی ہوتی ہیں۔ ایک مضبوط شخصیت کے حامل شخص کی 'زندگی بنیادی اصولوں (Fundamental Principles) پر استوار ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔ جس طرح ایک مضبوط گھنا درخت سایہ

میا کرتا ہے تنے سے ٹیک لگا سکتے ہیں۔ شاخوں پر گھرنا سکتے ہیں دھوپ اور بارش سے پناہ لے سکتے ہیں پھل کھا سکتے ہیں غرض بے تحاشا فوائد ہیں۔ اس کے برعکس، شجرہ خبیثہ :- جس کی جڑیں زمین میں گہری نہیں ہوتیں۔ جیسے گھاس، ہر کوئی اس پر سے گزر جاتا ہے۔ ذرا سی حالات کی سختی اور حادثہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ جو خود کمزور ہوں دوسروں کو سارا نہیں دے سکتے۔

(ضمنی عرض کرتی چلوں ماہر نفسیات کی دوران تربیت اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرے اور شخصیت کا اعتماد اور خلوص Develop کیا جائے تاکہ مریضوں کی مدد اچھے طریقے سے کی جائے):

حضرت دامت برکاتہم کے یہ چند سادہ جملے نفسیات کی دنیا کی اہم حقیقتیں کھول رہے ہیں۔ اب سوال اس سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ نفسیاتی مریضوں میں High Re-lapse rate کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کیا یہ ماہرین نفسیات کی اپنی ذات کی اصلاح کی طرف اشارہ کرتا محسوس نہیں ہوتا کہ نفسیات دانوں کو اپنی شخصیت مضبوط بنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ دوسروں کی مدد کر سکیں اور ایک مفید معاشرے کی تکمیل میں اپنا مفید کردار ادا کر سکیں۔

نفسیاتی مریضوں کی صحت یابی کا یہ انتہائی کم تناسب ایک اور طرف بھی اشارہ کر رہا ہے وہ یہ کہ موجودہ نفسیات زندگی کے جن اصول و ضوابط کو Advocate کر رہا ہے اسکی جڑیں انسانی زندگی میں گہری نہیں ہیں جو انسان کو ایک مضبوط شخصیت کا حامل شخص بنا سکیں۔ وہ کون سے اصول و ضوابط اور حقوق و فرائض کا کون سا نظام ہے جس کی جڑیں گہری ہیں اور اس کو اپنا کر ہی معاشرے کو مضبوط شخصیت کے حامل افراد میا کئے جاسکتے ہیں؟ ایک مضبوط نظام صرف ایک مضبوط ہستی ہی دے سکتی ہے اور وہ ذات پاک جس نے اس کائنات کا نظام اس قدر مربوط و مضبوط بنایا ہے کہ ایک

لبے عرصے سے اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہی انسانی زندگی کے اصول و ضوابط (اس کائنات کا ایک حصہ ہوتے ہوئے) اس کو درست وضع دے سکتے ہیں اور اس مضبوط ہستی کا ساتھ ہی انسانوں کو مضبوطی مہیا کرتا ہے کہ وہ اس راہ پر چل سکیں۔ انسانوں کو اس مضبوط و کامل ہستی کی ضرورت ہے۔ اور اللہ رب العزت اس کائنات کا خالق و مالک ہی وہ ذات پاک ہے جس کا ساتھ انسانوں کو مضبوط سہارا مہیا کرتا ہے۔ بنیادی حقوق و فرائض کا نظام جو اس ذات پاک نے اس عظیم ہستی کو دے کر بھیجا جس کا تعلق اسکی ذات سے سب سے زیادہ مضبوط ہے یعنی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کی تعلیمات پر عمل کر کے ہی ایک مضبوط معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے۔

اس کی مثال ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی ایک ایسے معاشرے میں ملتی ہے جس کا ہر فرد دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے۔ خیر خواہی کرتا ہے۔ ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثالیں قائم کرتا ہے۔ ”مومن و کافر کے حقوق کا یکساں خیال رکھتا ہے۔ پھر مسلمانوں کے زوال کو دیکھیں تو زندگیاں اس لائحہ عمل سے جو آپ کا بتایا ہوا ہے، ہٹتی نظر آتی ہیں اور بے سکونی، بے چینی، ڈپریشن اور ذہنی بیماریاں بڑھتی نظر آتی ہیں۔

جو ہٹ کر چلیں تیری راہوں سے آقا

مقدر میں ان کے ہے واپسی تباہی

اور وہ لوگ جو ہر دور میں اسی راستے کے مسافر رہے۔ انتہائی نامساعد حالات میں انسانیت کو اس پستی سے نکالنے کا باعث بنے جو اس راستے سے ہٹنے والوں کا مقدر بن جاتی ہے۔

دسمبر ۱۹۹۵ء میں حضرت کے دورہ طانیہ کے دوران مجھے بہت قریب سے

سے حضرت کو دیکھنے کا موقع ملا میں نے انھیں بے حد شفیق پایا۔ پڑھائی کی بات پوچھا، حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور پڑھنے کا ایک بہترین نسخہ بھی عطا فرمایا جس سے مجھے تنقیدی زاویہ نگاہ سے لےزچر کو پڑھنے میں مدد ملی۔ فرمایا ایک مرتبہ کہانی کی طرح پڑھ جاؤ اور دوبارہ اسے اچھی طرح پڑھو۔ تعلیمی نفسیات کے ماہرین اس طریقے سے فوٹی واقف ہوں گے۔ اپنی Definition درست کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔ اس ایک بات نے زندگی کے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ ایمان و یقین سے لے کر معاملات، مشکلات، تحقیق ہر جگہ یہ بات جیادی حیثیت کی حامل پائی۔ یعنی ہر چیز 'زندگی کے ہر aspect کو درست زاویہ نگاہ سے دیکھنا اور حقیقت کو جاننا ایک کامیاب اور بدمسرت زندگی کی ضامن ہے۔

زندگی میں جب کبھی کسی مشکل وقت میں گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار ہوئی۔ اسکی بنیادی وجہ کوئی نہ کوئی غلط فہمی۔ Misjudgement تھی۔ بہت سی باتیں جو معاشرے سے سیکھیں تھیں ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اچھی بات پر عمل کرنا اس لیے مشکل تھا کہ اس معاشرے کے رسوم و رواج نے مشکل بنا دیا تھا۔ مگر جب حقیقت میں احکامات کا مطالعہ کیا تو وہ سادہ اور آسان پائے۔ کسی بھی شے کی حقیقت انسان درست طور پر سمجھ لے تو انسان کی زندگی سے شک نکل جاتا ہے۔ اس علم کا ہونا ایمان میں زیادتی کا باعث ہوتا ہے اور شک ایمان و یقین کے منافی ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیقات کے مطابق نفسیاتی امراض کی جڑ شک ہے۔ شک انسان میں تشویش 'anxiety' Depression اور دیگر امراض کا باعث ہوتا ہے۔ شک سے انسان کی قوت فیصلہ متاثر ہوتی ہے۔ جو شخصیت میں کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ قوت فیصلہ کے فقدان کی وجہ سے ذہنی پریشانی پیدا ہوتی ہے اور خود اعتمادی پر زور پڑتی ہے اپنے فیصلوں کے لیے وہ دوسروں کی طرف دیکھتا ہے۔ اپنی منزل کی



طرف بڑھنے سے جھجھکتا ہے۔ دوسروں میں اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور معاشرے پر ایک بوجھ بن جاتا ہے، 'آہستہ آہستہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ پھر ذرا سی مشکل اس کمزور شخصیت کو ڈھانے کے لئے کافی ہوتی ہے ہر چیز کو اس کے تناظر میں دیکھنا اس چیز کا زندگی کے باقی شعبوں سے اس کا تعلق واضح کر دیتا ہے اور ایک صحیح سوچ صحیح عمل اور مضبوط تعلق کی اساس ہے۔ گویا اللہ اور اس کے بندوں سے درست اور مضبوط تعلق کی بنیاد خود تعلق کی definition پر منحصر ہے۔ انسان جس طرح زندگی کو Define کرتا ہے ویسی ہی زندگی گزارتا ہے۔ اس بات سے علم کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

اب میں نے حضرت کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ ان کا بات چیت کا انداز 'لوگوں سے میل جول' معمولات محسوسات وغیرہ۔ بیسیوں لوگ ملنے آرہے ہیں 'ہر کوئی مسئلہ' پریشانی لے کر آتا ہے بلا کا تخیل ہے۔ نہ پیشانی پر بل 'نہ چہرے کی بیاشامت اور لہجے کی تازگی میں کوئی کمی دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لئے اپنے آرام کی قربانی۔ دوسروں کو بغیر Judgement کے قبول کرتے ہیں کسی آنے والے کو مایوس نہیں لواتے۔

مرض پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اعتماد اس درجہ کا کہ کسی کی دولت یا Status سے متاثر ہوئے بغیر سچی اور کھری بات کہتے ہیں۔ ہر ایک کا حوصلہ بڑھاتے محبت اور شفقت کے موتی لٹاتے انتہائی خلوص سے مشورہ دیتے ہیں۔ Organization اور ڈسپلن انتہائی درجہ کا۔ اوقات مقررہ کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ ہر قسم کی شدید مصروفیت اور شدت کی بیماری کے باوجود کسی قسم کی شکایت نہیں کرتے نہ تحمکن کا اظہار کرتے ہیں۔

انتہائی جامع اور مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر نہایت قوت سے بیان کر دیتے

ہیں دوسروں کی عزت نفس کا استدر خیال رکھتے ہیں کہ تکلیف پہنچنے کے باوجود شرمندہ نہیں کرتے درگزر کرتے اور احسان کرتے ہیں۔ علم کا ایسا اثناء سمندر کہ لوگوں کی سمجھ کے مطابق ان سے کلام کرتے ہیں اور انھیں کے شعبے کی مثال دیتے نظر آتے ہیں ہر خلوص سے آنے والا مختصر مدت میں حضرت کے حسن اخلاق کا مداح اور آپ کی شخصیت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف حضرت کا گرویدہ ہوتا ہے بلکہ حضرت کے پاس آنے والے ایک دوسرے کا نام پتہ جانے بغیر ایک دوسرے کے لیے مجسم ایثار و قربانی، سراپا محبت اور بہترین خیر خواہ بن جاتے ہیں خلوص سے کسی گئی چھوٹی سی بات کی انتہائی قدر کرتے ہیں۔ علم کی قدر اور رائے کا احترام کرتے ہیں بہت سے اور پہلو ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔

علم نفسیات کا بھی یہی مقصد ہے کہ انسان جو معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی درجہ کے مفید انسان ہوں Psychological Theories ایسے انسانوں کی بات تو کرتی ہیں مگر Therapy سے ایسا ہوا تو نہیں کہ اس اعلیٰ درجے کی خصوصیات دیکھنے میں یا پڑھنے میں آئی ہوں مگر حضرت کی صحبت سے جلدی تبدیلی کیسے آتی ہے؟ کیا عوامل کار فرما ہیں؟

سوال ابھرتے چلے گئے۔ دل نے کہا یہی اصل نفسیات ہے۔ مگر یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ کیسے حضرت کے پاس آنے والے اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ ایسا کیسے ہوتا ہے کہ جو سوال میرے ذہن میں ہوتے ہیں بغیر پوچھے حضرت اس کا جواب ارشاد فرما دیتے ہیں۔ حضرت کی چند لمحوں کی صحبت، چند لمحوں کی گفتگو کیسے مجھ میں جلی بھر دیتی ہے جو کام بہت مشکل لگ رہا ہوتا ہے آسان لگنے لگتا ہے کیسے ان کی بات ماننے میں ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے؟ کیسے اپنے مسائل لکھ کر خط پوسٹ کرتی ہوں تو جواب آنے سے پہلے جواب مل جاتا ہے جس کی تصدیق بعد میں آپ کے خط سے

ہو جاتی ہے۔ سوالات کی بھرمار تھی۔ جو اب آیا آپ علم نفسیات کی Definition ٹھیک کریں منصب رسالت آپ کو علم نفسیات کی تعریف اور ماہر نفسیات کا کام بتاتا ہے۔ ”منصب رسالت یہ ہے کہ وہ مدے کو اللہ سے آشنائی دے اور مدے کو مدوں کے ساتھ رہنے کا سلیقہ سکھائے۔ نبی اکرمؐ نے عقیدہ عبادات بھی عطا فرمائیں اور حقوق و فرائض کا وہ لازوال نظام بھی عطا فرمایا جس نے ثابت کر دیا کہ اگر دنیا میں کسی خدا کے منکر کا یا کافر کو بھی جان و مال و آبرو کا تحفظ نصیب ہوا تو اس نظام کے زیر نگین آکر ہوا۔“

گویا منصب نبوت اللہ سے اوگوں کو آشنا کر کے ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں مدوں کو مدوں کے باہمی حقوق و فرائض کا علم ہو اور اسے معاشرے پر لاگو کیا جائے تاکہ ہر فرد بھر سکون و اطمینان سے باہمی یگانگت کے جذبے کے تحت زندگی گزار سکے۔

”دنیا میں صرف حقوق و فرائض کی پہچان ہی کافی نہیں بلکہ ان کو ادا کرنے کے لیے قوت چاہئے اور وہ قوت اللہ کے ساتھ تعلق سے نصیب ہوتی ہے۔ یہی فرق ہے شریعت اور طریقت میں حضرت نے فرمایا۔

”شریعت مکتبہ فکر کا خاص طریقہ ہے جس میں زندگی کے رد و لبیان ہوں اور عمل میں خلوص حاصل کرنے کے لیے کیا حیلے کئے جائیں یہ طریقت ہے۔ انسان اس کائنات میں منی کائنات ہے جو نظام اور جو ترتیب اور عوامل کائنات میں کار فرما ہیں وہی انسان میں بھی ہیں جس طرح کائنات ایک Organised System کے تحت چل رہی ہے شریعت انسان کو اعمال کا وہ سسٹم مہیا کرتی ہے مگر اس کائنات کے نظام کو خوبی سے چلانے کے لیے طریقت کی ضرورت ہوتی ہے انسان مادے اور روح سے مل کر بنا ہے۔ روح ایک بلڈنگ ہے اور یہ انسان کے کردار

سے تعمیر ہوتی ہے۔ شریعت اس کی تعمیر کے طریقے اور اینٹیں گار اور مادی دنیا میں عمل کے طریقے ہیں طریقہ صحیح ہوگا تو تعمیر بھی درست ہوگی۔

Physical Structure مومن و کافر کا یکساں ہے۔ صحیح کھانا کھانے سے دونوں کی صحت درست رہے گی اگر کافر معاشرہ وہ اصول اپنالے جس سے ایک عہد معاشرہ تکمیل پاتا ہے تو معاشرہ مضبوط ہوگا یہ Physical act اگر مومن Opposite کرے گا تو تباہ ہوگا۔

عمل کے لیے انسان کو اللہ نے شعور عطا فرمایا ہے۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ہی شعور کا ہے۔ جانور اپنے فطری اطوار سے مغلوب ہوتا ہے انسان راستہ تلاش کرتا ہے۔ خواہشات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ درست راستہ اختیار کرتا ہے اور غلط سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔

جانور کو بھوک لگے تو جو ملے کھا لیتا ہے۔ انسان انتظار کرتا ہے کہ خوراک صحیح ہو۔ صحیح طرح حاصل کی گئی ہو۔ کسی دوسرے کا مال نہ اڑایا جائے جائز طریقے سے حاصل ہو۔ اسی طرح Bound sex ہے یہ مہذب راستہ ہے جو انسانی شعور کو ایمل کرتا ہے انسان خواہشات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ نسل انسانی کی افزائش اس کا مقصد ہے۔ اگر حدود ہنادی جائیں تو حیوانیت آجائے گی۔ انسان اگر صرف ضرورت پوری کرے تو وہ حیوانیت کی سطح سے بھی نیچے آجاتا ہے۔ زندگی اور معاشرے کی تعمیر صرف اس وقت ہوتی ہے جب انسان شعور سے زندگی گزارے۔

نبی کی شریعت پر عمل کرنے کے لئے برکات نبوی کا حصول ضروری ہے۔ جو Urge کو بدل دیتی ہیں۔ Depth of heart میں جہاں خواہش جنم لیتی ہے خواہش بدل گئی تو Sutile Heart میں تبدیلی آئی۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو پہلے لوٹ مار کر خوش ہوتا ہے اب دوسروں کو کھلا کر خوش ہوگا۔

انجیلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اسلام کی تہذیب خود اسلام ہے۔ ایمان لانے سے منہی کھودنے تک سارا دین ہے۔ یہ نہ صرف انسان کو اللہ سے آشنا کرتا ہے بلکہ معاشرے میں زندگی گزارنے کی حدود و قیود متعین کرتا اور عمل کے لیے خلوص مہیا کرتا ہے۔ یہی انسان کو سکون مہیا کرتا ہے۔

حضرت مدظلہ العالی سے جب بے سکونی کی وجہ دریافت کی تو آپ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں۔

Conflict-1 :- ”مثلاً توقعات کا زیادہ ہونا اور عمل کا اسے meet نہ کر سکتا۔ مثلاً توقع ہے کہ بہت دولت مند ہو جاؤں مگر کام کم کرے۔ تو یہ imbalance اس میں کمزوری پیدا کرتا ہے۔

2- نفس کو مارنا :- یعنی برے خیال آنے پر اس جذبے کو کچل دینا کیونکہ اس سے Urge پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی فعالیت کو کم کر دیتی ہے۔“

3- جسمانی کمزوری :- سارے عمل کو کمزور کر دیتی ہے۔ کمزور انسان شیطان اور جنات کے حملوں سے بچ نہیں سکتا۔ وساوس Tension اور پاگل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔

تینوں صورتوں میں جسم و روح میں عدم توازن انسان میں کمزوری اور بے سکونی پیدا کر دیتی ہے۔ تینوں صورتیں خالق کائنات سے ناآشنائی کا نتیجہ ہیں۔ تینوں صورتوں میں منصب رسالت سے ناواقفیت یا بے توجہی ظاہر ہوتی ہے۔ منصب رسالت جو عقیدہ عبادات کے ساتھ حقوق و فرائض کا بے مثال نظام عطا کرتا ہے۔ جس میں انسان عرفان ذات۔ اپنی ذات جس میں نفس اور جسم کے حقوق تک شامل ہیں۔ ان تمام باتوں کا علم ہی کافی نہیں دل کا نور نبوت سے روشن ہونا ضروری ہے جو عمل میں اخلاص اور آسانی کا باعث بنتا ہے۔

اپنی ذات ہی کے مطالعے سے یہ بات میرے سامنے آئی کہ تمام نفسیاتی امراض کی جڑ "ایمان باللہ" کا نہ ہونا یا کمزور ہونا ہے۔ جس کو جس درجے کا اعتماد یا یقین اللہ پر حاصل ہو گا اسی درجے کی شخصیت کی مضبوطی حاصل ہوگی۔

طبیعت میں سکون اور خوشی اسی نسبت سے حاصل ہوگی۔ ذکر اللہ اس یقین و ایمان کی کیفیات کو زیادہ کرتا ہے صرف اس وقت جب اسے صرف اللہ کی خوشنودی، یقین اور سکون کی کیفیات حاصل ہوں گی وہ غفلت برتنے یا مفادات کی ملاوٹ سے بے چینی، گھبراہٹ، اداسی، مایوسی، اور شک سے تبدیل ہو جائیں گی جس سے نہ صرف فرد کی ذات متاثر ہوگی بلکہ اسکے فرائض کی ادائیگی میں خلل آئے گا اور لوگوں سے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو گا اور یوں معاشرے میں ایک بگاڑ پیدا ہو گا۔

اللہ کا ذکر انسان کو اپنی اور خالق دونوں کی پہچان عطا کرتا ہے۔ خالق و مخلوق کے تعلق کو واضح کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق غافل دل پر ایک پردہ ہوتا ہے اور دل زنگ آلود ہوتا ہے تو وہ صحیح بات کو نہ دیکھ سکتا ہے نہ درست بات سن سکتا ہے اور نہ ہی درست سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ ہر چیز دھندلی ہوتی ہے بلکہ اسی طرح جیسے اگر ہم کسی چیز کی تصویر لینا چاہیں تو کمرے کو فوکس کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے Lense کو ایک سمت میں کچھ قوت کے ساتھ گھمانا پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ چیز واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب ایک نقطے پر جا کر ہر چیز واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اس چیز کا روشنی میں ہونا ضروری ہے۔ اللہ کے ذکر سے دل سے پردہ ہٹا اور روشنی آتی ہے۔ شیخ کی صحبت میں ہمیشہ Direction (سمت) اور قوت (Force) سے چیزوں کو میں نے Focus میں آتے دیکھا ہے۔ واضح ہوتے دیکھا ہے۔

جب روشنی میں ہر چیز اپنے غاظر میں نظر آتی ہے تو اپنی زندگی کی

Disorganization گندمی سب نظر آنے لگتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس روشنی میں یہ بھی علم ہونے لگتا ہے کہ تنظیم ممکن ہے اور کس طرح ممکن ہے۔ بے ترتیبی کیونکہ انسانی فطرت کے خلاف ہے تو فطری طور پر انسان زندگی میں ترتیب لانے کی کوشش کرتا ہے اگر اسے گندمی نظر آتی رہے اور وہ اسے صاف نہ کرے اور غیر منظم چیزوں کی تنظیم نہ کرے تو ذکر کرنے کے باوجود اسکی شخصیت میں تبدیلی نہیں آتی جو کہ بے سکونی کا باعث ہوتی ہے۔ تنظیم، ہمدی کے یہ اصول اسے شریعت مطہرہ سے پتہ چلتے ہیں۔ مگر جو شخص بھی اس کے لیے عمل شروع کر دیتا ہے تو اپنی ذات اپنے حلقے کی صفائی اور تنظیم کے بعد وہ اس پاس کی تنظیم خود خود کرنا چاہتا ہے کہ فطرت تنظیم کا تقاضا کرتی ہے دوسروں کی مدد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اس طرح یہ دائرہ انسان کی ذات سے بڑھ کر اپنے خاندان، ارد گرد کے لوگوں، دوست احباب، شہر، ملک اور پھر ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے ہے فرد نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی Support مہیا کرتا ہے ایک بہتر مستقبل اور بہتر معاشرہ ترتیب پا جاتا ہے۔

اللہ کے ساتھ تعلق کی اہمیت جو مجھے سمجھ آئی وہ یہ تھی کہ اگر صرف گندمی اور Disorganization گناہ، نافرمانی وغیرہ انسان کو نظر آئیں مگر اسے اللہ کی معیت اور رحمت کا احساس نہ ہو یہ اس میں خوف پیدا کرتا ہے جو بے سکونی کا باعث ہوتا ہے۔ نفسیات کی عمومی Relaxation کی Exercises انسان کے ذہن کو فوکس عطا کرتی ہیں اور اسے اپنی زندگی میں بے ترتیبی کا احساس بھی دیتی ہیں مگر اللہ کی رحمت کا احساس اور اس بے ترتیبی کو دور کرنے کا حوصلہ عطا نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ مریضوں میں ایک level پر جا کر جمود طاری ہو جاتا ہے اور وہ کوشش کے باوجود اپنی عادات کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

جب اللہ کے ذکر سے دل میں نور آتا ہے اور شیخ کی صحبت قرآن و سنت کی روشنی میں انسان کی سمت کو اللہ کی طرف بدلتی ہے تو جہاں گناہ کا خوف ہوتا ہے دوسری طرف اللہ کی رحمت کی امید ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ جب ذات کی-Organization قرآن و سنت کے مطابق ہونے لگتی ہے تو گناہ چھٹنے لگتے ہیں اللہ سے محبت بڑھتی ہے اور پھر اللہ کی محبت کے چھوٹ جانے یا کم ہو جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ اور اس کی رحمت کی امید نیک اعمال کی طرف رہنمائی کرتی اور قوت عطا کرتی ہے۔

یعنی زندگی میں ایک Balance آجاتا ہے۔ Balance انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ہے اور پھر اس کی جڑیں زمین میں مضبوط ہو جاتی ہیں اس کے بعد وہ معاشرے کے دوسرے افراد کے لیے ایک مضبوط ساراںات ہوتا ہے۔ حضرت سے اس عمل کے بارے میں دریافت کیا کہ بہت کم الفاظ میں بہت قوت کیسے Transfer کر دی جاتی ہے۔ کس طرح بات کر کے انسان عمل کے جذبے سے سرشار اور قوت محسوس کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا :-

”روح کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ جسمانی نظام کو الفاظ کے تبادلے کے لئے واسطے یا Medium کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ روح دوسرے شخص کی روح سے بغیر کسی واسطے کے پیغام وصول کر لیتی ہے۔ روح لمبی چوڑی زبان میں بات نہیں کرتی بلکہ

“Spirit conveys the essence to the other spirit”

اس بات سے وضاحت ہوئی کہ محبت کس طرح کام کرتی ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ انسان میں جس قدر قوت ہوتی ہے دوسرے کو اتنا ہی متاثر کرتی ہے۔ ماہرین نفسیات جو کام سالوں میں نہیں کرتے۔ نبی کے امتی روشن دل کے مالک لوگ لمحوں میں نگاہوں میں کیسے کر ڈالتے ہیں۔



یہ قوت اللہ پر ایمان کے ساتھ۔ اللہ کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے اور یہ محبت میں وہ اثر نگاہ کو وہ قوت عطا کرتی ہے جو ہر آنے والے کا دل روشن کر کے اسے اپنے احوال سے آگاہ ہونے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اور اسے بھی وہ قوت عطا کرتی ہے کہ وہ اس برے حال سے ایک بہتر اور پر سکون زندگی کی طرف اپنا سفر شروع کر سکے۔

انفرادی طور پر اشخاص کی شخصیت و کردار میں تبدیلی پھر معاشروں کی تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے۔

ماہرین نفسیات کا کام بے حد اہم اور نازک ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی ذات کی اصلاح کریں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی Disorganiza-tion کو دور کریں، اپنے دلوں کو اللہ کے نور سے روشن کرنے کے لیے ہم خود روحانی علاج کے iustitutions میں پہلی جماعت میں داخلہ لیں۔ اپنی شخصیت کے درخت کی جڑیں دین اسلام کے مضبوط اصولوں پر عمل کر کے مضبوط کریں تاکہ معاشرے کی ایک مضبوط بنیاد بنانے میں فعال کردار ادا ہو سکے۔ ذکر اللہ کی مدد سے 'نور نبوت' سے دل روشن کر کے پھر قرآن و سنت سے وہ نفسیاتی اصول وضع کریں جس سے مضبوط شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ "معاشرے سے ابتری دور کرنے کے لیے بھی ماہرین نفسیات کا کردار اہم ہے۔ کیونکہ موجودہ طریقہ علاج کے تحت مریض جب صحت یابی کے بعد اسی معاشی اور معاشرتی طور پر ناہموار ماحول میں جاتا ہے تو اس کے دوبارہ مریض بننے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ انفرادی کوششوں کے علاوہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان معاشی، معاشرتی، تعلیمی ناہمواریوں اور بے انصافی اور بد امنی کے خلاف صف آرا ہو کر ایک بہتر اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے جدوجہد کی جائے کیونکہ

مسلمان کو جب اللہ کی جانب فوکس اور اس سے محبت کا تعلق نصیب ہوتا ہے تو وہ صرف اپنی بہتری کے لئے کام نہیں کرتا بلکہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کو-Sup-port system میں کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے تاکہ ہر فرد بشر کو انصاف، تعلیم، معاش کے ذرائع اور امن میا ہو سکے۔

نفسیات کی مختلف Theories کے مطابق بھی انسان عرفان ذات کے اعلیٰ مقصد کی طرف تب ہی متوجہ ہوتا ہے جب اس کو بنیادی ضروریات یعنی 'معاش' امن اور انصاف میا ہو۔ اگر بنیادی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں تو فرد کی-De-velopment اس ایک نقطے سے آگے نہیں ہو پاتی۔ پھر یہ افراد جب معاشرے کے لیے بیج کی حیثیت رکھتے ہوں تو معاشرے کا بالکل وہی حال ہوتا ہے جو اس وقت ہمارے معاشرے کا ہے۔

معاشرے کو سنوارنے کی یہ عملی جدوجہد اس معاشرے کی تشکیل میں محدود معاون ثابت ہو گی جہاں ہر کافر و مومن کو یکساں انصاف میا ہوتا ہے۔ اسلامی نظام ہی کامل طور پر یہ مقاصد پورے کرتا ہے اور اس نظام کو ملک عزیز میں میا کرنا بنیادی مقصد ہے۔ جس سے فرد صحت یاب ہو کر جب پر امن معاشرے میں واپس جائے گا جہاں اس کی جان، مال، عزت و آمد و محفوظ ہو گی تو اس کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں گے۔

حضرت مدظلہ العالی کی روحانی یونیورسٹی فتویٰ دو بے مثال لوگ تیار کر رہی ہے جو ان کی صحبت میں اپنے دلوں کو روشن کرتے اپنے کردار کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالتے اور معاشرے کی صحت یابی کے لیے اپنی تمام کوشش صرف کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت کی نگاہ عالیہ دلوں کو وہ قوت عطا کرتی ہے جو عملی زندگی میں خلوص اور قوت عطا کرتی ہے اور اپنے اندر 'اور آس پاس کی صفائی پر انسان

اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔

حضرت کے ارشادات عالیہ کی روشنی بے مثال ہے جس میں ہر شخص اپنے کردار کو خوطی پرکھ سکتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں منہ سے نکلی ہر بات دلوں کو متاثر کرتی چلی جاتی ہے۔ اللہ کریم حضرت مدظلہ کا دست شفقت و سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور ہمیں ان کی جوتیوں کے طفیل اپنی زندگیاں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرز پر گزرنے کی توفیق عطا فرمائے ان لوگوں کی طرح جنہوں نے انسانیت کو اپنے کردار سے متاثر کیا اور ایک زمانے سے ظلم و جور متاثر عدل و انصاف اسلامی کی دولت سے کافرو مومن کو یکساں مالا مال کیا۔

خصوصاً ہم ماہرینِ نفسیات کو حضرت سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم ایک مضبوط معاشرے کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کر سکیں۔ مرشدِ کامل ایک نگاہِ نفسیات اور نفسیات دانوں پر بھی۔

## ..... اور کچھ نہیں ہوا۔

کرنل سلطان

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان کے ساتھ میرا پہلا رابطہ 1981ء میں ہوا۔ حضرت کی جس صفت سے میں حد درجہ متاثر ہوا وہ آپ کا قرآنی آیات کی تشریح کا ایک منفرد طرز بیان تھا۔ حضرت کا معمول ہے کہ آپ منبر پر تشریف رکھتے ہی قرآن شریف اٹھاتے ہیں۔ ایک دفعہ چومتے ہیں اور جدھر سے کھل جائے تلاوت کر کے بیان شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا بیان ہمیشہ ہی نہایت فصیح مدلل اور تقریب کی عین مناسبت سے ہوتا ہے۔ میں نے کبھی بھی حضرت کو ورق گردانی کرتے یا کوئی مخصوص سورت یا آیت کی تلاش میں ورق پلٹتے نہیں دیکھا۔ حالانکہ قرآن شریف کا نسخہ عموماً مقامی مسجد یا رہائش گاہ وغیرہ کا ہوتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور موقع پا کر پوچھ لیا، حضرت نے نہایت مختصر جواب دیا کہ ”یہ زندہ کتاب (قرآن عظیم الشان) ہے اور وہاں سے کھلے گی جہاں پڑھنے والے کی نیت ہوگی۔ حضرت کا یہ امتیازی طرز بیان ایک زندہ کرامت ہے حضرت کے حکم کے مطابق آپ کا بیان آپ

کی طرز گفتار کے عین مطابق 'حرف بحرف لکھا جاتا ہے۔ خواہ اس میں اردو ادب کی غلطیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ جسارت عمد حاضر کا کوئی عالم دین ہی کر سکتا۔ ذیل میں دو واقعات کا ذکر کروں گا جن کا تعلق فقط میری ذات سے ہے۔

پہلا واقعہ 1994ء کا ہے۔ میں ان دنوں افغانستان کے مغربی شہر ہرات میں کوئل جزل تھا۔ مجھے حکومت کی طرف سے احکام ملے کہ پاکستان اور ترکستان کے مابین تاریخی راستے پر پہلے تجارتی قافلے کی قیادت کروں۔ یہ قافلہ کوئلہ میں تیار ہوا۔ جہاں سے قندھار اور ہرات سے ہو کر خزارہ (ازبکستان) اور اشک آباد (ترکمانستان) تک جانا تھا۔ اور راستے میں آٹھ بڑے شہروں کے تحائف لے جانے تھے۔ افغانستان میں خانہ جنگی کی وجہ سے مرکزی حکومت کا عمل دخل نہیں تھا۔ اسلئے مجھے مقامی لوگوں سے رابطہ کرنا پڑا۔ تاکہ قافلہ حفاظت گزر سکے۔ انہی دنوں افغانستان میں طالبان کی اسلامی تحریک معرض وجود میں آئی تھی۔ جس کا مرکز قندھار شہر کے اطراف میں تھا اس سلسلے میں مجھے حضرت ملا محمد عمر مجاہد (موجودہ امیر المومنین افغانستان) سے بھی ملنا پڑا۔ حضرت ملا صاحب نے مشورہ دیا کہ قافلہ چند دن تاخیر سے چلے، کیونکہ قندھار کے اطراف میں جنگ کا خطرہ تھا۔ اس کے برعکس حکومت پاکستان کی خواہش تھی کہ کارواں کیم نو مبر کو اشک آباد پہنچے۔ کیونکہ وہاں ترکمانستان کا یوم منایا جا رہا تھا اور بیشتر سربراہان مملکت مدعو تھے۔ مجبوراً مجھے قافلے کو 31 اکتوبر چلانا پڑا۔ اور خدشات کے عین مطابق قندھار شہر کے مضافات میں ساہو کیونسٹ میلینٹ Communist Militant کے لوگوں نے روک لیا۔ جن کی مدد کچھ مقامی مجاہدین بھی کر رہے تھے۔ یہ لوگ طالبان کے مخالف تھے اور پاکستان کے خلاف منفی پراپیگنڈہ کی وجہ سے نہایت اشتعال میں تھے۔ وہ حکومت پاکستان پر طالبان کی مدد کرنے کا الزام لگا رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت تک حکومت

پاکستان کو طالبان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ بہر کیف میں نے اپنے ساتھ تعلقات کا سہارا لیتے ہوئے ان لوگوں کے ساتھ مذاکرات کئے جس سے ان کے غصے میں کمی ہوئی۔ مگر وہ قافلے کو کسی حالت میں چھوڑنے پر راضی نہیں تھے اور نہایت سختی سے اپنے موقف پر قائم تھے آخر کار میں قافلے سے دست بردار ہو کر قدحار پہنچا اور حکومت پاکستان کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ کوشش جاری رکھی کہ قافلے میں شامل تقریباً 100 افراد کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔ میں نے غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے ہر چارہ آزمایا اور حکومت پاکستان کے قافلے کو اس طرح روکنے کے دیگر مضمرات سے افغانوں کو آگاہ کیا۔ تین دن کے لگاتار رابطے سے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ تمام افراد اور گاڑیوں کو یکجا رکھنے کی یقین دہانی ہو گئی۔ لیکن قافلے کی رہائی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔ مجھے یہ اطلاع ملی کہ قافلے کے افراد کو طالبان کے خلاف جنگ میں ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چوتھے دن میں بالکل مایوس ہو گیا، کیونکہ ان حالات میں حکومت پاکستان بھی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ بلکہ حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی حالات کو مزید بگاڑ دیتی۔ جب ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ حضرت مولانا کو ضرور اطلاع کرنی چاہئے۔ خوش قسمتی سے میری پاس سیٹلائٹ فون تھا۔ رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ حضرت منارہ سے اسلام آباد چلے گئے ہیں اور رات کو واپس ہو گی رات کو رابطہ ہوا۔ میں نے تمام حالات سے حضرت کو آگاہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کی کہ حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ ان کا سلجھنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پورا قافلہ چار دن سے میدان جنگ میں رکا ہوا ہے جس کے دونوں طرف فریقین ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہیں۔ حضرت نے پوری بات توجہ سے سنی اور فرمایا کہ فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے لئے اتنا جواب اطمینان بخش تھا۔ لیکن

میں نے بے صبری سے مزید پوچھا کہ حضرت کب تک حالات ٹھیک ہوں گے جواب ملا کہ دودن کے اندر اور حضرت نے دعائیہ الفاظ کے ساتھ ٹیلی فون بند کر دیا۔ میں پوری رات سوچتا رہا کہ حالات ٹھیک تو ہو جائیں گے مگر کس طرح۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ یا حل نظر نہیں آ رہا تھا جس سے حالات ٹھیک ہو جائیں اور قافلہ صحیح سالم مخالفین کے زرعے سے نکل آئے۔ اس کے ساتھ ہی طالبان نے پیش قدمی شروع کر دی تو مخالفین نے قافلے کو فائر کی زد میں لا کر سامنے کھڑا کر دیا جو نئی طالبان نے لڑائی کا آغاز کیا تو پہلی گولی کے ساتھ ہی تمام مخالفین بدحواس ہو گئے اور قافلے کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ میں جب قافلے کے پاس پہنچا تو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمام گاڑیاں اور افراد صحیح سلامت ہیں۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد قافلہ منزل مقصود کی طرف چل پڑا۔ اور اس کے بعد واپسی تک مکمل خیریت رہی۔ میرے ساتھی افسران حیران تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ یہ صاحب کون ہیں جنہوں نے اطمینان سے دودن کا عرصہ بتایا اور قافلہ دودن کے بعد بغیر کسی نقصان کے آزاد ہو گیا یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ ظور پذیر ہونے کے بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ 1998ء کا ہے جب حکومت ایران نے اپنی تمام افواج افغانستان کی مغربی سرحدوں پر لا کھڑی کیں اور کسی بھی وقت ایک نہایت ہی خونریز جنگ کا خطرہ تھا۔ میں اپنے دفتر میں سٹاف کے ساتھ ہرات موجود تھا۔ مجھے حکام بالانے واضح کر دیا کہ خطرے کی صورت میں تمام عملے کو حفاظت نکالنا میری ذاتی صوابدید پر ہو گا یہ ایک اور خطرناک صورت حال تھی اور دن بدن اشتعال انگیزی میں اضافہ ہو تا رہا تھا۔ ہم لوگ دن رات طرح طرح کے منصوبے بناتے۔ جیسا کہ ہرات پاکستانی سرحد سے کافی دور تھا۔ اور زمینی راستے ایسے حالات میں استعمال کرنا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ اور لڑائی کی صورت میں ہوائی راستہ بھی مکمل بند ہو

سکتا ہے۔ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا صاحب کو صورتحال سے آگاہ کروں ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ حضرت پشاور میں ہیں۔ وہاں کا نمبر تلاش کیا اور آخر کار حضرت کے موبائل ٹیلی فون پر رابطہ ہو گیا۔ حضرت نے پوری تفصیل سنی اور فرمایا کہ تم نے اطلاع کر کے اچھا کیا ہے۔ فکر مت کرو کچھ نہیں ہو گا اس "کچھ نہیں ہو گا" کا مفہوم سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ ایک ہمسایہ ملک کے تمام سفارت کار مزار شریف میں مارے گئے۔ اور وہ نہایت غصے کی حالت میں اپنی ۲ لاکھ سے زائد فوج لے کر سرحد پر چڑھ آیا ہو اور نہایت خطرناک دھمکیاں بھی دے رہا ہو تو کس طرح یقین آجائے کہ کچھ نہیں ہو گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ حالات کچھ ایسے بن گئے کہ کوئی بھی خطرہ ہم تک نہ پہنچ سکا۔





## ”میرے ابو“

آیہ اکرم اعوان

اپنا زمانہ آپ مانتے ہیں اہل دل

ہم لوگ وہ نہیں جن کو زمانہ مانتا گیا

میں اپنی تحریروں کو عنوان نہیں دیا کرتی۔ لیکن آج مجھے لگا یہ خاص عنوان دیئے بغیر میں شاید ایک سطر بھی نہ لکھ پاؤں گی۔ بادی النظر میں تو یہ عنوان شاید پڑھنے والوں کی نظر میں غلط قرار پائے کیونکہ وہ صرف میرے ابو نہیں ہیں ہم سب بہن بھائیوں کے ابو ہیں اور مجھے سب کی طرف سے ان کے بارے میں ہمارے جذبات کا Representative مقرر کیا گیا ہے۔

لیکن انسان خود غرض واقع ہوا ہے اور اگر میرے اتنے سے اعتراف کے بعد یہ عنوان درست قرار پاتا ہے تو مجھے اقرار ہے میں خود عرض ہونے کی حد تک اپنے ابو سے وابستہ ہوں میری روزہ مرہ کی روٹین بلکہ ساری زندگی کا محور ان کی ذات ہے۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلا سوال یہ ذہن میں آتا ہے کہ ابو کہاں ہیں اور آج کیا کر رہے ہیں بلکہ ساری فیملی ہی کا یہی طریقہ کار ہے ان کے حساب سے ہماری روٹین

Set ہوتی ہے۔

جتنے روز وہ گھر پہ نہیں ہوتے اتنے روز خالی پن کا احساس تقویت پکڑتا رہتا ہے ہر طرف بے رونقی سی رہتی ہے۔ لیکن ہر روز صبح ان کے فون سے ہوتی ہے۔ یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے وہ کہیں بھی چلے جائیں چاہے ایک روز پہلے ہی سہی گھر پر فون ضرور کرتے ہیں اور جس طرح ان کی گاڑی گھر میں داخل ہوتے وقت ہم سب ہر طرف سے دوڑے آتے ہیں اسی طرح فون کے گرد گھیرا تنگ ہو جاتا ہے۔

اس طرح وہ ہمارے پاس نہ بھی ہوں تو ہمیں پتہ ہوتا ہے اس وقت وہ کس

جگہ بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔

ان کی ذات مرکز کی طرح ہے اور ہماری زندگیاں محور جیسی اس کی دوڑی وجہ ہیں ایک تو یہ ہے کہ اس میں امی کی لاشعوری کوشش کا بہت عملی دخل ہے۔ وہ کچھ اس طرح کہ جہاں تک میری یادداشت میرا ساتھ دیتی ہے مجھے یہی یاد پڑتا ہے کہ امی نے ہر حوالے سے ابو کی ذات کو ہمارے لئے ایک Simble کے طور پر پیش کیا ہے۔

کسی چیز کو ترک یا اختیار کرنے کے لئے ہمارے پاس معیار ابو کی ذات ہوتی تھی۔ ہم میں سے کوئی چہ اچھا کام کرتا، اچھی بات کہتا جس میں اس کی ذہانت کا اظہار ہوتا تو امی ہمیشہ یہی تعریف کرتیں۔ ”یہ اپنے ابو پہ گیا ہے“ یا ”شکر ہے انہوں نے اپنے باپ کا مزاج پایا“ بلکہ اب بھی یہاں تک کہہ دیتی ہیں۔ ”شکر ہے مجھ پہ نہیں گئے۔“

لیکن یہ بات خاص ہے کہ اس چیز نے ہمیں ہماری ماں سے دور نہیں کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک امی ابو کوئی الگ سے دو انسان نہیں ہیں امی کی تعریف ابو کی تعریف ہے اور ابو کی صفت امی کی صفت ہے۔

اور میں یہ بات بھی جانتی ہوں بلکہ پورے وثوق سے یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوں کہ ہمیں ابو کی ذات سے جوڑنے کی یہ کوشش ایک لاشعوری کاوش ہے اس میں کسی پلاننگ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایک تو ای جیسی سادہ مزاج اور تک سیدھے بندے سے یہ سب کچھ عملًا کرنا عید از قیاس ہے دوسرے میں سمجھتی ہوں ان کے اپنے نزدیک چونکہ ابو کی ذات 'سوچ' پسند 'نا پسند' ہر شے کا معیار تھی تو انہوں نے ہمیں بھی یہی بات سکھائی۔

ہم اپنے ماں باپ کو جج نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ قدرتی طور پر یہ بات ایک بچے کے ذہن میں اپنے والدین کے حوالے سے آتی ہی نہیں کیونکہ والدین کی خیر خواہی پہ ہمیں اندھا اعتماد ہوتا ہے اور دوسرے وہ ہماری زندگیوں کا حصہ ہوتے ہیں ان کی ذات کا الگ سے کوئی وجود ہمارے ذہنوں میں نہیں ہوتا۔

جو بات میں نے اوپر کہی ہے اس کا محرک میرا اچھا اور اک نہیں ہے بلکہ ایک دفعہ کسی نے میرے سامنے اس حوالے سے بات کی تو میرے ذہن نے اس پر سوچنا شروع کیا اور جو کچھ میں نے پایادہ اب آپ سے کہہ دیا۔

ابو سے اس درجہ Attachment کی دوسری وجہ خود ابو کی ذات ہے۔ وہ خود اپنے بچوں سے باپ ہو کر ماں جیسا پیار کرتے ہیں۔

اپنے ہر بچے سے وہ اس قدر قریب ہیں کہ ہمیں آج تک کوئی خواہش، کوئی ضرورت اپنے منہ سے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہمیں آج تک سب کچھ ہنا کئے ملا ہے۔

پڑھائی میں ہم کو شش کرتے ہیں انہیں اچھی رپورٹ دیں کھانا نہ بھی کھانا ہو تو بہت دفعہ صرف اسلئے میز پر حاضری لگواتے ہیں کہ ان کے ذہن میں رہے گا اس نے کھانا نہیں کھایا۔ وہ خود بہت بد مزہ ہوتے ہیں۔

بھائی کام سے 'واک یا شکار سے جب تک نہ لوٹے وہ انتظار کرتے ہیں۔ کھانے پہ سب کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔ ہماری کھانے 'پینے' پینے اوڑھنے سے لے کر شاپنگ اور سیر تک وہ خود ہر شے کا ہمد و مست کرتے ہیں۔

ان کے بغیر کہیں جانے کا ہمارے پاس کوئی concept نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہم اتنا پھرے ہیں کہ دور نزدیک کی کوئی وادی ہم نے نہیں چھوڑی۔ اب ہمارے لئے سب سے Exciting news کسی نئی جگہ کا Discover ہونا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ابو کسی نئی جگہ کے بارے میں سنتے ہیں یا خود دیکھ کر آتے ہیں تو ہمارے لئے عید کا سماں ہوتا ہے Picnic کا سب سامان لے کر ہم دو دو گاڑیوں میں لدے پھندے جاتے ہیں۔

بہت دفعہ ان کے ساتھ شکار بھی کیا ہے۔ بیٹے تو شکار کا ایسے لازمی حصہ ہوتے ہیں جیسے ہدوق۔ لیکن وہ ہمیں بھی لے جاتے ہیں ہمارے گھر میں بھی ایک اپوزیشن پارٹی ہے۔ قدیر بھائی۔ ”وہ چلتا پھرتا کرفیو ہیں۔ بتول ان کے ہم اگر ساتھ ہوں تو شکار، شکار نہیں رہتا Picnic بن جاتا ہے“

لیکن ابو کہتے ہیں ”اگر ہم انہیں ساتھ لے کر نہیں جائیں گے تو پھر یہ کس کے ساتھ جائیں گی؟“۔ ایک دفعہ کہا۔ ”دیکھو وہ لوہے کا گیت ہے اگر میں انہیں باہر نہ لے کر جاؤں تو شاید مہینوں یہ باہر کی دنیا نہ دیکھیں۔ یہ بھی انسان ہیں ان کا بھی خوشی پہ حق بنتا ہے۔“

اور ان کی آواز بھر اگنی۔ وہ بہت جلد رو پڑتے ہیں۔ بہ یک وقت چٹان کی طرح سخت ہیں اور اپنی بات میں اٹل ہیں۔ اور کسی گلاب کی پتی کی طرح نرم ہیں جس پہ شبنم بھی گرے تو آنسو کا گاماں ہوتا ہے۔

میں اس کے تصور میں یہ کہتا ہی رہوں گا

وہ شخص گلاہوں کے جزیرے کی طرح ہے

شاید اسی بات کا ذکر قرآن نے بھی کیا ہے۔ "اشد علی الکفار رحمنا

بینہم۔"

بہت دفعہ ایسا ہوا کسی کی تکلیف کا ذکر ہوا تو رو پڑے 'شعر کہا اور آواز ٹوٹ گئی۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کے لئے بہت بڑی ہوتی ہے۔ بلکہ الناحیہ حساب ہے بہت بڑی بڑی باتیں 'حادثے' نقصان وہ بڑے آرام سے سہہ جاتے ہیں لیکن کسی چھوٹی سی بات پہ ان کا دل کتنا دکھان کی آنکھیں ان کی آواز سب ہمید کھول دیتی ہیں۔ میں نے اپنے مزاج میں بہت سادہ اپنے لہ سے پایا ہے اسکا اور اک مجھے بہت سی باتوں سے ہوا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس لئے جس بات پہ ان کا دل دکھتا ہے۔ عین اسی لئے وہی بات میرے بھی دل میں پوسٹ ہو جاتی ہے۔

دل یوں درد محسوس کرتا ہے کہ آنکھ بھر آتی ہے۔ میں انہیں دیکھتی ہوں وہ مجھے دیکھتے ہیں اور پھر ہم اپنا درد باقی سب سے چھپا لیتے ہیں آنکھ میں آئی نمی لوٹ جاتی ہیں اور ان کی ٹوٹی ہوئی آواز کا زور واپس آ جاتا ہے۔

میں نے سارے کام لہ سے سیکھے ہیں۔ ڈرائیونگ اور شوٹنگ تو ہم سب نے ہی لہ سے سیکھی ہے اس لئے ہم سب Though Drivers اور اچھے نشانہ باز ہیں۔ البتہ میں نے سینگ 'روٹیاں' مانا اور کئی Hair Style بھی لہ سے سیکھے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے وہ جب امریکہ سے واپس آئے تو انہوں نے مجھے فریج ٹیل مانا سکھائی جو وہاں پہ دیکھ کر آئے تھے۔ ہم نے پریکٹس میری چھوٹی بہن پہ کی تھی۔ روٹیاں جب میز صی بھنتی تھیں تو وہ تدریجاً بھائی سے کہتے "مذاق اڑانے یا اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں ہے میز صی کھانے سے تمہارا کوئی پیٹ میڑھا ہو جائے گا۔ تم نہ کھاؤ میں خود کھا لوں گا۔"

جیولری 'کپڑے'، 'بقے کسی بھی چیز میں کوئی نیا شامل آئے وہ سب سے پہلے ہمارے لئے لاتے ہیں۔ ہم لوگ آج بھی نئے 'کپڑے' جوتے یا جیولری پہنیں تو چھوٹے چوں کی طرح ہمارے ہمارے پہلے اوکو دکھاتے ہیں۔

اور ہم چھوٹے بچے ہی تو ہیں۔ کیونکہ جتنا ہم بڑے ہوتے ہیں اتنے وہ ہم سے اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ماں باپ اور اولاد کا رشتہ تو پہلے دن جیسا ہی رہتا ہے۔ بچے بڑے بھی ہو جائیں تو والدین کے بچے ہی ہیں۔

تربیت کے معاملے میں ان کا کہنا ہے کہ بچے کو غلط اور صحیح کی تمیز دو اور پھر چھوڑ دو۔ اگر کوئی غلط کرتا ہے تو اسے خمیازہ بھگت کر سیکھنے کا موقع دو۔ جو صحیح کرتے ہیں اسکی بہت قدر کرتے ہیں۔

بہت کم کسی بات پہ ہمیں ڈائریکٹ ڈاننا جاتا ہے۔ Indirectly ان کے غصے کا اظہار ہوتا ہے اور ہم خود ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اس کی شان نزول کس کی کوفی حرکت ہے۔ جو موجود نہ ہو یا نہ سمجھے تو ہم ہیں نا۔ ان کے جذبات کی ترجمانی غولی کر دیتے ہیں۔ میں نے یہ دیکھا ہے اس طرح بچے ڈھیٹ نہیں ہوتے بلکہ Sensitive ہو جاتے ہیں اور پھر والدین کی ذرا سی ناگواری چابک کی مار سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

اسی طرح پڑھائی میں جس کا جو جی چاہا اسے پڑھا۔ جتنا چاہا اتنا پڑھا اور اگر کوئی فرسٹ آیا تو اپنی مرضی سے آیا۔ یا اپنی ذہانت و شوق سے کسی نے کوئی انعام جیتا تو جیتا۔ اس پہ کوئی دباؤ نہ تھا۔ نہ پوزیشن برقرار رکھنے پہ اصرار تھا۔ ہاں پذیرائی خوب ہوتی تھی۔

اس لئے ہم سب کبھی نصاب تک محدود نہیں رہے اور غیر نصابی سرگرمیوں نے ہمیں آل راؤنڈر بنادیا۔

بیٹیاں ہی نہیں وہ بیٹوں کو بھی اسی انداز میں لیتے ہیں۔ جب پہلی دفعہ ہمارے بھائی جان نے کراچی سینٹرل ہونے کا فیصلہ کیا تو سب سے زیادہ ڈسٹر ب ایجو جی ہونے تھے۔ انہوں نے انہیں روکا تو نہیں بلکہ وہاں ان کی رہائش کا دوبارہ وغیرہ کا پورا اہم و ہست کر کے دیا لیکن وہ بہت بے چین تھے۔

جس دن بھائی نے جانا تھا اس دن بے قراری میں ان سے ایک جگہ ٹنٹھنا محال ہو رہا تھا مجھے یاد ہے ڈائمنگ فیل پہ وہ کہہ رہے تھے۔

”میں نے اپنے سب چوں کو آج تک یوں ساتھ لگا کر رکھا ہے جیسے مرغی اپنے چوں کو پروں تلے سیٹے پھر رہی ہوتی ہے۔ اب بچے بڑے ہو گئے ہیں خود دی چوں والے ہیں۔ اپنا اچھا بھلا کچھ سکتے ہیں کما کر کھا سکتے ہیں۔ ان کے آگے ان کی ساری زندگی پڑی ہے اور ترقی کے مواقع بہت ہیں اب انہیں جانا ہے۔ لیکن آج تک کوئی مجھ سے دور نہیں ہوا ہے تو بشیر کا جانا مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔

ان کی آواز بھر اگنی تو وہ چپ ہو گئے۔ اس درجہ شفقت اور محبت کے باوجود اولاد ہو یا مال اسباب کوئی بھی چیز ان کے پیروں کی ہیزی نہیں ہے بلکہ اپنی ہر ملکیت کو اللہ کی راہ میں کام کرنے کے سلسلے میں بطور ذریعہ استعمال کرتے ہیں وہ ہمیشہ یہی دعا کرتے ہیں کہ ”اللہ ہماری جان مال اولاد کو اپنی راہ میں قبول فرمائے۔“

اور اسی ہمیشہ خود بھی یہ دعا کرتی ہیں اور ہمیں سکھاتی رہتی ہیں کہ اللہ کبھی ہمیں ان کی آزمائش کا سبب نہ بنائے۔ کیونکہ اللہ کے بندوں پہ آزمائشیں لازمی بات ہوتی ہے۔ کیونکہ آزمائش کا آنا کبھی ان کے مناصب کا تقاضا ہوتا ہے اور کبھی ان کے لئے ترقی کا باعث۔ بد نصیب ہے وہ جو ان کی آزمائش کا دکھ کا سبب بنتا ہے۔

مال کے ہونے یا نہ ہونے سے انہیں کوئی خاص فرق اس لئے نہیں پڑتا کہ ان کی زندگی جیسے پہلے تھی ویسے ہی اب بھی ہے۔ خوراک سادہ لباس رہن سہن سادہ

اپنا کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔  
 آج بھی انہوں نے کیا پسنا ہے؟ ان کی کونسی چیز کہاں رکھی ہے؟ دوا کہاں  
 ہے؟ کب کتنی لینی ہے؟ اپنے سب کام ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

سوال: کہنا انہیں اتنا پسند ہے کہ اگر بھول کر کھانے کے ساتھ پانی نہ رکھیں  
 تو کبھی نہیں کہیں گے پانی دو۔ خود اٹھ کر لے لیتے ہیں۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایسی  
 چیز جو کھانے میں ہمیشہ ساتھ لیتے ہیں ہم نے نہیں رکھی تو وہ نہیں مانتیں گے۔ برتن  
 اٹھاتے ہوئے ہمیں خود ہی خیال آجائے تو آجائے ورنہ وہ نہیں کہتے کہ یہ نہیں تھا۔

بلکہ امی بتاتی ہیں ایک دفعہ کھانے میں نمک ڈالنا وہ سرے سے بھول گئیں۔ ابو  
 آئے کھانا کھایا اور اٹھ گئے۔ آخر میں جب امی نے کھانا کھایا تو حیران ہوئیں اور بتایا اس  
 میں تو نمک ہے ہی نہیں۔ آپ کو پتہ نہیں چلا۔

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے امی ابو ایسے لوگ ہیں جو جینے کے لئے کھاتے ہیں  
 کھانے کے لئے نہیں جیتے۔ میری بڑی بھابھی کہتی ہیں لوگ کھا کے خوش ہوتے ہیں  
 اماں جی دوسروں کو کھلا کے خوش ہوتی ہیں۔

امی کی آج بھی آخر میں کھانا کھانے کی عادت ہے۔ ہم لوگ جو روٹی کے ٹکڑے  
 چادے جیتے ہیں۔ جو سالن چادے جیتے ہیں وہ باری باری سب چٹوں کی پلٹیں صاف کرتی ہیں  
 وہ کہتی ہیں۔

”رزق کا زیاں اللہ کی ناشکری اور بے برکتی کا باعث بنتا ہے۔ ہم کس لائق ہیں  
 اگر اس نے نوازا ہے تو اس کا احسان ماننا چاہئے۔“ اور وہ وقتاً فوقتاً اللہ کی نعمتوں کا شمار  
 کرتی رہتی ہیں۔ اس سے ہمارے دلوں میں چیزوں کی قدر اجاگر رہتی ہے۔ ہم انہیں  
 روٹین میں نہیں لیتے۔

اور واقعی نعمت تبھی نعمت ہے جب اسے بطور نعمت لیا جائے۔ ورنہ ایک اندھے



کو کیا معلوم کہ اس کی باتھ میں کنکر ہے یا ہیرا۔ شکر کا جذبہ بھی اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ میں نے واحد اپنا گھر دیکھا ہے جہاں تھوک کے حساب سے چیزیں آتی ہیں اور یہ ابو کی شروع سے عادت ہے۔ لیکن اسے سنبھالنا اور سنبھل کر استعمال کرنا ایسی پہ موقوف ہے وہ اس میں سے ایک دانہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتیں۔

جب کہ ہمارے ماما ابو کے گھر کو "وڈیاں مکاں دا گھر" بولا جاتا تھا۔ پھر اچھے برے سبھی طرح کے دن آئے اور گزر گئے۔ امی ابو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔

شاید زمانے کو وہی لوگ بدل سکتے ہیں جنہیں زمانہ نہ بدل سکے۔ ایسے لوگوں کے سامنے دولت کتنی بے وقعت ہو جاتی ہے۔ سونا تہجی سونا ہے جب اسے ماتھے پہ باندھ جائے۔ پاؤں میں پڑا ہو تو جیسے لوہا ایک دھات ہے ویسے ہی سونا بھی ایک دھات ہے اور ہنس۔

ابو روپے کو دوسروں پر یوں لٹاتے ہیں۔ جیسے یہ ان کا اپنا نہ ہو۔ واقعی کسی درخت سے توڑ لائے ہوں۔ یوں بھی کچھ لوگ انہیں لوٹ کر لے جاتے ہیں کچھ طبیعت بھی فقیروں کی غنی ہوتی ہے

اسے کوئی کیا لوٹے گا جو خود لٹانے پہ آمادہ ہو۔ ایک رشتہ دار ہمارے ہوئے 50 ہزار انہیں دیا۔ دوسرے روز ایک ملازم حادثاتی طور پر فوت ہوا 50 ہزار اسے دیا گھر گئے۔ گلی پکی ہو رہی تھی چندہ مالتے والوں کو 10 ہزار دے دیا۔ دارالعرفان آئے کسی مزدور نے چھت ڈالنا تھی اسے 10 ہزار دے دیا۔ ایک جاننے والے فوت ہوئے ان کے گھر والوں کو 10 ہزار دے دیا۔

یہ وہ واقعات ہیں جو چند دنوں میں اوپر تلے ہوئے اور کسی نہ کسی طرح ان واقعات کا ہم سے تھوڑا بہت تعلق بننا تھا تو یہ باتیں ہمارے علم میں آئیں۔ ورنہ ان

کے بانیں ہاتھ کو علم نہیں ہوتا کہ دائیں نے کیا دیا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ انہیں کسپرسی میں رہنا پسند ہے۔ وہ خوش لباس ہیں۔ خوشبو ان کی کمزوری ہے۔ ہمارے پاس ہمیشہ اچھی سے اچھی گاڑی رہی ہے وہ کہتے ہیں جو اللہ نے نعمتیں دی ہیں ان کا اظہار کرنا بھی شکر کی ایک قسم ہے۔ اگر دنیا کو مطمع نظر نہ ہالیا جائے تو دنیا کو برتنے میں کوئی خامی نہیں ہے اسلئے کہ یہ بنی بنی انسان کے برتنے کے لئے ہے۔ اللہ نے ہر شے کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔

تیرے خوش پوش فقیروں سے وہ ملتے تو سہی

جو یہ کہتے ہیں وفا پیر ہن چاک میں ہے

صلہ رحمی ایسی کہ کوئی مجھ سے کہے بھی تو چند ایک کھرا لیے ہیں کہ میں وہاں کبھی نہ جاؤں لیکن ان کی تمام تر نیکیوں کے باوجود جو وہ ہم سے روار کھتے ہیں ابو کسی نہ کسی طرح سے ان کی کفالت کرتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی ناجائز ضدوں کو بھی مان لیتے ہیں اور پھر قد یربھائی کو تسلیاں دیتے ہیں۔

”وہ وہ کرتے ہیں جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں میں وہ کرتا ہوں جو میرے ایمان کے مطابق صحیح ہے۔ برے کے ساتھ برائیاں جانا خود اپنے ساتھ زیادتی ہے۔ ہر شخص سے دوسروں کو وہی ملتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے اور آپ سے وہ جو آپ کے پاس ہے۔ ایک دفعہ کہا۔

”برے رشتہ دار بھی رحمت ہوتے ہیں۔ آخرت میں چھوٹ کا باعث بنتے ہیں۔“

اہل دنیا کی یہ حالت کہ نہ الفت نہ وفا  
اور میرا دل وہی انداز پرانے ماتھے

آج تک ہم پہ کوئی بات Impose نہیں کی مگنی وہ ہمیشہ ہر ایک کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ سب کے ساتھ ساری باتیں Discuss کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ رہنے سے کئی طرح کے Experiencess ہوتے ہیں۔ انسان خود خود سیکھتا چلا جاتا ہے۔ آپ کسی لمحے کسی موضوع پہ کوئی بھی سوال کر سکتے ہیں وہ پوری توجہ سے سنتے اور تسلی بخش جواب دیتے ہیں۔ ان کی یادداشت کمال کی ہے وہ چلتی پھرتی لائبریری ہیں جس سے ہم اٹھتے بیٹھتے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

اس کے باوجود مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جتنے بلند تر ہیں اتنا ہمیں ادراک نہیں ہے۔ گاڑی میں موٹر وے پہ جاتے ہوئے میں بڑے حضرت جی کے مکتوبات پڑھ رہی تھی۔ ابو سے ایک بات کی وضاحت چاہی تو انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ اعلیٰ حضرت کے ہاتھ کی تحریر ایک صفحے پہ چھپی تھی پڑھ کر بولے یہ اصل تحریر نہیں ہے پھر کئی سال پہلے لکھی گئی لیکن آج بھی اس میں برکات موجود ہیں۔

اس کتاب میں کئی جگہ حضرت کی تحریر میں ہے کہ یہ مسئلہ مشائخ سے رات Discuss ہوا۔ یا اس بات پہ دربار نبوی سے یہ حکم آیا ہے۔ تو میں اسے پڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہی سب سلسلے ابو کے ساتھ بھی والہ نہ ہوں گے۔ کیوں کہ وہ موجودہ شیخ سلسلہ ہیں۔

لیکن ہر وقت ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کبھی ہمیں احساس نہیں ہوا کہ اس جہان میں رہتے ان کا ایک اور جہان بھی آباد ہے۔

میں بات گیان کی کرتا ہوں تیرے دھیان میں بھی

الگ تھلگ نہیں دنیا سے سادھوؤں کی طرح

ان کی گفتگو 'سب باتیں کتنی عام فہم سی ہوتی ہیں جن میں شائبہ تک نہیں

ہوتا کہ ان کے پیچھے محرک کیا ہے۔ کسی ماورائی قوت کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ کوئی مافوق الفطرت چیزیں ہر روز دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ہاں کبھی کبھار کوئی بات سامنے آتی ہے وہ بھی شاید ہمیں ان کے حقیقی میدان اور اصل شخصیت یاد دلانے کی لئے۔

جیسے ایک دفعہ میر کے لئے ہم نے ایک نئی وادی دریافت کی۔ آئے دن میر کے لئے پہنچ جاتے۔ راستے میں ایک چھوٹی سی وادی میں کسی کا مزار تھا۔ جس کے پاس سے سڑک گزرتی تھی۔ لوگوں نے اس پر رنگ برنگے جھنڈے باندھ رکھے تھے۔ شاید منتیں بھی مانگتے ہوں گے۔

ایک دفعہ وہاں سے گزرے تو ابو نے کچھ ایسا کہا ”واہ اللہ تیری شان تیرا اپنا نظام ہے“ الفاظ شاید وہ نہ ہوں، مفہوم یہی تھا۔ ہمارے درمیان سفر میں یوں بھی سوال و جواب کے لمبے لمبے Sessions چلتے ہیں اس لئے فوراً پوچھا کیا ہوا؟ کوئی بات یاد آئی؟

”اے“ میں جب بھی اس وادی سے گزرتا تھا اس قبر کی نحوست سے میرے سر میں درد شروع ہو جاتا۔ دل مٹانے لگتا تھا۔ لیکن میرے بار بار یہاں سے گزرنے سے وہ نحوست چھٹ گئی ہے اور صاحب قبر عذاب سے افاقے میں ہے۔“

سوالوں کی تکرار شروع ہو گئی۔ یہ کیا سسٹم ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ اور جانے کیا کیا۔ جو جواب ملے ان کا ماحصل یہ تھا۔

”ہر مسلمان کے لئے عذاب کبھی دائمی نہیں ہوتا۔ اللہ کو اس شخص کے عذاب میں کمی کرنا مقصود تھی۔ سبب اس نے میرا یہاں سے گزرتا ہوا دیا۔“

اسی طرح ایک دفعہ ابو کے گاڑی والے فون پہ سروس نہیں آرہی تھی۔ گاڑی سائڈ پہ لگا کر وہ بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جھڑک کر بولے۔ ”تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ دور ہٹ جاؤ“

ہمیں سمجھ نہ آئی انہوں نے کس سے کہا ہے۔ مارے ڈر کے پوچھا بھی نہیں کیونکہ وہ فون کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے تھے۔

دوسری صبح انہوں نے بتایا۔ وہ ایک دیو طرح کا جن تھا۔ جو آسمانوں میں کہیں سے اڑتا ہوا آ رہا تھا۔ زمین پہ اسے گاڑی کی جگہ پر روشنی کا پہاڑ نظر آیا وہ یہ دیکھنے نیچے اتر آیا کہ اتنے اندھیرے میں یہ کیا چیز اتنی روشن ہے۔ وہ دور سے آیا تھا اسلئے مجھے جانتا نہیں تھا کہ اس وقت ابو غصے میں تھے تو انہوں نے پکڑ کر باندھ دیا۔ پوچھا باندھ کیسے وہ تو بہت طاقتور ہوتا ہے۔ بولے ”رے سے تھوڑا باندھا جاتا ہے نور سے باندھا جاتا ہے۔“

پھر کچھ روز بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ بولے ”اب جان گیا ہے کبھی نہیں بھولے گا۔“

یہ گزری سردیوں کی بات ہے۔ ہماری ہاں پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث سردیاں خوب سرد ہوتی ہیں۔ سردی کے اس عالم میں ہم فریزر میں برف جمایا کرتے کیونکہ بیٹھے ٹھنڈے کسی بھی وقت ابو کا جسم اٹارے کی طرح دھک اٹھتا۔ سرخ اور گرم کہ ہاتھ لگانے سے ہاتھ جلیں۔

ہم سب بھاگ بھاگ بالٹیوں میں پانی بھرتے۔ برف ڈالتے اور تولیے لئے ان کی گرد ہو جاتے۔ ہمارے ہاتھ اس سردی میں ٹھنڈے پانی سے بھی ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے بلکہ جلنے لگتے تھے جس کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے وہ ان کی آنکھوں اور چہرے پہ رکھتا۔

ابو صرف چادر باندھے ہوتے تھے اور ہم ٹھنڈے تولیے ان کے کندھوں پہ، ٹانگوں پیروں پہ بار بار دھرتے۔ اور میں نے خود ان کے جسم سے بھاپ کے بادل اڑتے دیکھے ہیں۔ وہ کہتے ”اللہ کی محبت اس طرح جلا سکتی ہے تو اس کے غضب کی آگ کس قدر شدید ہوگی۔“ کبھی زیادہ کبھی کم وقفے کے بعد وہ نارمل ہو جاتے۔ ایسا کیوں

ہوتا تھا؟۔ میرے پاس اس کا یہی جواب ہے کہ ان کے روحانی منازل میں کوئی ایسا مقام ہو گا۔ جس سے وہ گزر رہے تھے جس کے باعث یہ ہوتا تھا۔  
 جلا سکتی ہے شمع کشت کو موج نفس ان کی  
 الہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

یوں میں لکھنے بیٹھوں تو بے شمار واقعات ہیں۔ میں نہ تو ان کی ذات کا احاطہ کر سکتی ہوں نہ حالات و واقعات کا جن کا تسلسل سالوں پہ محیط ہے اور تاحال جاری ہے۔ ہاں ہماری یہ خوش بختی ہے کہ ہم اس سب کے غینی شاہد ہیں اور کسی حد تک باقی لوگوں کے قرض دار اور امین بھی۔

میں سمجھتی ہوں دوسرے لوگوں تک یہ باتیں پہنچانے کے ہم مکلف ہیں کہ اگر کوئی اصلاح باطن کے لئے شیخ کامل کا متلاشی ہے تو آؤ، پرکھو اور خود کو ان کے سپرد کر دو۔ جن کا دعویٰ ہے۔

دل منور ہو تو محسوس کر سکتا ہے  
 کون کتنا ہے اللہ کو دیکھا بھی نہیں

ذکر اس کا جو رگ دپے میں سما جائے گا  
 ایسا شعلہ سا اٹھے گا جو غم بھی نہیں

ابو کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ اچھے برے، نیک بد سبھی، لیکن وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

”روک ٹوک مولوی کا کام ہے صوفی کا نہیں۔ صوفی

سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے اپنے ساتھ جوڑے رکھتا ہے اور پھر اسکی صحبت سے ان میں آہستہ آہستہ تبدیلی آتی شروع ہو جاتی ہے جو ان کے اندر سے

امٹتی ہے۔ مولوی ظاہر کی اصلاح کرتا ہے اور صوفی  
باطن کی۔ جس کے نتیجے میں ظاہر کی بھی اصلاح ہو  
جاتی ہے۔“

ہر شخص ان کے لئے قیمتی ہے ان کا حکم ہے کسی کو دروازے سے نہ لوٹایا  
جائے۔ وہ کہتے ہیں۔

”سب سے مشکل حساب کتاب یوم قیامت مشائخ کا ہوتا ہے۔ ہر شخص صرف  
اپنی ذات کا جو لبدہ ہوتا ہے جبکہ مشائخ ہر اس مدے کے ساتھ مکلف ہوتے ہیں جس  
نے ان کے ہاتھ پہ بیعت کی۔ اور جب تک ان میں سے ہر ایک گزر نہیں جاتا وہ  
فارغ نہیں ہوتے۔“  
وہ کہتے ہیں۔

”اللہ نے ہمیں برکات نبوی کا امین بنایا ہے۔ اس دور کے ہر مدے کے امانتدار  
ہیں ہم۔ اس تک ان برکات کو پہنچانے کے مکلف ہیں۔“  
شاید اسی لئے وہ ہر آنے والے کو اتنا اہم جانتے ہیں اور اس پہ اتنی محنت کرتے  
ہیں۔

یہ مرتباں سے جا کے کہہ دو کہ اپنی کرنوں کو گمن کے رکھ لے  
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں  
میں نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ ان کے پاس آتے ہیں اور وہ شخص جو  
انہیں واصل باللہ کر سکتا ہے عشق رسول کی آگ بانٹتا پھرتا ہے کہ اپنے سینوں میں  
بھڑکا لو۔ وہ جو انہیں افلاک طش سکتا ہے یہ لوگ اس سے دنیا مانگتے ہیں۔ جو کہیں  
سے بھی مل سکتی ہے۔

اس سے اپنے پاؤں کے کانٹے نکلواتے ہیں، سر درد کے لئے دوا کرواتے ہیں  
نوکری کے لئے دعا کرواتے ہیں، صحت کے لئے تعویذ لکھواتے ہیں۔

کہتے سستے پہ راضی ہو جاتے ہیں یہ لوگ۔ کتنا کھانے کا سودا کرتے ہیں۔ شاید وہ اس لئے لوگوں کے ہر طرح کے کام میں کام آتے ہیں کہ لوگ دنیا سے فارغ ہوں گے۔ تکلیفوں اور دنیا کے دھندوں سے چھٹکارا پائیں گے تو آخرت کی باری آئے گی۔ اور تب تک ساتھ لگائے رکھتے ہیں اور ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں ہم ان سے انہیں بتائے بغیر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور وہ سب جانتے ہوئے انہیں ایسا سمجھنے دیتے ہیں۔ اف کتنا بظاہر درکار ہے اس کام کے لئے۔

کچھ لوگ ایسے آتے ہیں کہ شاید کوئی بھی جو انہیں کسی حوالے سے جانتا ہو۔ ان کی ذات سے 'ان کی پہنچ سے' 'ان کی اہلیت سے' شاطر دماغی اور چرب زبانی سے خائف ہو جائے لیکن اس سدا کی طرح مطمئن رہتے ہیں۔ جیسے شطرنج کا کھلاڑی بادشاہ، وزیر، پیادے سب کی طاقتوں سے، اہلیتوں سے واقف ہوتا ہے اور ان سے خائف ہونے کے بجائے انہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ایسے میں وہ مجھے کوئی ماہر کھلاڑی لگتے ہیں۔ لیکن یہ مثال ان کی سادگی، نیک نیتی اور اعلیٰ مقصد کے پیش نظر مکمل طور پر صادق نظر نہیں آتی۔ وہ سوائے رب العزت کے کسی سے نہیں ڈرتے۔ کبھی خائف نہیں ہوتے۔

بے خوف زندہ لہجے میں کرتا ہوں گفتگو  
خود ساختہ خداؤں سے ڈرتا نہیں ہوں میں  
وہ نقطہ شعور ہوں قرطاس زیت پر  
پھیلوں اگر کبھی تو سمجھتا نہیں ہوں میں

وہ بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کی میرے نزدیک خاص بات اس کا انوکھا پن ہے۔ منفرد اسلوب، نئے نئے خیالات اور انوکھی باتیں۔ جنہیں لگتا ہے اس انداز میں پہلی دفعہ کہا گیا ہے۔



زیادہ تر شاعری حالت سفر میں کرتے ہیں۔ ہم گاڑی میں ساتھ ہوں تو تاکہ  
جھانک بالکل نہیں کرتے کیونکہ وہ غزل 'نعت جو بھی ہو مکمل ہونے یہ خود ہی سنا  
دیتے ہیں بعض اوقات چلتے پھرتے باتوں باتوں میں غزل ہو جاتی ہے۔  
اپنا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگر  
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا  
تصور کوئے جاناں سے مدینے جا نکلتا ہے  
غزل سے بھی ہزاروں نعت کے پہلو نکلتے ہیں  
میرے نزدیک یہی ان کی شاعری ہے :-

ان کی زندگی ہمہ جت ہے۔ سب باتوں کا احاطہ ممکن نہیں۔ میں نے اسی لیے  
آج تک ان کی ذات پہ قلم اٹھانے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ کیونکہ مجھے ہمیشہ یہی لگتا  
ہے کہ جیسے وہ ہیں 'جو کچھ وہ ہیں۔ میرے نزدیک جو ان کا مقام ہے یا جتنی وابستگی  
ہماری دلوں 'جذیبوں اور سوچوں کو ان سے ہے میں کبھی بھی اس طرح میان نہیں کر  
پاؤں گی جس طرح حقیقت میں وہ ہے۔

اور ایسا ہی ہوا ہے میں غلط نہیں تھی۔ مجھے میری لکھی ہوئی ہر بات ادھوری لگ  
رہی ہے اور اگر میں لکھنے نہ لکھنے میں آزاد ہوتی تو شاید میں کبھی نہ لکھتی یہ مجھ سے  
لکھوایا گیا ہے۔ تاحال میں نہیں جانتی باقی مضمون نگاروں نے کیا لکھا کیا نہیں۔ اس  
لئے کچھ باتیں شاید یکساں ہوں۔ جس کے chances کم ہی ہیں کیونکہ :-

ہر نظر بس اپنی اپنی روشنی تک جا سکی  
ہر کسی نے اپنے اپنے ظرف تک پایا مجھے

## میں اور میرے ابو

عبدالقدیر اکرم اعوان

چونکہ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ اپنے ابو جی کی شخصیت کو بیان کریں۔ سو اس مضمون کا نام بھی سمجھ میں آتا ہے۔ ایک بات 'دوسری بات Practical Life' میں پہلی دفعہ مضمون لکھنے کی کوشش کرنے جا رہا ہوں۔ اس بات کو مد نظر رکھ کر مضمون پڑھا جائے یا پرکھا جائے۔

یاداشتیں :

بہت پہلے ایک ننھے ذہن میں جو کچھ تھا اسکو On paper آپ کی نظر کرتا

ہوں۔

میں چونکہ چھن میں بہت شرارتیں کرتا اور گھروالوں کو تنگ کرتا تھا سو کبھی کبھی ابو جی سے جھاڑیں کھاتا اور کبھی کبھار تھوڑی بہت سزا بھی مگر یہ ان کی فطرت تھی اور یہ ہے کہ جب کبھی غصے ہوئے تو ہم انتظار کرتے کہ ابھی راضی کرنے اور بھلانے کی خاطر کوئی نہ کوئی چیز گفٹ کریں گے اور ہمیشہ وہی ہوتا نہیں جو اچھا ملتا وہ

دے دیتے۔

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ باہران کی کیا مصروفیات ہیں۔ کتنے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے دماغ میں کتنی Tentions ہیں۔ بس جب بھی وہ گھر آتے ہم اس انتظار میں ہوتے کہ جو نئی وہ گھر میں داخل ہوں گے ہم بہن بھائیوں سے سوال کریں گے۔ "دیکھو میرے پاس کیا ہے؟" اور پھر کیا، آگے آگے وہ بھاگتے کبھی کسی کمرے میں اور کبھی کسی کمرے میں اور ہم ایک دوسرے سے تیز بھاگ بھاگ کے انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے کہ ان کے پاس کیا ہے۔

یادداشت کی سکرین پہ یہ بات بھی نمایاں نظر آتی ہے کہ ابو جی ہمیں لے کے بڑے حضرت جی (حضرت مولانا اللہ یارؒ) کے گاؤں جاتے اور وہ بھی ہمارے گھر تشریف لاتے اور ابو جی کو دیکھ کر میں بھی کوشش کرتا کہ اس ہستی کی محفل میں ادب سے داخل ہوں اور ان کے احترام میں جھک جاؤں۔

کبھی کبھی رات کو چھوٹے دونوں بہن بھائی کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے بیڈ پر اپنے ساتھ لٹا لیتے اور کوئی نہ کوئی مزے کی کہانی سنانا شروع کر دیتے۔ میں اور دوسری بہن بھی ارد گرد کہیں نہ کہیں جگہ ڈھونڈ کے بیٹھ جاتے اور کہانیاں سنتے رہتے۔ اور کسی دن ابو جی کہانی ختم کر کے تھوڑا سا وقت ذکر الہی بھی کر دیتے۔

تھوڑی سی یادداشت جھپٹن کی لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ابو جی کی شخصیت کا وہ پہلو جو کہ گھر کی چار دیواری میں ایک بچے نے دیکھا بیان ہو جائے۔ یعنی وہ جتنے بھی تھکے ہوئے آتے انہوں نے اپنے بچوں کو خاص وقت دیا اور ان سے اتنا پیار کیا کہ جو وقت وہ کاروبار زندگی میں صرف کرتے تھے اس کا یا گھر سے غیر حاضر ہونا پڑتا تھا کا ازالہ ہو جاتا۔ آج بھی پوتے پوتیاں کیساتھ اسی طرح کھیلتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔

رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ داری :

یہ وہ کام ہے جو دنیاوی چند بڑی مشکلات میں سے ایک ہے اور اس میں سرخرو ہونا بہت مشکل ہے۔ مگر ابو جی کی طبیعت کا یہ پہلو بھی بہت صاف اور کھرا ہے کئی دفعہ عزیز ناراض ہوئے مگر جب بھی ان کے ساتھ مشکل پیش آئی انہوں نے ابو جی کو اپنے ہم رکاب پایا۔ بلکہ انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس اللہ کے ہمدے کے ساتھ زیادتی کر لو۔ ہماری دفعہ یہ لحاظ کر جائے گا۔ بلکہ ایک قریبی رشتہ دار اڈے پہ بیٹھ کر براہِ ملامت اٹھلا کرتا رہتا ہے اور جب کبھی مسئلہ نئے چاہے معاشی ہی کیوں نہ ہو ابو جی کے پاس آتا ہے اور یہ اسکی مدد کر دیتے ہیں اور ہماری سوائیہ نگاہوں کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں اور فقط اتنا کہتے ہیں۔ ”خدا تو دیکھ رہا ہے۔“

یعنی حتیٰ الوسع کوشش کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے تو ٹھیک مگر گزند نہ پہنچے۔

گھر :-

ابو جی نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں۔ یہ کہانی مجھے نہیں معلوم کہ کن حالات میں دوسری شادی کی۔ بہر حال جو کچھ میرے علم میں ہے وہ یہ کہ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں تین بھائی اور ایک بہن پہلی شادی سے اور دو بھائی اور دو بہنیں دوسری شادی سے بڑے بہن بھائی سیکھتی جبکہ ہم منارہ میں رہتے ہیں۔ ہمارے گھر میں وہ روایتی سوتیلے پن کی بو نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں بہن اور بھائی کے رشتے کے ساتھ سگایا سوتا لگانے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے خود پرائمری That means five years سیکھتی سے پاس کی ہے۔ Weekend پر منارہ جاتا تھا۔

یہ سب روٹین میں ہی ٹھیک نہیں چلتا بلکہ کسی کی محبت اور کوشش کا فرما ہوتی ہے اس رہن سن کی روح ابو جی کی طبیعت ہے۔

## ذات :

یہ وہ پوائنٹ ہے کہ جہاں پر قلم کی زبان مگک ہو جاتی ہے۔ اور Writer کو ڈھونڈے سے وہ الفاظ نہیں ملتے جو کہ ترجمانی کر سکیں بہر کیف ایک باتواں کو شش ہے جو کہ ظاہری حالات پر مبنی ہے۔ ایو جی کا تعلق ایک متوسط زمین دار گھرانے سے ہے۔ اس لئے شروع سے محنت کے عادی ہیں اور ہمارے علاقے کا رہن سہن مشکل اور مزاج سخت ہے اور علاقے میں پھر سیکھی سب سے پہلے نمبر پر اکھڑ گاؤں۔ بلکہ ایک میراثی مثال دیا کرتا تھا کہ جب اللہ نے انسان بنانا شروع کئے تو ایک وقت میں انسان ہی بناتا گیا اور پھر جب ارواح بنانا شروع کیں تو روحیں ہی بنانا چاہا گیا۔ جب جسم اور ارواح ہچکا تو پھر بہت ساری روزی بنائی اور یہ عمل شروع کر دیا کہ جسم میں روح ڈالی اور ساتھ کچھ حساب سے روزی لکھی اور زمین پر بھینچ دیا۔ آخر میں کچھ روح جمع جسم بچ گئے جن کے لئے روزی کم پڑ گئی تو اللہ نے فیصلہ کیا جو چلے گئے وہی کافی ہیں تم باقی ادھر ہی رہو ورنہ روزی کا مسئلہ نہ گا۔ تو آگے میراثی کہتا ہے کہ بچے ہوئے لوگوں نے عرض کی۔ اے اللہ تو ہمیں دنیا میں بھینچ۔ روزی قسمت میں نہیں رہی تو نہ سہی جن کے پاس ہوگی ہم ان سے حصہ لے لیں گے۔ وہ میراثی کہتا تھا کہ یہاں وہ لوگ ہیں جو کہ روزی کے بغیر آئے تھے۔

اس مثال سے مراد یہ ہے کہ حالات اتنے سخت، دشمنیاں اور اتنی Ten-tions کہ ایو جی اس Process سے گزر کر اعصابی طور پر بہت مضبوط ہو گئے۔ اور رہا دین کا سلسلہ تو ہمارے آباؤ اجداد میں کچھ نہ کچھ مذہبی رجحان رہا ہے سو وہ طلب بھی اتر آئی۔ جب سے ایو جی کی زندگی نے تصوف کی طرف کروٹ لی اور ایک اللہ کے کامل بندے کی محفل کا حصہ بنی تو تمام انسانی عظمتوں کے کمال کو پہنچے۔

میں آ کے وہ مقام آ جاتا ہے کہ جس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ الفاظ کی محتاجی سے نکل جاتا ہے۔ تصوف کے سلسلے کو عرصہ دراز تک پورے اشیاک سے Practice کرنے سے ان کی طبیعت میں بہت زیادہ نکھار آ گیا۔ طبیعت میں ایسی بنو فشانی آئی کہ شاعر سے لے کر مفسر قرآن تک کمانے لگے۔ دنیا بھر میں اسلام کی تبلیغ کی اور اس جہاں گردی کو سفر ناموں کی شکل دے کر منظر عام پر لائے۔ آپ کے دفتر میں دنیا بھر کے ڈاک ٹکٹ دنیا بھر کے سکے اور ڈائمنو سار کے جڑے سے لے کر سیپ کے فاسل تک ملتے ہیں۔ خود پہاڑوں پر پتھر کے نوادرات اکٹھے کرتے ہیں اور مردانہ کھیل یعنی شکار کے بہت شوقین ہیں۔ پرندوں سے لے کر Snow leopard تک شکار کیا ہے۔ یعنی اس شوق میں صحراؤں سے لے کر برف پوش چٹانوں تک گئے ہیں۔ کھڑے ہو کر بغیر سارے کے رانقل کا جتنا نشانہ آپ کا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی اور کا نہیں دیکھا بلکہ کئی دفعہ مقابلہ بھی کیا ہے مگر ہار جاتا ہوں۔ جانوروں کے بھی شوقین ہیں 'ابھی بھی تین گھوڑے سواری کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔

زمین داری سے لے کر کول مائننگ تک بزنس کیا اور جب معاشرے کی طرف مڑے تو نادرن ایریاز کی فلاح کے لئے الفلاح کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جو کہ مختلف طریقوں سے نادرن ایریاز میں لوگوں کی مدد کرتی ہے۔

تعلیم کے سسٹم میں مایہ ناز کام کیا۔ صفارہ اکادمی کے نام سے ایسا تعلیمی نظام مرتب کیا کہ جس میں بچے سائنس کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات بھی حاصل کرتے ہیں۔

اپنی زیر نگرانی بلا سود ہیکاری سسٹم بنایا اور یہ ہیک بھنسل خدا بڑے احسن طریقے سے چل رہا ہے۔



تعلیم اہل خوان کے جلسے میں



نوکوں کے ساتھ جنگل میں

عدلیہ کے سلسلے میں بھی ایک سسٹم جو کہ اسلامی اقدار کے مطابق بنایا جس کے مختلف جج حضرات ہیں۔ لوگ اپنا موقف بیان کر کے انصاف حاصل کرتے ہیں۔

میں ایک چیز کی کمی تھی کہ اب نہیں رہی یعنی سیاسی میدان۔ ایک دفعہ تقریر میں فرمایا کہ یار اگر ثواب ثواب اکٹھا کروں تو بڑے پہاڑ بنے یعنی جب سے تصوف میں آیا ہوں کوئی نماز نہیں چھوڑی، تہجد نہیں چھوڑی۔ کتنے لوگوں کو اللہ اللہ کرنا سکھایا اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کو کلمہ پڑھایا۔ جانے کتنے سال ہو گئے ہیں اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے اگر ثواب اکٹھا کروں ہمارے پہاڑ سے بڑا لگتا ہے مگر جب روز محشر کا خیال کرتا ہوں تو کچھ اس طرح لگتا ہے کہ اللہ رب العزت کا دربار ہے اور میں ثواب کے پہاڑ ٹھیسے چلا آ رہا ہوں کہ ابھی جنت کا ٹکٹ لیتا ہوں اور سیدھا جنت میں جا کے رکوں گا۔ بالکل اسی لمحے یہ خیال آتا ہے کہ کوئی غریب نادار جی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اللہ پاک کے تحت کا پایہ پکڑ کر گزر رہی ہے روتی ہے واویلا کرتی ہے کہ یا الہی تو نے اپنے اس بندے کو دنیا میں مقام دیا، اسلام سے وابستگی دی، ماننے والے لوگ دیئے اور تیرا یہ بندہ حجروں میں بیٹھا رہا اور میرا نہ مال چا اور نہ عزت آمد۔ سب کچھ لٹا رہا۔ یارب تیرے اس بندے کا تیری مخلوق کو کیا حاصل۔

تو فرمایا کہ اللہ کی ذات بڑی غیور ہے۔ وہ نیکیوں کے پہاڑ اٹھا کے منہ پر مارے گا کہ لے جاؤ ان کی ہمیں ضرورت نہیں۔

یہ سوچ کر انہوں نے سیاسی نظام کی اصلاح کے لئے الاخوان کے نام سے سیاسی پلیٹ فارم بنایا۔

سودو ستو اتنی سمندر کی سی طبیعت میرے علم میں اور کہیں نہیں ہے۔

مصنفہ کا سوال ہے کہ اپنے ابو کے مشن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

ان کے مشن اور ان کے کام کو میں اس قدر ٹھیک اور Positive سمجھتا ہوں کہ



”میں اپنے ابو جی کے مشن کو اپنے خون سے سینچوں گا انشاء اللہ۔“ آپ گواہ رہنا۔ آپ کے کہنے پر میں نے اپنی استطاعت کے مطابق حضرت جی (یہ بتاتا چلوں کہ میں نے باقاعدہ بیعت کی ہوئی ہے اس لحاظ سے وہ میرے حضرت بھی ہیں)۔ پر مضمون تو لکھ دیا ہے مگر آپ سے سوال یہ ہے کہ آیا آپ اس سمندر کو کوزے میں بند کر سکیں گی؟

### میری رائے

مجھ سے ایک سوال یہ بھی کہ کوئی ایسی بات جسے کرامت کہا جاسکے تو محترمہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس ضمن میں آتی ہیں مگر میں جو بیان کروں گا وہ میرے اپنے متعلق ہے۔ میرے تقریباً چھ موہرے ریڑھ کی ہڈی کے خراب ہیں۔ اس کا دنیا میں تاحال کوئی علاج نہیں۔ تمام ٹیسٹ کروانے اور ڈاکٹروں کو دکھانے کے بعد جو نتیجہ آیا وہ یہ ہے کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ آہستہ آہستہ چارپائی پہ آجاؤ گے اور بس۔ مگر صرف ابو جی کے نقش استعمال کئے ہیں اور کر رہا ہوں۔ پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ ابھی ڈاکٹر اس Condition کو نہیں مانتے۔

## حضرت جی

شمینہ افتخار اعوان

لفظ "میان" سے میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی خاکہ ابھر ا کرتا تھا کہ کوئی مولوی یا مولانا نایک کے آگے کھڑے گا نا گانے کے انداز میں لہک لہک کر تقریر کر رہے ہیں اور یک بیک یوں محسوس ہوتا کہ مایک پہ دھرے ان کے ہاتھ کو کرنٹ چھو گیا ہو یا شاید قریب ہی کہیں بھڑوں کا چھتہ بھی موجود تھا کہ "لہکتے" لہجے میں قیامت کی شدت و تندہی جنگ و جدل کا سماں پیدا کر دیتی۔ اسی لئے جب والد صاحب کے دوست محمد خاں جنجوعہ صاحب نے ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی کہ ان کے شیخ کو جراتوالہ تشریف لارہے ہیں ان کا بیان سننے ضرور آؤں تو مجھے ہنسی آگئی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کالج میں اسلامیات کی قابل ترین معلمہ بہترین لیکچر دیتی ہیں اور پھر بھلا ہم خود بھی کیا نہیں جانتے لہذا ایک مولوی کا بیان ایسا ضروری کہاں کہ اس پہ کالج لائف کا ایک سنہری دن قربان کیا جائے۔ وہ یہی کہیں گے تاکہ نماز پڑھو اور

روزہ رکھو تو ہمیں معلوم ہے کہ نمازیں پڑھنی چاہئیں روزے رکھنے چاہئیں۔

روز بروز سوئیں۔ اور آپ نے انہیں پکڑ لیا۔ کالج کا دن تو ہم سے قربان نہ ہو سکا لیکن جنجوعہ صاحب کی شفقت بھری ہمارا فنگی ضرور مول لے لی۔ وہ ہفتہ بھر کی غیر حاضری کے بعد آئے تو ہم نے بیسیوں یہاں گھومتے ہوئے محض تملانی کی خاطر پوچھ لیا کہ "آپ کے شیخ صاحب نے کوئی کتاب وغیرہ نہیں لکھی۔ ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔" وہ دام میں آگئے۔ یہ ہمارا خیال تھا ورنہ تو اگلے دن دام ان کے ہاتھ میں تھا۔ "دیار حبیب میں چند روز" اور "ارشاد السالکین" کے بوپ میں۔ میں نے ہمیشہ مذہبی کتب کا دل سے احترام کیا تھا (اپنے طور) سو ان کتب کو بھی چوم کر الماری کی سب سے اوپر والی شیفٹ میں منجمال کر رکھ دیا اور جنجوعہ صاحب کے اگلی دفعہ آنے پر بغیر پڑھے دونوں کتب کے انداز بیان و حسن ماہاں کے قصیدے پڑھ دیئے کہ آخر پطرس بخاری بھی ہی میں سے تھا۔

امتحانات سر پر آئے تو نصاب کے علاوہ ہر کتاب حسین گئے تگی اور یوں رات کے بارہ بجے "ارشاد السالکین" حصہ اول پہ نظر پڑ گئی۔ جھٹ پکڑ لی کہ مسلمان ہونے کے ناطے دینی علم حاصل کرنا نہایت ضروری محسوس ہوا۔ "ارشاد السالکین" کھولی مگر۔۔۔۔۔ مگر یہ محض کتاب نہ تھی، سمندر تھا، کیفیات کا، برکات کا، معلومات کا، رات بھیک گئی۔ کتاب ختم ہو گئی اور میں گم سم بیٹھی تھی۔ میں! جو کہ غلم نفسیات کی طالبہ ہوتے ہوئے فراڈ کے کچھ نظریات سے چڑ سی گئی تھی اور-Brief Intro-duction of Muslim Psychotherapy کر جان چکی تھی کہ علم نفسیات کی روح فقط مسلمان ہی جانتے ہیں۔ روح کے اس معالج، استاد کی کتاب مگود میں دھرے اس دن کے زیاں پہ ملول تھی ان کی بات سننے کا موقع گنوا دیا تھا۔ اور اک کیا ہوتا ہے؟ میں نے اس دن جانا۔ یقین کسے کہتے ہیں؟ مجھے اس رات خبر ہوئی۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ یہ میں جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے کرسی پہ بیٹھے

نجانے کتنا وقت گزر افجر کی اذان بلکہ اذانیں شروع ہو گئیں۔ اٹھ کر وضو کیا۔ وضو جیسے محض نماز کے لئے لازم سمجھتی تھی آج بدن کی طہارت کا ذریعہ محسوس ہو رہا تھا۔ جاء نماز دوست سے ملاقات کے لئے طے شدہ جگہ دکھائی دے رہی تھی اور صلوٰۃ واقعی صلوٰۃ لگ رہی تھی۔

صبح جنجوعہ صاحب کو پیغام بھیجا کہ اب آپ کے شیخ آئیں تو ہمیں بتائیے گا۔ مگر اب کے انتظار اتنا طویل ہو گیا کہ ”ارشاد السالکین“ ذہن میں دھندلانے لگی۔ بالآخر مبینوں بعد ایک دن اچانک پیغام ملا کہ ”شیخ المکرم تشریف لارہے ہیں۔“ مقررہ وقت پہ پہنچ گئی۔ اصل پروگرام غالباً مردوں کے لئے تھا کہ انہیں ہال میں بٹھا کر ہمیں چٹوں کے اس طرف برآمدے میں جگہ دی گئی تھی۔ آج میں پھر لفظ ”بیان“ کے زیر اثر ذہنی طور پر کسی دحوال دھار تقریر کے لئے تیار تھی۔ جس میں جنت کی حوروں پر حریصانہ تبصرہ اور دوزخ کے عذاب کا خوفناک تذکرہ تو ضرور شامل ہو گا۔ مگر بیان شروع ہوا تو عجب ٹھنڈا میٹھا انداز تھا۔ جیسے کوئی جھرمٹاوا دیوں کو غیر محسوس طریقے سے سیراب کر رہا ہو۔ پس پردہ کسے جانے والے الفاظ دل میں اترتے ہوئے نگاہ سے کئی پردے ہٹا رہے تھے بارہا سنی اور پڑوسی ہوئی باتوں کو ایک نیا رخ دے رہے تھے۔ وہ اللہ جس سے زندگی میں شاکہ بھی ہوئے اور شاکر بھی آج اپنا اپنا سالگ رہا تھا۔ خبر تک نہ ہوئی کہ خبر ہونے لگی ہے۔

لیکچر ختم ہوا تو دل پہ دلشیں کیفیت تھی۔ ”کیسا رہا بیان؟“ جنجوعہ صاحب نے ملتے ہی پوچھا۔ ”بیان کہاں وہ تو لیکچر تھا۔“ ہم بے اختیار کہہ اٹھے۔ ماننا چاہا تو پتہ چلا کہ آج خواتین کو وقت نہ مل سکے گا۔ سخت رنجیدہ و کبیدہ خاطر ہوئے کہ اتنے اچھے انسان بھی یہاں ہمارے معاملے میں ڈنڈی مار گئے گویا خواتین کی کوئی حیثیت ہی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو بعد میں خبر ہوئی کہ انھیں گوجرانوالہ سے لاہور لاہور سے

سرگودھا اور سرگودھا سے دارالعرفان ضلع چکوال پہنچا تھا۔ ایک ہی دن میں تین لیکچر! سخت حیرت ہوئی۔ یہ تو کوئی میکانیکی انداز ہوا۔

بہر کیف اگلی مرتبہ چوہدری فقیر اللہ صاحب کے ہاں ملاقات میسر آئی۔ عجب ملاقات تھی۔ چھوٹی چھوٹی عام فہم سی باتیں تمہیں مگر ہر کوئی حسب استعداد انہیں اندر اتار رہا تھا۔

ہم کہ اس دور میں آنکھ کھولنے والے نجانے یہ بدبختی رکھتے ہیں یا خوش بختی کہ جانے پر کچھ بغیر عقیدت وابستہ نہیں کر پاتے اور ہمارا یہ جاننا پر کھنا بھی محض جاننا پر کھنا نہیں ہوتا بلکہ ہم اگلے کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں 'ایک ایک پہلو' ایک ایک بات 'ایک ایک اشارہ ہماری خوردبینی نظر میں ہوتا ہے۔ ہم اپنی اصلاح کر پائیں یا نہیں لیکن اگلا کتنا مصلح ہے! یہ فیصلہ کرتے ہوئے ظالمانہ حد تک نکتہ چیں ہو جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ہمارے نصاب تعلیم و طرز تعلیم اور کچھ سکھاپائے یا نہیں یہ احساس ضرورت دلاتا ہے کہ

ہم ساہو تو سامنے آئے

یا یہ کہ

ہم سے زمانہ خود بے زمانے سے ہم نہیں

وغیرہ وغیرہ۔

اور اس دن ہم نے بھی ان تمام وضائف و اوصاف سمیت اس ہستی کو دیکھا پر کھا۔ دل میں آنے والا ہر سوال بے دھڑک کیا 'عقل میں نہ آنے والی ہر بات بلا جھنجھک پوچھی اور پھر۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اس علم کے سمندر کے سامنے یہ سرنگوں ہو گیا 'نظر جھک گئی' عقل خاموش ہو گئی اور دل۔۔۔۔۔ دل عقیدت 'احترام اور محبت کے ایسے جذبات سے معمور ہو گیا جن پر دماغ بھی مطمئن و آسودہ تھا'

لفظ 'حضرت جی' جو پہلی دفعہ سننے پہ عجیب سا محسوس ہوا تھا خوبصورت لگنے لگا۔ جیسے دنیا بھر کی محبت اور جہان بھر کا احترام اس ایک لفظ میں سمٹ آیا ہو اور۔۔۔۔۔ اور میں نے حضرت جی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

بیعت ہوئے بمشکل تیسرا چوتھا دن تھا کہ میں نے ایک خواب دیکھا جیسے بہت بڑا میدان ہے جہاں نبی اکرمؐ تشریف فرما ہیں۔ تمام انبیاء کرامؑ و اولیاء کرامؑ قطار در قطار سامنے کھڑے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ صرف انبیاء اس میدان میں موجود ہیں باقی سب لوگ چلے جائیں۔ (آپؐ کے الفاظ کی ترتیب ممکن ہے فرق ہو مگر مفہوم یہی تھا)۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ آپؐ انبیاء کرامؑ سے الگ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ قطار در قطار کھڑے لوگ چھٹنے لگتے ہیں اور اس مقدس ہجوم میں میں نبی اکرمؐ کی طرف بڑھتی ہوں۔ میرے ہاتھ میں رول کیا ہوا سفید کاغذ ہے۔ میں اسے نبی اکرمؐ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتی ہوں کہ "یہ میری جانیدار کے کاغذات ہیں۔ آپؐ کسی ادارے کو دے دیجئے۔" (یہاں میرے دل میں ادارے سے مراد دارالعرفان ہے)۔ آپؐ نہایت شفقت سے 'جیسے کسی بچے سے بات کی جاتی ہے' میرے ہی انداز میں فرماتے ہیں "کس ادارے کو؟" میں کہتی ہوں۔ "کسی بھی ادارے کو" (لیکن اب کے بھی دل میں میری مراد دارالعرفان ہی ہے)۔ اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس وقت تو میں نہیں سمجھ پائی لیکن اسکے پانچ سال بعد جب میں اپنے زمیں دارانہ اور "چودھرانہ" خاندانی پس منظر کے باوجود دارالعرفان پہنچ گئی اور دو سال بعد حضرت جی کے آفس ریکارڈ سے مجھے اس خواب کے سلسلے میں لکھا ہوا اپنا ہی خط حضرت جی نے دکھایا تو جیسے تعبیر میرے سامنے آگئی۔

دارالعرفان باقاعدہ رہائش سے پہلے بھی میں یہاں بارہا آتی رہی 'حضرت جی کی

زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا، جانا، ان کے خاندان سے ملی اور پھر یہاں آکر ۹ سال تک انہیں نہایت قریب سے دیکھنے کے بعد میں یہ ملا یہ کہہ سکتی ہوں کہ ان کی زندگی کا جو پہلو، جس انداز سے پہلی دفعہ میرے سامنے آیا تھا۔ ۹ سالوں پہ محیط غرض نہایت قریب رہ کر گزارنے پہ آج بھی وہ پہلو اسی انداز میں میرے سامنے ہے اور کسی شخص کی تشکلات سے پاک، سیدھی اور سادہ طرز زندگی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی۔

اس تمام تر غرض کے دوران میں نے ان کی زندگی کا ہر رنگ دیکھا۔ غصے کا بھی اور شفقت کا بھی، پیار کا بھی اور درد کا بھی، سختی کا بھی، ہشاشت کا بھی اور اداسی کا بھی۔ ہاں اگر میں نے کوئی رنگ نہیں دیکھا تو وہ ہے نفرت کا رنگ۔ سخت غصے اور ناراضگی میں بھی میں نے انہیں ہمیشہ مخاطب کے لئے ایک نرم گوشے کے ساتھ پایا کہ سخت گرجدار آواز کے پیچھے ان کے دل سے نکلنے والی شفقت بھری دعائیں میرے دل نے سنی ہیں۔ کسی سے بہت رنج ہوئے تو بے نیاز ہو گئے لیکن یہ بہت بڑی کمزوری ہے ان میں کہ اس بے نیازی میں بھی ان کے ہاتھ اس کی بھلائی کے لئے، فلاح کے لئے اٹھے بغیر نہیں رہ پائے۔ ہاں یہاں تذکرہ چل نکلا ہے تو یہ بھی ہتالی چلوں کہ ان کی غصہ بھری ڈانٹ ان کی ناراضگی نہیں ہے۔ یہ تو ایک مالی کی محبت بھری تراش خراش ہے اصل ناراضگی کا رنگ بھی عجیب ہے وہ ڈانٹ رہے ہوں، ڈپٹ رہے ہوں تو یہ ناراضگی نہیں اصلی ناراضگی میں وہ کچھ بھی نہیں کہتے بلکہ جس سے ناراض ہوں وہ سامنے آجھی جائے تو ان کی نظر اس پہ یوں پڑتی ہے گویا ماسپی گھی کا ڈب پڑا ہو۔ ان کے لئے اس شخص کا موجود ہونا یا نہ ہونا یہ ہو جاتا ہے اور ایسا وہ محض ظاہر نہیں کرتے کہ محض ظاہر کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں۔ دراصل وہ قطعی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی انتہائی غلط کام کرنے کے باوجود سچے دل سے

پٹ آیا ہو تو یہی بے نیازی ایسے التفات میں بدلتی ہے گویا کچھ ہو اسی نہیں۔ لیکن لازم یہ ہے کہ آنے والا سچے دل سے لوٹ آیا ہو۔

ایک دفعہ میں نے ایک صاحب کو ایسی غلطی کر کے پلٹے دیکھا جو محض غلطی نہیں اختصار ہے کی کیننگی بھی تھی اور حضرت جی ہیں کہ گویا اس نے کچھ کیا ہی نہیں میرے سامنے اس کے لئے دعا کی تو میں مطمئن ہو گئی اور بالآخر کہہ اٹھی "جی تسلی ہو مئی" فرمانے لگے "کس بات کی؟" عرض کیا "یہی کہ کل کایا اپنے ہاتھوں بھی کچھ بد بھلا ہو گیا تو آپ درگزر کی آخر حدوں کو بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

حضرت جی کی زندگی ہمہ جہت پہلوؤں سے مزین ہے۔ وہ اگر شیخ کی حیثیت سے خلق خدا کو باطنی علوم سے فیض یاب کر رہے ہیں تو عالم دین کی حیثیت سے دین کے ظاہری علوم بھی بہم پہنچا رہے ہیں وہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ ہونے کی حیثیت سے دین کی راہ دکھانے کے ساتھ ساتھ 'الخوان' کے امیر ہو کر دنیا میں دین پہ چلنے کا بھی رستہ و سلیقہ سکھانے کے لئے شب و روز کوشاں ہیں۔

وہ شیخ بھی ہیں اور امیر بھی، مفسر بھی ہیں اور مقرر بھی، عالم دین بھی ہیں اور پرنس مین بھی، شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، مزاح نگار بھی ہیں اور حقیقت نگار بھی، مفکر بھی ہیں اور کالم نویس بھی، سیاح بھی ہیں اور شکاری بھی اور اس سب کے ساتھ ساتھ باپ بھی ہیں اور پوتا بھی، بھائی بھی ہیں اور خاوند بھی، دوست بھی ہیں اور رفیق بھی، اگر ان کی زندگی کے ہر پہلو پہ لکھنے بیٹھوں تو یہ ایک الگ کتاب بن جائے کہ بلاشبہ وہ منزل بھی ہیں اور نشان منزل بھی لہذا میں یہاں ان تجربات پہ بات کروں گی جن سے میں اپنی مختلف حیثیتوں سے گزری۔

دارالعرفان میں، میں محض صفارہ گر لڑبائی سکول کی پرنسپل کی حیثیت ہی سے نہیں رہ رہی بلکہ مجھے حضرت جی کی ذاتی لائبریری سلسلہ کے شعبہ خواتین کی



ذمہ داری کی ساتھ ساتھ ان کا ذاتی کھانا ہانے کا شرف بھی حاصل ہے کہ ذیابھڑ  
 اور کولسروں کے مسئلہ کی وجہ سے انہیں پرہیزی کھانا دیا جاتا ہے۔ اور مجھے ان  
 چاروں شعبوں میں الگ الگ حیرت انگیز تجربات ہوئے۔ جن میں سے سب سے  
 حیرت انگیز تجربہ مجھے باورچی خانے کا ہے۔ گزشتہ تمام تر عرصہ میں، میں نے بارہا  
 آزمایا ہے کہ ان کا کھانا ہاتے وقت اگر بے معنی فضول گفتگو کر بیٹھیں تو کھانا کتنا ہی لذیذ  
 کیوں نہ بنے وہ نہیں کھاتے کھا ہی نہیں پاتے۔ اس صورت میں یا تو کسی سبب وہ  
 سرے سے کھانا کھاتے ہی نہیں اور اگر میز پر آ بھی جائیں تو انہیں اس وقت کا وہ کھانا  
 سخت بے مزہ لگتا ہے خواہ سبھی کتے رہ جائیں کہ سالن مزیدار ہے وہ پہلے لقمے کے بعد  
 دوسرے لقمہ ہر گز نہیں لیں گے۔ ایسے میں وہ چھلے ہوئے پیاز کو میز پر رکھ کر مکہ مار کر  
 توڑ لیں گے اور اس کے ساتھ یا پھر محض لسی کے ساتھ روٹی کھا لیتے ہیں یہ تجربہ  
 اتنی دفعہ ہو چکا ہے کہ اب میں ان کے لئے کھانا ہاتے وقت سبزی کاٹنے سے لے کر  
 ڈوٹے میں سالن نکالنے تک مسلسل درود شریف پڑھتی رہتی ہوں۔

دوسری بات جس نے مجھے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ ان کی مردم شناسی ہے۔ اس  
 معاملے میں مجھے بارہا فرمان خداوندی یاد آیا ہے کہ

مومن کی فراست سے ذرو تحقیق وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے

وہ انسان کو اتنا جان لیتے ہیں جتنا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں جان رہا  
 ہوتا۔ انسانوں کے بارے میں ان کی رائے اس حد تک صائب ثابت ہوتی ہے کہ کبھی  
 کبھی بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ان سے جا کر اپنے بارے میں ان کی رائے پوچھوں کہ  
 خود شناسی کا لاکھ دعویٰ رکھنے کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مجھ سے بہتر جانتے  
 ہیں۔ ہاں یہ عجیب بات ہے کہ اگر کوئی اپنے طور پر انہیں دھوکا دینے کی کوشش  
 کرے (جی ہاں لوگ انہیں بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں) تو وہ خاموشی سے

اس کی بات سنے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بات کر رہے تھے اور وہ مسکرا مسکرا کر سنے جا رہے تھے۔ جب وہ اٹھ کر گئے تو میں بے اختیار کہہ اٹھی "حضرت جی یہ شخص جھوٹ بول رہا تھا" مسکرا کر بولے "جانتا ہوں"۔ عرض کیا "مجھے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ آپ کی معیت نے مجھے یہ شناخت دے دی ہے تو کیسے ہو سکتا ہے آپ نہ جانتے ہوں؟ مگر پھر آپ چپ کیوں رہتے ہیں؟" فرمانے لگے "مجھے حیا آ جاتی ہے"۔ "خواہ اسے شرم نہ آئے" میں نے احتجاج کیا۔ اطمینان سے بولے "وہ اس کا کردار ہے"

وہ غضب کے مردم شناس ہیں جبھی تو انسانی جذبات و احساسات کو جاننے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ وہ ایک عورت کے احساسات یوں جان رہے ہوتے ہیں جس طرح کسی عورت کو جاننا چاہئیں۔ وہ بچے کے جذبات اس طرح تسلیم کرتے ہیں جیسے اسی کے دور میں جی رہے ہوں۔ وہ نوجوانوں کی کیفیات یوں جان لیتے ہیں گویا انھیں کے ہم عمر ہوں اور جوانوں کی خواہشات کو اس طرح مانتے ہیں جیسے اپنی خواہشات کو مانا اور جانا جاتا ہے۔ جبھی تو کسی بھی عمر کے ہم سے کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ وہ دل کے جہاں کو دل کی نظر سے دیکھ لیتے ہیں جبھی تو آپ خوش ہوں یا ادا اس 'مغموم ہوں یا ہشاش ہر حال میں انھیں بہترین ساتھی 'خیر خواہ' دوست اور راہنما پاتے ہیں۔ ان کی معیت میں گزرے ۹ سالوں میں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی انھیں کچھ بتانا پڑا ہو۔ انہوں نے ہر کیفیت کو چرے سے پڑھ لیا ہے۔ انہوں نے میرے دیگر رہائشی شاف ممبرز سمیت ہماری ہر ضرورت اور خواہش کو اسی وقت اور اسی لمحے پورا کیا ہے جس وقت اور جس لمحے وہ زبان سے بھی پہلے ہمارے چرے پہ آتی ہے۔

حیثیت پر نپل صفارہ گر لڑہائی سکول میں نے انہیں بہترین سرپرست اعلیٰ اور باس پایا ہے انہوں نے ادارے کے کسی کام میں نہ تو خود کوئی بے جا بات مجھ پر مسلط کی

ہے اور نہ ہی اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار (خواہ وہ اولاد ہی کیوں نہ ہو) کو مسلط کرنے دی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ میں نے ان کی سگی بیستھیجی کو نوئیں کلاس میں داخلہ کے لئے ناموزوں قرار دے دیا اور مجھ سے کسی نے بھی کسی قسم کی باز پرس نہیں کی۔ ہاں انہیں مجھ سے بہترین رزلٹ دینے کی توقع ہوتی ہے اور سالانہ نتائج میں ایک بھی چہ فیل ہو تو میں اس کے لئے جوابدہ ہوں کہ سال بھر میرے پاس رہ کر بھی چہ فیل کیوں ہوا؟ انہیں لائق 'پر اعتماد' حاضر جواب ذہین اور بھلاش چے بے حد پسند ہیں۔ ان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ادارے کے طلبہ و طالبات پورے پوزیشنز حاصل کریں، تقریری مقابلوں میں پیش پیش ہوں اور اپنی کلاس کے لحاظ سے وہ دینی علوم سے بہرہ ور ہوں۔ بہترین اخلاق رکھتے ہوں۔ جہاں تک ان کی ذاتی لائبریری کا تعلق ہے۔ ان کے پاس کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ہے جس میں تفسیر، فقہ، تصوف، طب، منطق، صرف و نحو، ادب، تاریخ، سیرت، رد فرقہ باطلہ، رد قادیانیت، ملفوظات و مکتوبات، کتب شیعہ، انگریزی کتب، انسائیکلو پیڈیا اور متفرقات کے شعبہ جات شامل ہیں۔

میں نے کتاب کو ان کی بہت بڑی کمزوری پایا ہے۔ وہ کتاب کا ورق موڑنے یا الٹا رکھنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں سے پڑھتے ہوئے چھوڑنا پڑے اس کا صفحہ نمبر یاد رکھو یا پھر وہاں کوئی نشانی رکھ جاؤ لیکن کتاب کو ہر کر کے رکھو کتابوں سے بلاوجہ کی جھجھک چھاڑ یا بے مقصد ورق گردانی بھی انہیں پسند نہیں۔ خود انہیں اردو، فارسی، عربی، پشتو، انگریزی اور پنجابی پہ دسترس حاصل ہے لہذا ان کے پاس ان میں سے ہر زبان کی کتاب موجود ہے جن میں سے اکثریت عربی اور فارسی کی کتب پہ مشتمل ہے۔

وہ علم کا ایک سمندر ہیں اور ہر کتاب کا بحرِ بحرِ اراں۔ میں نے اس در پہ جہاں قلوب کو سیراب اور اذہان کو میدار ہوتے پایا ہے وہاں اجسام کو صحتیاب ہوتے بھی دیکھا ہے۔

اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ شیخ سے محض دنیا کی بات کرنا سنا سے مولیوں کا جروں کے بھاؤ پوچھنے کے مترادف ہے لیکن پھر بھی اثری کمزوری کے تحت دکھوں سے مغلوب بہت سے لوگ بے شمار مسائل اور بیماریوں کے لئے تعویذ لینے پہنچ جاتے ہیں۔

شعبہ خواتین میں یہ تعویذ میں نے اپنے ہاتھوں بہت سی عورتوں کو لا کر دیئے ہیں اور خود اپنی آنکھوں سے کینسر تک کے مریض شفا یاب ہوتے دیکھے ہیں۔ لیکن یہاں دوسروں کے جائے میں اپنا ذاتی تجربہ سنا پسند کروں گی۔ ایک دفعہ مجھے پنٹوں کے شدید کھچاؤ کی تکلیف کچھ اس حد تک ہوئی کہ اپنے ہاتھوں کھانا پینا بھی محال ہو گیا۔ ہر طرح سے علاج کر دیکھا کسی نے نروز (Nerves) کا مسئلہ بتایا اور کسی نے Muscles کا۔ حتیٰ کہ آرٹھرو پیدک سرجن اس نتیجے پہ پہنچا کہ ریڑھ کی ہڈی کے مرے میں نقص ہے۔ یہ سن کر میں زیادہ گھبرائی اور بالآخر حضرت جی سے بات کی۔ انہوں نے ایک میالہ اور کچھ کچھ سفید سا پتھر دم کر کے دیا کہ تکلیف کی جگہ پر پھیرتی رہوں۔ میں جوں جوں پتھر پھیرتی گئی تکلیف رفع ہوتی چلی گئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ پتھر حیرت انگیز طور پر سرخ ہوتا چلا گیا اور بالآخر اس کی رنگت بنیشتی میں تادیر پہنچنے والے پتھر کی سی ہو گئی۔ ہاں اس دوران وہ وقتی طور پر گرم بھی ہو جاتا رہا۔ وہ پتھر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اسے تندرست عضو پہ پھیرو تو جوں کا توں رہتا ہے لیکن تکلیف کی جگہ پر پھیرو تو سرخ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس حد تک افادہ ہو اس حد تک اس کی رنگت بدل جاتی ہے۔

شعبہ خواتین کے حوالے سے یوں تو مجھے بے شمار دلچسپ اور سبق آموز تجربات ہوئے لیکن ان میں سے دو ایسے ہیں جو تادم مرگ بھلانا مشکل ہیں۔ ایک دفعہ ایک لی لی اپنی ایم۔ اے اسلامیات کی طالبہ بیٹی کو لے کر آئیں۔ اُسے جنوں

کی شکایت تھی۔ حضرت جی کا اصرار تھا کہ تعویذوں کے ساتھ ساتھ ذکر الہی کا معمول جاری رکھو لیکن وہ نہ تو تعویذ باقاعدگی سے پیتی تھی اور نہ ہی ذکر کرنے پر آمادہ تھی۔ اس پر ایک روز حضرت سخت خفا ہوئے کہ خدا کے لئے نہ سہی اپنے لئے ہی اسے یاد کر لیا کرو۔ وہ واپس گئیں اور اگلے ہی دن انہوں نے میرا دروازہ آنکھٹایا۔ دسمبر کی صبح کے چھ بجے کا وقت تھا۔ میں گھبرا کر اٹھی تو آگے خاتون کو سخت پریشان کھڑے پایا۔ کہنے لگیں۔ ”میری بچی کو جن انٹھا کر لے گئے ہیں۔“ میرے لئے یہ ناقابل یقین اور ناقابل فہم قسم کی بات تھی۔ اس نے قسمیں کھا کر کہا کہ جی غسل خانے میں نہانے گئی۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد دروازہ توڑ کر دیکھا تو غائب تھی۔ وہ غریب بڑی طرح رو رہی تھی کہ خاندان، محلے اور علاقے میں کون مانے گا کہ جی اس طرح غائب ہوئی ہے! بہر کیف حضرت جی کو اطلاع کی۔ فرمانے لگے۔ گھر جاؤ وہ چھوڑ جائیں گے لیکن پھر فوراً یہاں آنا کہ اس چار دیواری میں انسان جنوں تک سے محفوظ رہتا ہے اور اس کا ہفتہ بھر یہاں رہنا ضروری ہو گا۔ اگلے دن وہ ماں بیٹی آگئیں۔ بیٹی سے تو بات کرنے کی مجھے جرات نہ ہوئی لیکن ماں نے بتایا کہ اسکے گھر جانے پہ کال میل جی۔ دروازہ کھولا تو ایک بڑی سی چادر میں لڑکی کو گھڑوی کی صورت میں باندھا ہوا پایا۔ اسکے بعد انہوں نے ذکر اور تعویذوں میں ناغہ نہ کیا اور ٹھیک ہو گئی۔

دوسرا واقعہ نوعیت کے لحاظ سے کچھ عجیب سا ہے۔ سالانہ اجتماع تھا میں خواتین کا پیریڈ لے کر اٹھی تو ایک تقریباً ساٹھ سالہ خاتون نے مجھے روک لیا اور حضرت جی سے کچھ وقت لے کر دینے کی درخواست کی۔ میں نے کہا کہ اجتماع پہ وہ وقت ہرگز نہ دیں گے کہ یہ مکمل طور پر روحانی تربیتی کورس ہے۔ اس میں وہ دنیوی مسائل نہیں سنتے۔ وہ خاتون مجھے ایک طرف لے گئیں اور 1200 روپے

دے کر بولیں ”یہ فنڈ کے لئے حضرت جی کو دینا اور وقت کی بات ضرور کرنا“۔ عرض کیا ”جی ر قم تو پچھا دوں گی لیکن وقت ملنا محال ہے“۔ کہنے لگیں ”آپ یہ پیسے دے کر بات تو کریں“۔ مضموم یہ تھا کہ وہ خوش ہو کر بلا لیں گے اور مسئلہ سن لیں گے۔ ایک لمحے کو تو مجھے آگ سی لگ گئی اور دل چاہا کہ کچھ سناڑالوں۔ لیکن انہوں نے بات واضح نہ کی تھی لہذا یہ بڑا سا گھونٹ بھر کر پلٹ آئی۔ میں نے وہ ر قم دینے سے پہلے خاتون کا نام لینا چاہا تو حضرت نے بے نیازی سے فرمایا ”جس کسی نے بھی دیئے ہیں اللہ کی راہ میں دیئے ہیں تعارف کی ضرورت نہیں“۔ میں نے ر قم تھما چاہی تو فرمایا ”میرے آفس میں احمد نواز کو دے آؤ“۔ اس کے بعد خاتون کے لئے وقت مانگا تو انہوں نے ایک سنجیدہ سی نظر مجھ پر ڈالی عرض کیا کہ ”میں نے تو خاصا سمجھنا چاہا کہ اجتماع میں وقت نہیں مل سکتا لیکن انہیں شاید کچھ شدید نوعیت کی پریشانی ہے“۔

فرمانے لگے ”میرے دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ یہ خواتین فضول دنیوی مسائل میں خود کو الجھا کر اپنا اور میرا وقت بھی ضائع کرتی ہیں۔ ان سے کوئی ٹھکر جا کر خط لکھ دیں“۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ پورا ہفتہ خواتین کو اجتماعی طور پر حضرت کو سلام کرنے کا موقع بھی ملا تو وہ خاتون اس وقت پر یا تو اتفاقاً ہاتھ روم میں تھیں یا پھر باہر۔ وہ ملنا تو دور کی بات حضرت جی کو دیکھ بھی نہ پائی اور اجتماع کے کچھ عرصہ بعد ان کی وفات کی خبر سن لی گویا مرتے دم تک انہیں حضرت کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

اس سب کے باوجود میں ایک بات ضرور کہوں گی کہ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ اتنے عرصہ سے شیخ المکرم کے پاس ہیں ان کی کوئی کرامت سنائیے تو میں یہ کہتی ہوں کہ میرے شیخ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ میں نے یہاں لوگ بدلتے دیکھے ہیں آج سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں جو امیر جماعت یا صاحب مجاز کی حیثیت سے لوگوں کی راہنمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کی گزشتہ زندگیاں دیکھیں

تو پتہ چلتا ہے کہ میرے شیخ نے لوگوں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں بٹھا دیا ہے۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

تصوف جسے خود میں بھی مافوق الفطرت اور پراسراریت سے بھرپور شعبہ سمجھا کرتی تھی اپنے اللہ کو جاننے، اسکے قریب جانے کا سب سے آسان، سیدھا اور سچا راستہ دکھائی دینے لگا ہے۔ زندگی جو محض پیدا ہو کر کھا، پی کر مر جانے کے تصور سے عبارت تھی، کسی کو کھوجنے، ڈھونڈنے، پانے اور پھر اسی کے نام پہ مر جانے کا نام دکھائی دینے لگی ہے۔ سانس! جو محض آکسیجن و کاربن ڈائی آکسائیڈ کے دخول و خروج کا نام تھیں کسی کی یاد کی خوشبو میں رہنے لگی ہیں۔ دل محض، سپہنگ مشین ہی نہیں کسی کا مسکن لگنے لگا ہے۔

”اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے“ قسم کے احساسات ”بھجے اور پھر پاس بلائے جانے“ کے فخر میں بدل گئے ہیں۔ روم کا گہرائیوں اور قلوب کا پنہائیوں تک بدل جانا اور بدل ڈالنا ہی تو اصل کرامت ہے

اس سے بڑی کرامت اور کیا ہوگی؟



بابِ عمل



## تنظیم الاخوان

سب سے پہلے اپنی ذات پر نفاذ اسلام اور اسے ایسی  
اسلامی ریاست بنانا جس پر اسلام کی حکومت ہو!  
پھر اس حکومت کی سرحدیں اپنے خاندان، دوست  
احباب اور اپنے متعلقین تک وسیع کرنا!  
پھر وطن عزیز پر غلبہ اسلام کے لئے میدانِ عمل میں  
اترنا اور تن، من، دھن کی بازی لگانا:  
پھر اسلام کو روئے زمین پر غالب کرنے کی جدوجہد  
میں ”غازی یا شہید“ کے جذبہ سے کود پڑنا!

## تنظیم الاخوان کا تعارف!

امیر الاخوان کے اپنے الفاظ میں! (سلسلہ کے ساتھیوں سے خطاب)  
حقیقت میں تو اس تحریک کی بنیاد ۱۹۵۲ء میں اس وقت پڑی جب اللہ کے ایک  
مہرگزیدہ نے پہلے شخص کو یوں دعوت دی کہ ”آؤ! میں تمہارے قلب کا تزکیہ  
کروں“ اور جب حلقہ احباب بننے لگا تو اپنی رائے کا یوں اظہار فرمایا ”میں سگریزے  
اکٹھے کر رہا ہوں۔ ان ہی سگریزوں میں سے لعل و جواہر نکلیں گے جو امت محمد صلی  
اللہ علیہ وسلم کی تقدیر بدل کر رکھ دیں گے۔

اس وقت سے تزکیہ و تربیت کا عمل جاری ہے۔ ان کے اکٹھے کئے ہوئے  
سگریزے تربیت کی بینشی سے نکل کر ہزاروں کی تعداد میں لعل و جواہر بن کر  
میدان عمل میں آگئے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟

محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے جاں نثاروں کی جس  
جماعت کی تشکیل فرما کر کفر کو اسلام میں بدلا اور اللہ تعالیٰ کے نظام کو قائم کیا، یہ  
گروہ ان ہی کے نقش قدم پر چلنے، وہی جذبات، وہی عشق رسول، اسلام سے وہی  
والہانہ وابستگی کے ساتھ، کفر کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے نظام کو خدا کی زمین پر  
دوبارہ قائم کرنے کی دیوانگی سے سرشار صوفیاء کا ہے، یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جن کو

اپنی ذات کے لئے کسی دھن و دولت یا شہرت کی تمنا نہیں۔ کسی اقتدار، کسی کرسی کی خواہش نہیں۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اتنی چھوٹی، معمولی اور وقتی خواہشوں سے بہت بالاتر ہیں۔ اسلام کو قائم کرنا، اسلام کو قائم رکھنا اور اسلام کو اس کرہ ارض پر غالب کرنا ان کا مقصد حیات ہے۔ اس کے سوا کسی اور مقصد کے لئے زندہ رہنا ان کی لغت میں نہیں۔

تنظیم الاخوان دوسری تنظیموں اور تحریکوں کے مقابلے میں کئی منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں ہر مکتب فکر کے علماء صوفیاء اور دانشوروں کے علاوہ دنیاوی علوم و فنون کے ہر شعبے کے ماہرین، صنعت و تجارت سے وابستہ افراد اور زندگی کے ہر کام اور شعبے سے وابستہ ہر درجے کے لوگ جو رزق حلال کماتے ہیں۔ شامل ہیں۔

الاخوان کے تمام ذمہ دار ارکان، موجودہ دور کے ہر سیاسی نظریے، جماعتوں سماجی اور معاشرتی اور مذہبی فرقہ بندیوں سے آزاد ہیں۔ اللہ اور اس کی وحدانیت پر، محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت، ان کے اسوۂ حسنہ سے ان سے جاری برکات اور فیوضات پر، قرآن، قرآن کے تمام احکامات پر اور قرآن کے دیئے نظام حیات پر، باعمل ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی مکرانی کو اس کرہ ارض پر قائم کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کئے ہوئے ہیں۔

ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ روئے زمین پر بے شمار وسائل کے باوجود مسلمانوں کے پاس ایک گاؤں بھی ایسا نہیں جہاں اسلام نافذ ہو۔ اس تحریک کی بنیاد ہی یہ ہے کہ جہاں بے شمار کفرستان نظر آتے ہیں۔ وہاں کم از کم ایک ”اسلامستان“ بھی ہونا چاہئے جو مخلوق عالم کے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھے کہ وہ خواہ چند افراد ہوں، ایک گاؤں ہو، ایک شہر، ایک بہت بڑا ملک ہو۔ یا ساری دنیا ہو۔ سب سے پہلے ہمیں

مسلمانوں کے ذہن سے اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے، اسلام کو کسی نوبہ انسان سے کوئی خطرہ نہیں۔ ہم جو خود کو مسلمان کہتے ہیں اس وقت ہماری بقا خطرے میں ہے اور ہم اسلام کی پناہ کے محتاج ہیں۔ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ ”وہ اپنے دین کو رسوا نہیں کرتا۔ جو لوگ رسوائی قبول کر لیتے ہیں اللہ ان سے اپنا دین ضبط کر لیتا ہے۔ مسلمانوں نے یہی طرزِ تغافل اپنایا تو تمام مسلمان ریاستیں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئیں۔“ ایک بار پھر جب مسلمان اسی طرزِ تغافل کا شکار ہوئے تو انگریز نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کی مرکزیت ’ان کی خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔“ ہم جو صدیوں سے مسلمانی کے دعوے دار ہیں لیکن اسلام کے جائے کافروں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ تو کافروں کے دامن میں پناہ لینے والوں کو اللہ اپنی سرزمین پر پناہ نہیں دے گا۔ اسے ایک بار پھر کفار کے ہاتھوں تباہ کر دے گا۔ اس لئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنے اس رویے پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ یہ ہمارا فریضہ دین ہے کہ ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کو بیدار کریں اور اس رویہ کو تبدیل کرنے کے لئے تیار کریں۔

مسلمانوں کو ایک بہت بڑا مغالطہ دے دیا گیا ہے کہ مذہبی اور دین دار لوگوں کی جگہ صرف مسجد ہے ان کو دنیا کے معاملات، سیاسیات اور حکومت سے کیا واسطہ..... رسول اللہ ﷺ نے ریاست بنائی۔ قانون نافذ کئے۔ بادشاہوں سے معاملات کئے، صلح و جنگ کے معاہدے لکھے۔ ’منش نفیس جہاد کئے۔ پوری بھر پور سیاسی زندگی گزار کر معاشرے کو اسلامی ریاست دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا دین دار کون ہو سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ سے ہٹ کر مذہب اور دینداری کا دعویٰ کیا؟ مسلمان کے ذہن سے دین کے جامد اور محدود و مذہبی تصور کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اور اسے اسلام کے حقیقی ’جامع‘، عملی اور متحرک

تصور میں بدلنا ہے۔

”یہ ہمارا فریضہ دین ہے۔ اور ہماری دینی زندگی کا مدار اسی پر ہے کہ ہم کم از کم اس ملک خدا داد کو اسلامی ریاست بنائیں۔ حکومت ہمارا مقصد نہیں کہ کس فرد کو ملے۔ آپ کو ملے اس سے ہماری غرض نہیں۔“ ہم ایک اسلامی ریاست کا قیام چاہتے ہیں۔ جہاں اسلامی قوانین پر عمل ہو اور اسلام کو عملی طور پر اس زمین پر رائج کریں۔

اسلام کو مغرب والوں کی نظر سے مت دیکھئے۔ یہود کی نظر سے مت دیکھئے۔ انسان کی نظر سے دیکھئے۔ اپنی نظر سے دیکھئے۔ لاؤڈ سپیکر کی گونج میں تلاش کرنے کے جائے اپنے دل میں جھانک کر تلاش کیجئے۔ دور حاضر کے خطیب کے من پسند موضوعات 'قبر و غضب جنم کے شعلوں میں جلتے جسم اور' ایسے اور خوفناک مناظر' میں اللہ کو ڈھونڈنے کی جائے مسلمان کے قلب کی گہرائیوں میں ڈھونڈئیے۔ اسلام کا اللہ تو بہت ہی رحیم ہے۔ بہت ہی کریم ہے۔ سراپا محبت ہے۔ پیار کرنے والا ہے۔ انسان اس کی ایک شاہکار تخلیق ہے وہ اپنی اس تخلیق کو پھوٹا پھلتا 'ہنستا کھیلتا اور خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے اپنی مخلوق کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنا بہترین اور پسندیدہ نظام ”اسلام“ دیا۔

اللہ ہمیں اس کی توفیق دے ہم نے اس جہاد کی ابتدا کر دی ہے۔ اب ہم ہی وہ لوگ ہیں جن کو نہ صرف اللہ کے نزدیک سربلندی نصیب ہوگی بلکہ تاریخ بھی بد توں یاد رکھے گی۔ کہ کچھ لوگوں نے کفر کی تباہی کی طرف کدال اٹھائی تھی اور بالآخر ظلم کا بہت بڑا سمار ہو کر رہا۔ اب میں آپ کو حضرتؑ کے حوالے سے جماعت اور تنظیم الاخوان کے باقاعدہ آغاز کے بارے میں بتانا چاہوں گا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ امت مسلمہ کے پاس یہ کمال ہمیشہ رہا ہے کہ ان

کا اپنے نبیؐ سے رابطہ کبھی منقطع نہیں رہا۔ ہر عہد میں ایسے لوگ رہے جنہوں نے قرآن کا معانی اور ترجمہ نبی کریمؐ سے پڑھا ایسے لوگ رہے جنہوں نے احادیث کی شرح خود نبی کریمؐ سے حاصل کی اور بالجماع امت اولیاء اللہ کا کشف برحق ہے۔ نبی اور ولی کے کشف میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نبی کو غلطی نہیں لگتی ولی کو غلطی لگ سکتی ہے۔ اس لئے ولی کا کشف محتاج ہوتا ہے نبی کے ارشادات کی حدود کا۔ اگر آپؐ کے حکم کے مطابق ان حدود کے اندر آپؐ ہی کے کسی حکم کی وضاحت ملتی ہے تو صاحب کشف مکلف ہے اس کشف کو ماننے کا دوسرا نہیں۔ لیکن خود صاحب کشف نہ مانے تو نہ صرف گناہگار ہو گا بلکہ اس پر عذاب بھی وارد ہو گا۔ نبی کا کشف جو ہوتا ہے وہ وحی الہی ہوتا ہے پوری امت مکلف ہوتی ہے اس کو ماننے کی اور نہ ماننے والا فاسق و فاجر کہلاتا ہے، ولی کا کشف الہی اپنی صحت کے لئے نبی کے ارشادات کا محتاج ہوتا ہے صاحب کشف کے کشف پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نہ مانیں تو اس پر دنیا میں عذاب آجاتا ہے دنیاوی مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں دنیاوی نقصانات ہوتے ہیں آخرت کا معاملہ رب کریمؐ کے پاس ہے لیکن دوسرے لوگوں کی پسند پر ہوتا ہے کہ وہ اس کیساتھ تعاون کرتے ہیں اس کے کشف کو ماننے ہیں یا نہیں مانتے مگر۔ نبی (کے کشف) کی طرح ولی کے کشف کو ماننے کے محتاج نہیں ہوتے ہیں۔

نبی اکرمؐ جب کسی کو پسند فرماتے ہیں تو ان حدود شریعہ کے اندر جو متعین دے شدہ ہیں کسی کام کو کرنے کا حکم اپنے امتیوں کو اب بھی دیتے ہیں امتی اسی پر عمل بھی کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔

اس ضمن میں مصر کے حکمران نور الدین زنگی کا واقعہ کون نہیں جانتا۔ جسے آپؐ نے خواب میں اپنی زیارت سے مشرف فرما کر ان دو عیسائی مشرکوں کی نشاندہی کی جو آپؐ کی قبر کھودنے کا شیطانی منصوبہ لے کر مدینہ آئے تھے آپؐ نے نور الدین

جی کو نہ صرف ان کی نشاندہی کی بلکہ حکم دیا کہ فوراً جاؤ اور انہیں کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کسی کام کرنے کا حکم اب بھی اپنے امتیوں کو دیتے ہیں اور اسے پسند بھی فرماتے ہیں۔

حضرت شیخ نے اپنی تعلیم بڑے کٹر قسم کے دیوبندی استاد سے مکمل فرمائی اور بڑے سخت قسم کے مضیان کرام تھے، حتیٰ کہ آپ کے اساتذہ میں مفتی کفایت اللہ دہلوی مرحوم شامل ہیں جو پورے برصغیر کے مانے ہوئے مفتی تھے۔ اور بڑے سخت قسم کے لوگ تھے اور بڑے سخت مواحد اور رسومات اور بدعات کے خلاف ان کا رویہ اتنا سخت تھا کہ جو خود صوفی نہیں تھے اور صاحب کشف نہیں تھے وہ تصوف کے خلاف کام کرتے تھے، تصوف کو بھی ایک رواج یا ایک خرابی کا سبب سمجھتے تھے اس لئے کہ تصوف کے نام پر جلسازی بہت ہو گئی تھی اور حضرتؒ بھی ان متشددین میں سے تھے جو صوفیوں اور تصوف کے خلاف رہے۔ کسی کام کے سلسلے میں آپ ایک جگہ تشریف لے گئے وہاں حضرت خواجہ عبدالرحیمؒ سے آپ کی ملاقات ہو گئی انہوں نے فرمایا کہ میں عالم تو ہوں نہیں لیکن بات چل رہی تھی فرمایا برزخ کی حیات کی، اور اہل قبور سے بات کرنے کی تو انہوں نے کہا بینشی مولانا آپ (حضرتؒ) اس موضوع پر دلیلیں دے رہے تھے کہ یہ ممکن نہیں ہے، برزخ ایک الگ جہان ہے الگ دنیا۔ دنیا والوں کا برزخ والوں کے ساتھ کیا تعلق انہوں نے کہا یار میں مولوی تو ہوں نہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے شیخ جو ہیں وہ دفن ہیں میں دنیا میں زندہ ہوں میں تو ساری باتیں ان سے پوچھ کر، کرتا ہوں اور وہ سارے معاملات میں رہنمائی فرماتے ہیں مجھے سبق بھی پڑھاتے ہیں مجھے اللہ اللہ بھی سکھاتے ہیں مجھے مراقبات بھی کرواتے ہیں آپ کہتے ہیں ایسا ہو نہیں سکتا اب جو ہو رہا ہے میرے ساتھ اس کا انکار میں آپ کی دلیلیں سن کر کیسے کروں، یہ اتنی وزنی دلیل تھی

کہ اس نے حضرت ”جیسے عظیم اور مضبوط انسان کو ہلا کر رکھ دیا کہ مدہ جموٹ بولنے والا نہیں ہے اور یہ جس سادگی سے اور جو کچھ کہہ رہا ہے اسے رد کرنا آسان نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بابا جی اگر آپ کو ہو سکتا ہے تو پھر مجھے بھی ہونا چاہئے میں بھی تو امتی ہوں اس نے کہا کہ مولانا آپ بھی آجائیں آپ بھی کریں اللہ اللہ آپ کو بھی ہو سکتا ہے، یہ تھی آپ کی ذکر الہی کی اہم اور پھر جیسا کسی کا مزاج ہوتا ہے سخت مزاج لوگ کسی کام کی طرف جب لگتے ہیں پوری سختی سے لگتے ہیں آپ نے جب شروع کیا تو پندرہ سال تک سوائے ذکر اذکار کے آپ نے کوئی کام نہیں کیا رات رات بھر دن دن بھر شیخ کے پاس رہنا تین تین مہینے چھ مہینے رہنا خود تین مہینے بعد گھر کا چکر لگایا زمین دار تھے زمین سے آمدن آجاتی تھی دال روٹی چلتی تھی پھر چلے گئے۔ ۱۵ سال اس حال میں گزر گئے آپ صاحب حال ہو گئے صاحب مشاہدات ہو گئے مکاشفات ہو گئے ۱۵ سال بعد آپ اپنے گھر اپنی مسجد میں آئے، لیکن وہاں بھی رویہ وہی تھا جیسے شیخ کے پاس رہنے میں تھا۔ تب آپ فرماتے ہیں بارگاہ نبوی میں شام کے ذکر کے بعد میں حاضر ہوا دربار نبوی لگا ہوا تھا، فنا فی الرسول کی جیسے معمول کی حاضری ہوتی ہے نبیؐ نے مجھے مخاطب نہیں فرمایا لیکن میں حاضر کھڑا تھا میں سن رہا تھا اور حضورؐ شکایتا فرما رہے تھے اور یہ آپ کی عادت مبارکہ دنیاوی حیات میں بھی تھی کہ جب کوئی بات کسی کی پسند نہیں آتی تو عموماً ساری مجلس سے خطاب فرما کر بات کرتے تھے کہ یا یہ بات اچھی نہیں کسی ایک آدمی کو حضورؐ نامزد نہیں فرماتے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا یہ آپ کا مزاج عالی تھا یہ کرم تھا آپ کے مزاج میں غفود در گزر تھی کہ ایک مدہ شرمندہ نہ ہو یا اس پر بوجہ نہ آئے، تو ایک اجتماعی صورت میں آپ ارشاد فرماتے ہیں اور وہ مدہ محسوس کر لیتا تھا کہ قبور مجھ سے ہوا ہے، تو حضورؐ فرما رہے ہیں تب ملک تقسیم ہو گیا تھا اور بڑا زور تہذیبیت کا یہ ملکی تاریخ کا حصہ ہے میں



اس میں پڑنا نہیں چاہتا لمبی بات ہو جائے گی، تو شیعہ کے بڑے مقالے بڑے نامور علماء بڑے چلے بڑی اخباریں بڑا سب کچھ ہو رہا تھا اور اہل سنت کی طرف مقابلے کے کوئی خاص لوگ نہیں تھے، سستی تھی تساہل تھا سیٹمنٹ ہو رہی تھی، مہاجر آرہے تھے کہیں جگہ مل رہی تھی کوئی اپنے کام میں لگے ہوئے تھے تو آپ فرماتے ہیں میں بارگاہ نبویؐ میں حاضر تھا اور حضورؐ فرما رہے ہیں کہ یہ جو اسلام ہے اگر یہ ایک عمارت ہے تو اس میں اینٹیں پتھر نہیں لگے بلکہ میرے صحابہ کی ہڈیاں ہیں اس میں مٹی اور پانی کا گارا نہیں لگا بلکہ میرے صحابہ کا گوشت اور ان کا خون جو ہے اس کا گارا لگا ہے تب یہ عمارت جا کر بنی ہے آج لوگ سر عام میرے صحابہ پر طعن کرتے ہیں ان کی توہین کرتے ہیں انہیں مرتد بتاتے ہیں انہیں کافر کہتے ہیں اور علماء گوشہ نشین ہیں اور ذکر اور مراقبے کرتے ہیں کہ ہمارا کشف خراب نہ ہو لیکن یہ یاد رکھیں کہ کل میدان حشر میں انہیں میرے سامنے بھی آنا ہے مجھے اپنے صحابہ کی عزت سے کسی کا کشف زیادہ عزیز نہیں ہے، یہ وہ دن تھا جب ایک عالم جو سارا میدان چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا وہ اپنا گوشہ چھوڑ کر میدان میں اتر آیا اور پھر پوری زندگی آپ نے وصال تک ۸۷ برس کی عمر تک وحیل چیز پر بیٹھ کر بھی کام کیا، لوگوں سے ملے مناظرے کئے مقابلے کئے چلے کئے ساری ساری رات معمولات ہوتے تھے ذکر اذکار ہوتے تھے سارا سارا دن چلے ہوتے تھے سفر ہوتا تھا ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری سے تیسری جگہ اور زمانہ ایسا تھا ہر جگہ کنوئیں نہیں ہوتی تھی پیدل جایا کرتے تھے ہم، پھر لڑائیاں ہوتی تھیں مقابلے ہوتے تھے تحفظ نہیں ہوتا تھا آج کل کی طرح اپنا حفاظت کا ذمہ اللہ کے سپرد اور خود کرنا پڑتا تھا، غریب لوگ ہوتے تھے اہل سنت جو بلاتے تھے اور کھانے کو نہیں دے سکتے تھے کرایہ نہیں دے سکتے تھے ان حالات میں بلکہ ایک دن ایک مناظرے میں حضرت اور میں صرف ہم دو، دہے گئے

ان کے پاس دو ہمدوں کے لئے کھانا دینے کا انتظام نہیں تھا انہوں نے کہا حضرت آئے تو ہم انتظام کر لیں گے اور آپ کیلئے گاؤں سے مانگ لیں گے کوئی دال دے جائے گا تو ہو جائے گا گزارا اور نہ بستر تھا نہ چارپائی تھی کچے فرش پر میں نے رات گزاری اور حضرت کو ایک چارپائی میا ہوئی صبح بہت بڑا معر کے کا جلسہ تھا وہ جلسہ کیا فارغ ہوئے جب باہر نکلے تو بس کے اڈے پر کرایہ کے لیے گاؤں کے لوگوں نے مل کر بیس روپے ہمیں دیئے حالانکہ وہاں آنے جانے کا کرایہ خرچہ اس سے زیادہ تھا انہوں نے پکڑائے میں نے لے تو لئے خاموشی سے لیکن مجھے پسند نہیں آئی بات کہ یار بھو کے بھی رہے سونے کو بھی جگہ نہیں ملی کرایہ بھی پلے سے دو کیسے گزارا ہوگا، تو جب بس چل پڑی اور وہ لوگ چلے گئے تو حضرت نے مجھے فرمایا کہ تیرے چہرے سے ناگواری نظر آتی ہے لیکن ان کا احسان ہے کہ وہ بیس روپے دے گئے ہم نے ان کے باپ کا کام نہیں کیا یہ کام ہماری ذمہ داری ہے یہ ہمارے ذمہ لگا ہوا ہے یہ نبی کریم کے حکم سے ہم کر رہے ہیں یہ کام ہمیں کرنا ہے اگر وہ بیس ہمیں نہ بھی دیتے تو بھی ہمیں کرنا تھا، تو یہ قوف ہے شکر کر بیس روپے تو دے دیئے کچھ تو کام ہو گیا کچھ تو مدد کر دی انہوں نے۔ ہمارا یہ طریق کار تھا، بارگاہ نبویؐ سے یہ سلسلہ چلنے کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ لوگ اب باتوں سے تحریروں سے اور تقریروں سے گزر چکے ہیں اب اعلان کر دیجئے اور جو آئے اسے اللہ اللہ سکھائیے شاید یہ لوگوں کی اصلاح کا سبب بن جائے۔

لوگ اللہ اللہ کرتے تھے لیکن ان میں تبدیلی نہیں آئی، تب یہ اذن عام ہوا حضرت نے جلسوں میں اعلان فرمایا جماعت کی تشکیل ہوئی پھر سالانہ اجتماعات شروع ہوئے تب سے لیکر اب تک کے حالات ساتھیوں کے مشاہدے میں ہیں سب کے علم میں ہیں اور جتنے اہم فیصلے ہوئے مثلاً بیعت ظاہری نہیں ہوتی تھی 78

کے آخر میں یا 79 میں یہ بات پیش کی گئی کہ لوگ جاہلوں بدکاروں اور رواجی پیروں کی بیعت کر لیتے ہیں پھر اس میں پھنسے رہتے ہیں تو ظاہری بیعت بھی کرانی چاہئے خود ہم لوگ جو ۳۰، ۳۱، ۳۲ سے خدمت میں موجود تھے اس زمانے میں ظاہری بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو بیعت ہوئے۔

حضرت جب دنیا سے سفر آخرت کی تیاری فرما رہے تھے تو جو دوست موجود تھے لنگر مخدوم کے اجتماع میں انہیں یاد ہو گا حضرت نے بڑے واضح الفاظ میں فرمادیا تھا کہ میری اور آپ کی یہ آخری ملاقات ہے پھر ہم یہاں جمع نہیں ہوں گے اور میرے بعد جماعت کا نظام اور آپ نے فرمایا تھا کہ (تقریر کی کاپی موجود ہوگی) کہ مشائخ کے حکم کے مطابق جماعت کا نظام ایسے ایسے چلایا جائے گا، اس کے بعد حضرت کا وصال ایک بہت بڑا حادثہ تھا جماعت کے لئے اس تنظیم کے لئے اس سلسلے کے لئے اور آپ کے وصال کے بعد ہمیں بہت سے حادثات کا سامنا کرنا پڑا بہت سے نامساعد حالات میں سے گزرنا پڑا لیکن الحمد للہ رب کریم کا احسان ہے اس نے توفیق بخشی اللہ نے ہمیں ہمت دی ہمارے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی مصیبتیں تکلیفیں اور حادثے ایک ایک کر کے نامراد موجوں کی طرح ہمارے قدموں سے ٹکرا کر واپس جاتے رہے اور الحمد للہ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ روئے زمین پر ایک منظم سلسلہ ذکر موجود ہے دنیا کے ہر گوشے میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اللہ کا نام لے ہی رہا ہے ان سب واقعات میں ایک واقعہ میں خصوصاً عرض کرنا چاہوں گا مسجد نبوی کے مراقبے سے جب ہم فارغ ہوئے دعا ہوئی میں نے عرض کی حضرت مجھے آج جو کچھ مشاہدہ ہوا اسکی وضاحت سمجھ نہیں آئی۔ آپ نے پوچھا کیا نہیں سمجھ آیا آپ کو۔ میں نے کہا ایک جوان آدمی تھا بڑا خوبصورت اور بڑا قیمتی لباس تھا اس کا اور وہ بڑا شور کر رہا تھا اور اجازت لے رہا تھا کہ یا رسول اللہ میری بڑی توجہن ہو گئی ہے اور

مجھے بے دار سوا کیا جاتا ہے مجھے ذلیل کیا جاتا ہے میری مخالفت ہوتی ہے میری اہمیت نہیں رہی آپ مجھے اجازت دیں میں اس ملک سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ تو وہ کون تھا حضرت نے فرمایا کہ آپ کا مشاہدہ صحیح ہے۔ لیکن آپ کو سمجھ نہیں آئی وہ کوئی انسان نہیں تھا وہ اسلام تھا۔ وہ اللہ کا دین تھا جو اس سر زمین سے نکل جانا چاہتا ہے کہ جہاں ایک عام آدمی بھی میری تذلیل کرتا ہے میرے مخالف۔ مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں تو میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ لیکن آپ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ تم انتظار کرو تمہیں یہیں رہنا ہو گا یہ وہ وقت تھا جب جماعت کی تفکیک کے لئے اور ہر آنے والے کو ذکر الہی سکھانے کے لئے حکم ہوا۔ کہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہو جائیں جن کے دل میں اس جانے والے کا واقعی احترام ہو اور اس کو یہاں رہنے کے لئے کچھ دل کچھ سینے کچھ افراد تو میرس آجائیں یہ تھی جماعت کی تفکیک کی بنیاد اور یہ بھی حضرت کے اس مشاہدے پر مبنی تھی اسی سلسلے میں پھر بیعت ظاہری آئی اور اسکے بعد سارے حالات کے آپ بھی گواہ ہیں میرے ساتھ۔ اب جماعت کا جو دائرہ کار ہے وہ اس سے وسیع ہو گیا ہے اور جماعت محض مراقبات اور ذکر اذکار سے نکل کر میدان عمل کی طرف چل پڑی ہے۔ آخر کیوں؟ کیا کسی کے دل میں یہ خیال آگیا کہ وہ اس سے سیاسی فائدہ اٹھائے یا کسی کے دل میں یہ خیال آگیا کہ اس طرح حکومت سے کوئی چندہ یا پیسے وصول کئے جائیں یا اقتدار میں شراکت کی جائے کیا بات ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ اللہ کے رسول نے یہ پسند فرمایا کہ تم لوگ اب اپنی اہم الٰہی تربیت سے نکل کر میدان عمل میں حصہ لو اور اس مسافر کو جسے یہاں قیام کی اجازت دی گئی اسے اس ملک کا سلطان بناؤ اس کا حق ہے اسے یہ زیب دیتا ہے وہ حاکم بن کر رہتا ہے محکوم بن کر نہیں رہتا۔ نہ رہ سکتا ہے۔ دین اللہ کے ارشادات کا نام ہے اور ارشادات الہیہ کا کام حکومت کرنا ہے اپنے آپ کو منوانا ہے کسی کے ساتھ سمجھوتا کر کے رہنا نہیں ہے۔ یہ وہ موڑ تھا

جب جماعت کو الاخوان کے سانچے میں ڈھالا گیا میں حرم بیت اللہ شریف میں حاضر تھا ہم طواف کے بعد سعی کر رہے تھے۔ صفا پر کھڑے ہو کر بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے دعا کی جاتی ہے جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میں نے دیکھا حالانکہ آگے برآمدوں کی ڈاٹیں ہیں ستونوں کے درمیان سے کوئی جھلک نظر آ جاتی ہے بیت اللہ شریف کی۔ لیکن مشاہدات میں مادی چیزیں درمیان سے ہٹ جاتی ہیں۔ ایک نور کی جگہ جو بیت اللہ سے انٹھی ایک شعلہ لپکا جس نے باب فتح پر۔ باب فتح وہ دروازہ ہے کہ جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا تھا تو جس دروازے سے نبی حرم میں داخل ہوئے تھے اس کا نام آج بھی باب الفتح ہے۔ باب الفتح کے اوپر جا کر وہ شعلہ جو چھوٹا سا لپکا تھا ایسے پھیلتا گیا ایسے پھیلتا گیا۔ کہ اسکے اوپر جا کر پورا گلوب بن گیا۔ روئے زمین کا پورا نقشہ بن گیا اس پر۔ اور کسی ہند نور ہاتھ نے سبز جھنڈا لے کر اسکے اوپر گاڑ دیا۔ جس کے اوپر مہر نبوت تھی جھنڈے کے درمیان میں مہر تھی جس پر لکھا ہوا تھا محمد الرسول اللہ میں نے اس سے یہ اخذ کیا۔ یہ جھنڈا ہر جھنڈا اور اس میں مہر نبوت اس جھنڈے کو اٹھا کر روئے زمین پر اسلام کی عظمت کو منوانے کا حکم دیا جا رہا ہے یہ میری سمجھ تھی اسکا شعور رب کریم نے مجھے دیا اور میں نے یہ سمجھا میرا چونکہ یہ مشاہدہ ذاتی تھا اور صاحب کشف اپنے کشف کے ماننے کا مکلف ہوتا ہے جب کہ وہ حدود شریعہ کے اندر ہو اگر حدود شریعہ سے متصادم ہو تو اتباع شریعت کا کیا جائے گا اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسے مشاہدے میں غلطی لگی لیکن حدود شریعہ کے اندر ہی نہیں یہ زمانے کی ضرورت کے بھی مطابق تھا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں ایسے لوگ جنہیں براہ راست کوئی حکم دینا محمد الرسول اللہ پسند فرمائیں تاریخ ساز لوگ ہیں۔ وہ ایسے افراد ہوں گے کہ جنہیں بعد میں آنے والوں کی آنکھیں ترسا کریں گی کہ کاش اس دور سے ملاقات ممکن ہوتی کاش یہ زمانہ ہم نے دیکھا ہوتا یہ معمولی

بات نہیں ہے کہ اس دور کے کسی ہمدے کسی فرد کو محمد الرسول اللہ اتنا شرف بخشا کہ انقلاب زمانہ پر اس سے بات کرنا پسند فرمائیں وہ شخص کیا سمجھتا ہے۔ زمانے کے سلاطین کو، امراء کو، حکومتوں، نظاموں کو، اس کے لئے کیا ہے سپر پاور کون امریکہ ہے یا ریشیا ہے دنیا کی کوئی طاغوتی طاقت اسکے قدموں کی دھول کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی اور نہ ایسا شخص کسی کو پرگاہ کی حیثیت دینے کے لئے تیار ہوتا ہے آپ روئے زمین کی سلطنت ایسے شخص کے قدموں میں ڈھیر کر دیں اسے وہ خاک عزیز ہوتی ہے جو محمد الرسول اللہ کے جوتے کے ٹکڑوں کے ساتھ ہوتی ہے اس کے مقابلے میں اسے دنیا کی سلطنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور جن ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے فانی الرسول کے مراقبات سے نوازا ہے ان کے دل سے پوچھئے کہ بارگاہ نبویؐ کی ایک لمحے کی حاضری سارے جہاں کی نعمتوں پر کتنی بھاری اور کتنی قیمتی ہے میرا اپنا ایمان ہے یہ کہ یہ مہر نبوت والا سبز جھنڈا انشاء اللہ اس ملک پر اس ملک سے باہر عالم اسلام پر اور عالم اسلام سے ہوتا ہوا پوری دنیا پر شان و شوکت سے لہرائے گا اسے کوئی نہیں روک سکتا یہ کسی فرد کی حکومت کے لئے نہیں ہے کسی شخص کے اقتدار کے لئے نہیں ہے کسی ایک جماعت کو چندہ دینے کے لئے نہیں ہے یہ اللہ کی عظمت کے لئے ہے یہ رسول اللہ کے لائے ہوئے ضابطہ حیات کے لئے ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ بڑے صاحب قسمت ہیں وہ لوگ، جو اسکی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے یہ ان کی سعادت ہے اور یہ یاد رکھیے جب کسی کام کو کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے..... جب طے ہو جاتا ہے بارگاہ باری میں کہ یہ کام ہو گا تو پھر صرف اللہ حکم دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے یہ اس کا احسان ہے کہ اپنے کسی ہمدے کو موقع بخشے اور اسے یہ موقع بخشے کہ وہ زندگی کے گناہوں کی تلافی کرنا چاہے تو وہاں اپنی زندگی کو اپنے وسائل کو، اپنی ذات کو، اپنے علوم اور اپنی کوششوں کو قربان کرے

ورنہ وہ قادر ہے۔ یہ کام انشاء اللہ ہو گا خدا نخواستہ ہم نہیں کریں گے تو کسی اور کو توفیق دے دے گا۔ وہ قادر ہے وہ چاہے تو کسی اور قوم کو توفیق دے دے گا اور وہ دیوانہ ہو جائے گی اللہ کی محبت میں..... کسی طعنے دینے والوں کے طعنوں کی پرواہ نہیں کرے گی بلکہ دیوانوں کی طرح نفاذ اسلام کا کام کر گزرے گی۔ موقع ہے مت جانے دو۔ خوش نصیب ہیں آپ لوگ کہ اس زمانے میں فناء نبویؐ آپ تک پہنچانے کے وسائل آپ کو اللہ نے میسر فرمادیئے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اللہ کا کوئی مدد اللہ کے رسولؐ پر جموث بول سکتا ہے جو کچھ میں نے کہا ہے پوری ذمہ داری سے کہا ہے کسی کو سمجھ آئے یا نہ آئے کسی کا کوئی علمی اعتراض اس پر وارد ہوتا ہو تو اسے اجازت ہے اس کی اپنی پسند ہے۔ اس تاریخی حقیقت پر میں جب خود بھی سوچتا ہوں کہ وصال نبویؐ کے بعد ۱۳۰۰ سال بعد یہ خوش نصیب جماعت ہے جسے دربار نبویؐ سے مرنوبت کا پرچم عطا ہوا ہے بڑے بڑے نیک بڑے بڑے بہادر بڑے بڑے جرنیل بڑے بڑے سلطان گزر گئے لیکن مرنوبت کا پرچم صرف ہمارے حصے میں آیا۔ وصال نبویؐ کے بعد آج تک کسی کو خیال بھی نہیں گزرا کسی کے ذہن میں بھی بات نہیں آئی کیا یہ ایک منفرد حقیقت نہیں ہے کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ قافلہ کوئی نرالا قافلہ ہے یہ کوئی انوکھی بات ہے یہ کوئی بالکل الگ سی داستان ہے یہ کوئی عام تحریک نہیں ہے عام مودمنت نہیں ہے کسی مدے کے خلاف کسی حکومت کے خلاف کسی ادارے کے خلاف کسی مولوی کسی عالم کسی پیر کسی رئیس کے خلاف نہیں۔ یہ غیر اسلامی تہذیب کے خلاف اسلام کے جانثاروں کا قافلہ ہے اگر غیر مسلم کو اپنی تہذیب رکھنے کا حق حاصل ہے تو مومن کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ تہذیب کو اپنا کر اس کے دائرہ کار کے اندر زندہ رہے یہ ہمارا حق ہے یہ کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں ہے کسی سے کچھ چھیننا نہیں

ہے۔ بلکہ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اس طرح سے جینیں جس طرح حضورؐ نے سکھایا وہ سیاسی عمل اپنائیں جو خلفائے راشدینؓ نے دیا۔ حضورؐ سے حاصل کر کے ہم وہ طریق معیشت اپنائیں جو محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کو دیا تھا ہماری فوج ہماری عدلیہ ہماری پولیس کا کردار وہ ہو جو خلافت راشدہ میں پولیس کا فوج کا عدالت کا کردار تھا جو اللہ کے رسولؐ نے تعلیم فرمایا جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے۔ کیوں نہ ہو کیا دلیل ہے اس کی کہ ہمیں اس سے محروم رکھا جائے کیوں اسکا مطالبہ ہم نہ کریں اگر یہ نہیں ہوگا تو پھر ہمارے ہونے کا مقصد کیا ہے اگر نہیں ہوتا تو پھر ہم نہیں ہوں گے۔ یہ ضرور ہوگا انشاء اللہ۔ یہ اتحادہ تعارف جو بعض سنجیدہ ذہنوں میں اور بعض مخلص ساتھیوں کے ذہنوں میں ایک مختصہ سا ہے کہ شاید ایک تصوف کی جماعت کو ہم نے سیاست کی راہ پر ڈال دیا ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ جماعت ہماری جاگیر نہیں ہے ہم جماعت کے مالک نہیں ہیں جماعت انہیں کی ہے جنہوں نے یہ موائی ہے جنہوں نے اسے ترتیب دیا اور جو آج تک اس کے امور کی نگہداشت فرما رہے ہیں انہی نے اس کو الاخوان میں ڈھالا ہے میں نے نہیں۔

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں

زبان میری ہے بات ان کی

انہی کی محفل سنوارتا ہوں

چراغ میرا ہے رات ان کی

انہی کا مطلب نکل رہا ہے

انہی کا مضمون انہی کا کاغذ

قلم انہی کا دوات ان کی

ہم تو محض ایک نمونہ ہیں آپ کے سامنے ایک چیز اسی ایک چوکیدار ایک



ہر کارہ جو ایک بار گاہ سے چٹھی یا حکم لے کر اس کے متعلقین تک پہنچا دیتا ہے اور بات ختم۔ کسی کو مراقبات نصیب ہوتے ہیں کسی کو فنا فی الرسول نصیب ہوتا ہے کسی کو فنا پنا نصیب ہوتا ہے کسی کو بیعت نبویؐ روحانی نصیب ہوتی ہے تو اس میں میرا کوئی احسان نہیں میں اپنے پلے سے کسی کو کچھ نہیں دیتا اور نہ میرے پاس دینے کو کچھ ہے دینے والا اللہ اور اللہ کا رسولؐ خود ہیں، لینے والے اللہ کے بندے اور رسولؐ کے امتی ہیں۔ ہم تو ایک ڈاک گھر ہیں درمیان میں، ہم تو ایک چوکیدار یا چڑا سی یا ایک میجر ہیں اور جو وہاں سے آتا ہے وہ آپ کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ آپ کی طرف سے آتا ہے وہ اللہ وہاں پہنچاتا رہتا ہو گا ہم نے کبھی کسی کی بات نہیں کی کوئی ناخوش گوار بات آئے یا خوش گوار۔

ہمیں یہ خبر ہے کہ سرکاری ہر کاروں کو سارے لوگ اچھا بھی نہیں کہتے اور سارے لوگ برا بھی نہیں کہتے۔ جس کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے وہ دعائیں دیتا ہے جس کے خلاف ہو جاتا ہے وہ ناراض ہو جاتا رہتا ہے لیکن ہر کارہ اس کی ناراضگی میں ناراض نہیں ہوتا ہے اسے اپنی نوکری سے کام ہوتا ہے وہ اپنی ملازمت کا ہڈھا ہوا ہوتا ہے وہ اپنے مالکوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے کہ وہاں خیریت رہے باقی سب خیریت ہے۔ سو اپنا اپنا کام ہے سب اپنی ذات کے مکلف ہیں آپ اپنے کام کے مکلف ہیں آپ نے بھی جانا ہے وہیں ہم بھی ہوں گے ہر ایک نے اپنا اپنا پیش کرنا ہے کہ اے اللہ کے نبیؐ میں نے کیا سمجھا کیا سوچا اور کیا کیا۔ میرے پاس یہ آپ سب کی امانت تھی میں نے آپ کو پہنچا دی۔

## الاخوان

الاخوان سلسلہ عالیہ ہے جو کہ بنیادی سلسلہ ہے باقی سب سلسلے اسی سلسلے سے بنے ہیں اور تنظیم الاخوان کا بنیادی مقصد نفاذ اسلام ہے جس کی اپنی شورٹی ہے حضرت صاحب نے الاخوان کو Establish کیا کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ نصف صدی ہونے کو ہے (اب تک یہاں اسلام کا نفاذ نہ ہوا) ملک میں اسلام کا نفاذ کیسے ہو یہ اس کا بنیادی مقصد ہے۔

پہلے گھر پھر شر اور ملک میں اسلامی نظام کے بعد پوری دنیا میں نفاذ اسلام 26 اگست 1993ء کو حضرت صاحب نے عمرے سے واپسی پر لاہور میں اس کی بنیاد رکھی، حضرت عمرے پر گئے اور انہوں نے مہر نبوت کو دنیا کے نقشے پر دیکھا اور انہوں نے واپسی پر الاخوان کی بنیاد رکھی پہلے اجلاس میں تنظیم کا جھنڈا فائنل ہوا اور حضرت کو تنظیم کا امیر مقرر کیا گیا۔ اب پوری دنیا میں اس کی شاخیں ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ الاخوان میں شمولیت کے لئے بیعت ہونا ضروری ہے مگر ایسا نہیں ہے الاخوان کا ممبر ہونے کے لئے حضرت کا بیعت ہونا

ضروری نہیں ہے۔ باقی دنیا میں جہاں جہاں اللہ اللہ کرنے والے ہیں وہاں وہاں  
الاخوان کی شاخیں ہیں پاکستان میں اس کا صدر مقام ہے اس طرح صوبائی سطح پر بھی  
حضرت صاحب کی اپنی ایک شورٹی ہے جس میں ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے  
مثلاً Economist ہیں Politician ہیں پاکستان کے تین Zone ہیں۔

i- Zone سرحد جس میں شمالی علاقہ جات اور جہلم کا علاقہ۔

ii- Zone پنجاب اور کشمیر۔

iii- Zone سندھ میں اور بلوچستان میں۔

الاخوان نے بہت محنت کی ہے جگہ جگہ جلسے کئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ  
آج اسے پاکستان میں نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے ہم حکومت نہیں چاہتے یہ الاخوان کا  
دعوئی ہے۔

حضرت صاحب نے مختلف اوقات میں نواز شریف شہباز شریف لغاری  
بے نظیر گورنرز وغیرہ سے ملاقاتیں کی ہیں تاکہ اپنا پیغام انہیں پہنچا دیں۔

بلکہ یہاں تک کہ راجہ ظفر الحق سود کے بارے میں نظام بنانا چاہتے تھے تو  
الاخوان نے انہیں اسلامی معیشت کا ماڈل بھی بھیجا تھا لیکن ابھی تک نتائج نہیں آئے  
لیکن الحمد للہ اتنے مختصر عرصہ میں الاخوان کو پورے پاکستان میں پہچانا جاتا  
ہے۔ حضرت کی ذات اور الاخوان ایک ہی بات ہے۔ اس کا تعلق سلسلہ عالیہ سے ہے  
اور اس سلسلے کے لوگ تمام پاکستان میں موجود ہیں اس لئے وہ الاخوان کے پلیٹ  
فارم سے جو بات بھی کرتے ہیں وہ پورے ملک میں پہنچ جاتی ہے۔

پیغام تو لوگوں تک پہنچ چکا ہے اب صرف اسے..... موبلائز کرنے کی  
ضرورت ہے لوگوں کا رد عمل مثبت ہے پیغام عوام کو سمجھ آ چکا ہے اور وہ اسے تسلیم  
کرتے ہیں۔

## الاخوان

### سیاسی مقاصد

امیر محمد اکرم اعوان نے 93ء میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ان کا سیاسی نظریہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کو اپنی ذات پر نافذ کیا جائے اور پھر اس کو سب نظاموں پر حکمران بنادیا جائے۔ چونکہ بطور مسلمان ہم مکمل اسلام کو اپنانے کے مکلف ہیں تو پھر اس بات کے بھی مکلف ہیں کہ اسلام کو تمام نظاموں پر حاکم بنادیا جائے۔

اسی ایک مقصد کے تحت انہوں نے الاخوان کے نام سے سیاسی تحریک کی بنیاد رکھی جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں واضح طور پر لوگوں میں اس بات کا شعور پیدا کر دیا ہے کہ صرف عبادات کے سرانجام دینے سے نجات نہیں ہوگی بلکہ اصل نجات تب ہوگی جب تمام نظاموں پر اسلام کو حکمران بنایا جائے گا۔ اب لوگوں میں بہت حد تک اس بات کا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ صرف کوڑے کھانا اسلام نہیں ہے

صرف عبادات کا نام اسلام نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں رائج کرنا اصل اسلام ہے۔

کیونکہ دین اسلام اپنے اندر ایک واضح افادی پہلو رکھتا ہے 'اور اسلام کا افادی پہلو کائنات پر موجود ہر انسان کی جیادی ضرورت عن چکا ہے۔ اسی لئے الاخوان کی تحریک کو بین الاقوامی تحریک کے طور پر مانا جا رہا ہے۔ یہود و ہنود اسکی صرف اس وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ ان ممالک کے عوام اسلام کے اس افادی پہلو سے متاثر ہو کر کیس جمہوریت کے ذریعے ان ممالک میں اسلام نافذ نہ کر دیں۔ چونکہ الاخوان کا مقصد ہی نفاذ اسلام ہے 'تو اسی کے حصول کے لئے اسلامی پارٹیوں سے الاخوان اتحاد کی مقتضی ہے اور صرف اسلام کے نفاذ کے نکتہ پر تمام جماعتوں سے اتحاد کے لئے کوشاں ہے کیونکہ الاخوان کسی حاکم سے دوستی یا دشمنی کی قائل نہیں بلکہ الاخوان ہر اس شخص کو امداد دینے کے لئے تیار ہے جو نفاذ اسلام میں دلچسپی رکھتا ہے۔

..... مولانا محمد اکرام اعوان فرماتے ہیں !!

تحریک تبدیلی نظام کا مقصد صرف یہ ہے کہ وطن عزیز پر نظام اسلام نافذ کیا جائے اور فرسودہ اور ظالمانہ نظام سے اس ملک کی جان چھڑائی جائے۔ تحریک تبدیلی نظام صرف یہ چاہتی ہے کہ اس ملک کو فرعونی طرز حکومت سے نجات دلائی جائے۔ جب ہمارا پیدا ہونے سے مرنے تک سارا نظام اسلامی ہے تو جو نظام سلطنت ہم پر مسلط ہے وہ کیوں نہ اسلامی ہو۔ ہم دنیا بھر کے نظام آزما چکے ہیں۔ ہم نے سوشلزم اپنا کے دیکھ لیا۔ ہم نے جمہوریت کے مختلف روپ اپنائے تو کیا اب ہمارے حکمرانوں کو تجربے کے طور پر اسلامی نظام نہیں اپنانا چاہئے۔ کیا ان کی نظر میں اسلام اس قابل بھی نہیں کہ ایک مسلمان ریاست کے کروڑوں مسلمانوں پر اس کا تجربہ ہی

کر لیں۔ ہم نے حکمرانوں کو بارہا بتایا ہے کہ تحریک تبدیلی نظام وہ پرانا نظام لانا چاہی  
 ہے جو آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ نے دیا۔  
 عدالتی نظام معاشرتی نظام تعلیمی نظام اور معاشی نظام!!!

## الاخوان کا منشور!!

تنظیم الاخوان پاکستان نے خالق اور مخلوق کی طرف اپنی ذمہ داریوں اور قومی یک جہتی کے مکمل احساس کے ساتھ عصر حاضر کے چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے یہ عزم کیا ہے کہ تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے موجودہ سیاسی 'معاشی' عدالتی ' تعلیمی معاشرتی ' زرعی ' صنعتی ' دفاعی ' انتظامی ' اور خارجی نظام ہا کی اصلاح کی جائے اور اس نوآبادیاتی نظام یا اس کی باقیات کو اپنی قومی زندگی کے رگ وریشہ سے اکھاڑ پھینکا جائے!

یوں تو منشور میں بہت سے نکات پر وضاحت سے بات کی گئی ہے جو اپنے اپنے موضوعات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ طوالت کے ڈر سے انہیں مختصر اپیش کر رہی ہوں۔

## سیاسی نظام!

اسلام کو دیگر تمام نظاموں کے مقابلے میں جو انسانوں نے اب تک وضع کئے ہیں، ایک اعلیٰ ترین اور جاپطور پر ایک آفاقی نظام کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اطلاعات و نشریات اور اشاعت کا ایک وسیع اور جامع پروگرام تشکیل دیا جائے۔ جو ایک طرف انسان اور خالق اور دوسری طرف انسانوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کرے، ملک اور بیرون ملک ایسی تمام تنظیموں کے ساتھ روابط کرے جو ان مقاصد کے حصول کے لئے کام کر رہی ہیں۔

## معاشی نظام!!

غیر ملکی قرضوں سے جلد از جلد نجات حاصل کرنے، بالخصوص غیر مسلم ممالک کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے، قومی فنڈ برائے ادائیگی قرضہ جات کا قیام عمل میں لایا جائے۔ قومی معیشت کی بہتری کے لئے اشیائے صرف کی درآمد کو کم از کم سطح پر لانے، غیر ترقیاتی اخراجات کو محدود کرنے، اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر سادگی کو رواج دینے، ٹیکس چوری کو روکنے اور اسکا سراغ لگانے، پبلک سیکٹر میں بھاری انتظامی معارف و تشبیر پر پابندیاں لگانے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

## عدالتی نظام!

ایک مکمل آزاد، منصف اور مستعد عدلیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جو صرف قرآن و سنت کے تابع ہو۔ قاضی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جامعۃ الفقہ الاسلامیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جو روزمرہ قوانین کی تشکیل میں حکومت کی مدد کرنے کے علاوہ قرآن و سنت کی ترویج کے کام میں معاونت کر سکے۔ علاوہ ازیں



ایسے افراد کی تربیت کرے جو قضا کے معاملات میں عدالتوں کی رہنمائی کر سکیں۔ نیز یہ ادارہ عدالتوں کے لئے تربیت یافتہ افراد مہیا کر سکے !!

قرآن و سنت کی روشنی میں عصری مسائل کے حل کی طرف رہنمائی کے لئے ایک دارالاجتہاد کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مقدمات کے پیچیدہ اور طویل طریق کار کو آسان تر بنانے اور عدالتوں کو فوری سماعت کے ذریعے عدل فراہم کرنے کے اختیارات دیئے جائیں !!!

## تعلیمی نظام!

قومی سطح پر تعلیمی انصاب کی تیاری کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے جو ایک سال کے اندر نظر یہ پاکستان کے مطابق تعلیمی انصاب مرتب کرے اور جو پورے ملک میں بلا تخصیص نافذ العمل ہو۔ مہاجد سکول کو جدید خطوط پر استوار کر کے اور دوسرے ممکنہ ذرائع استعمال کر کے سو فیصد خواندگی کا معیار حاصل کیا جائے۔ اساتذہ کو معاشرے میں اعلیٰ مقام دیا جائے اور ان کے حالات کار کو بہتر بنایا جائے۔ موجودہ نظام امتحانات کی بجائے ایسا نظام وضع کیا جائے جس میں طلبہ کی استعداد کو صحیح طور پر جانچا جاسکے اور جس میں کسی قسم کی بدعنوانیوں کی گنجائش نہ ہو۔

## امیر تنظیم الاخوان حضرت محمد اکرام اعوان کے مختلف خطابات سے مختصر اقتباسات !! الاخوان! منزل کی طرف

ہم سب کی بنیادی اور آخری محنت صرف اسلام کے لئے ہے۔ اس سے کسی فرد یا جماعت کی مخالفت مقصود ہے نہ کسی فرد یا جماعت سے تعاون مقصود ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں، کسی پارٹی کی حکومت جائے، کسی پارٹی کی حکومت آئے۔ ہماری ساری محنت اس لئے ہے کہ یہ ملک اللہ کے دین کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس پر دین کے مطابق سلوک کیا جانا چاہئے، خود وہ کسی کو سزائے موت ہی دے لیکن شریعت اسلامیہ کے مطابق دے۔ کسی کو اقتدار دے، اختیار دے، ظالم کا ہاتھ روکے، مظلوم کی دلجوئی، شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو اور یہ بات کرنے میں ہمیں کسی سے کوئی ڈر نہیں، یہ بات کوئی زیر زمین نہیں ہے، کسی کے خلاف کوئی سازش نہیں ہے اور اگر کسی کو یہ بات ناپسند ہے، تو ہوا کرے، اس لئے کہ یہ بات کسی ذاتی منافع کے لئے نہیں ہے، بنیادی اقتدار کی نہیں ہے۔ یہ اللہ اور اللہ کے حبیب

نے تعلق کی بات ہے۔ ایمان کی 'عقیدے کی آخرت کی اور قبر کی بات ہے۔ جس نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا اس نے یہ عمد کر لیا کہ اب یہ جسم کٹ تو سکتا ہے آقا کے پیغام سے ہٹ نہیں سکتا۔

### غزوة الہند!

لوگو! سن لو! الصدق الصادقین آنحضرتؐ کا ارشاد پاک ہے 'میری امت کے آخری زمانے میں دو جماعتیں ایسی ہوں گی جو بلا حساب جنت میں جائیں گی۔ ایک وہ جو غزوة الہند میں حصہ لے گی 'آپؐ نے یہاں "الہند" فرمایا ہے۔ الہند کابل سے لیکر برما تک اور ہمالہ سے لیکر دکن تک برصغیر کا نام ہے 'جس کا مطلب ہے جہاد ہو گا اور نہ صرف پاکستان میں اسلام نافذ ہو گا بلکہ اسکی سرحدیں وسیع ہوں گی اور پورا برصغیر پاکستان ہو گا 'اس پر اسلام کی حکومت ہو گی اور پھر پوری دنیا پر اسلام نافذ ہو گا۔ دوسری وہ جماعت 'فرمایا غنیمت کا ساتھ دے گی اور جہاد کرے گی۔

### اگر ہم ثواب کی حقیقت سمجھیں!

اسلام ثواب کے حصول کا مذہب نہیں ہے 'ہمیں ثواب نہیں چاہیے 'ہمیں اللہ کی رضا مندی چاہیے اور اللہ کی رضا مندی عمل میں ہے 'اس عمل میں جو اللہ کی حاکیت قائم کرنے کے لئے کیا جائے 'یہ نماز 'یہ روزہ 'یہ ذکر اذکار 'یہ تبلیغ یہ تلاوت 'یہ معنی 'یہ تفسیر 'یہ حدیث۔ یہ سب ہمدے کو اس کام کے لئے تیار کرنے کی محنت ہے کہ وہ زمین پر اللہ کی حاکیت قائم کرے۔ اور اگر ہم ثواب کی حقیقت کو سمجھیں تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بدر میں شریک تھے

ان پر جنت واجب ہو گئی۔ شارحین حدیث اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ بدر میں شرکت کا انہیں جو ثواب ملا وہ یہ تھا کہ آئندہ وہ وہی کریں گے جو اللہ کو پسند ہو گا۔ یہ ثواب ہے 'یعنی مزاج بدل گیا' عملی زندگی تبدیل ہو گئی 'توفیق عمل نصیب ہو گئی'۔

## یار ایک کام کرو!

یار ایک کام کرو! اللہ کو اللہ تو آپ مانتے ہو 'الحمد للہ'۔ آپ نبی کو تو مانتے ہو 'الحمد للہ'۔ دین کو دین تو مانتے ہو۔ اللہ قائم رکھئے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تحویزی سی یاری نہ کرو اس کے ہضرات نہیں بنے گی۔ میں نے بد معاشوں کو 'چوروں کو دیکھا ہے یاری پر جان دیتے ہوئے۔

اسلام پر ایمان ہے 'عقیدہ ہے' اعتبار ہے 'یاری نہیں ہے۔ جب تک وہ یاری نہ لگے گی کہ..... حضور فرماتے ہیں مجھے مکے کے وہ پتھر یاد ہیں 'کافرانکار کرتے تھے تو وہ پتھر مجھ پر سلام پڑھتے تھے' مجھے وہ درخت یاد ہیں جنہوں نے میری رسالت کا اقرار کیا 'انہو نے کہا 'تاؤ میری منہی میں کیا ہے تو پتھروں نے کہا 'اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ' یہ کیوں ہٹائیں منہی میں کیا ہے 'ہم بتاتے ہیں ہم کون ہیں۔ یار! اس پتھر جتنا درد بھی کسی مسلمان میں نہیں رہا جو یہ کہہ دے کہ میں نافذ کروں گا اللہ کا دین 'اللہ کے حبیب' کا دین۔ تھک گئے ہیں ان دانشمندوں سے 'دیکھ لیا عقلمندوں کو'۔ ۵۰ برس ہو گئے پڑھے لکھوں کے پیچھے گھومتے ہوئے یار! خدا کے لیے اب پاگلوں اور بے قوفوں کی باری ہے 'جسے کفر پاگل کہے گا اللہ کا حبیب' اسے اپنا خادم قبول کرے گا جسے عقل والے نادان کہیں گے۔

قیمت پڑے گی اسلام کی، اور اس کے لئے تیار ہو جاؤ!

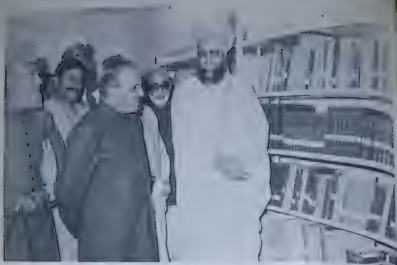
اب انشاء اللہ باری ہے دین کی، اسلام کی، لیکن یاد رکھو کہ یہ لقمہ ترکی طرح نہیں ملے گا، یہ اللہ کا قانون نہیں ہے۔ اسلام تب ہی نافذ ہو گا جب ہم اپنی جانیں بھی پیش کر دیں۔ آج پوری دنیا کو دیکھ لیں روئے زمین پر ہمیں دو ہی طبقے نظر آتے ہیں۔ ایک ظالم، دوسرا مظلوم، جب کوئی قوم، کوئی طبقہ، کوئی ملک دو حصوں میں مٹ جاتا ہے، درمیان میں کوئی نہیں چھتا، جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت رکھتا ہو۔ تو پھر قدرت کا نظام حرکت میں آتا ہے اور اس کے اپنے طریقے، اپنے قاعدے ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ میں کوئی پیشن گوئی نہیں کر رہا ہوں، یہ سائنٹیفک بات ہے اور مغرب کا کافر اس پر یقین رکھتا ہے اور اسے سمجھ چکا ہے، جس طرح دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر میں اقوام عالم کی تاریخ ہے، زمانے کے نشیب و فراز ہیں اور جن لوگوں کو تجزیہ کرنے کی اللہ نے استعداد دی ہے وہ کلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اب معاملہ کہاں پہنچ گیا ہے۔۔

## امیر تنظیم الاخوان

جناب ملک محمد اکرم اغوان سے ایک ایسا انٹرویو 'جوان کے  
سیاسی' قومی اور مذہبی افکار پر روشنی ڈالتا ہے !!

س :- حضرت، گزارش یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں کام  
کر رہی ہیں۔ تصوف کے کئی سلسلے بھی اپنا کردار ادا کرنے کے دعویدار ہیں۔ ان سب  
کی موجودگی میں آپ کو ایک نئی تنظیم بنانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، آپ  
اسے دوسری جماعتوں سے مختلف کس طرح قرار دیتے ہیں؟

ج :- آپ کا سوال بڑا اہم ہے، لیکن جو شخص ہمارے کام سے واقف ہے، اور ہمارے  
انداز و طریق کار پر نظر رکھتا ہے اس کے سامنے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم نے "تنظیم  
الاخوان" کیوں قائم کی۔ اس وقت جو دینی گروہ یا جماعتیں کام میں مصروف ہیں، ان  
کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو موجودہ سیاسی نظام کا حصہ ہیں اور اپنے  
مذہبی تشخص اور نام پر اصرار کرتے ہوئے ایک خالص سیاسی جماعت کا کردار ادا کر



صفاہ واکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر صدر جنرل ضیاء الحق کے ہمراہ



سنو پیپر ڈکاشیکار چین کے بارڈر کے ساتھ

رہی ہیں۔ انتخابات میں حصہ لیتی ہیں، اسمبلیوں میں بھی ان کا کوئی نہ کوئی امیدوار جا پہنچتا ہے اور وہ کسی نہ کسی رنگ میں اس نظام سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف وہ دینی مدارس جماعتیں یا سلاسل تصوف ہیں جو انتہائی سیاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ موجودہ نظام سے الگ تھلگ، اسے چھوڑ چھوڑ کر انفرادی زندگیوں کی تعمیر اور تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک انفرادی تزکیہ بھی ضروری ہے اور اجتماعی زندگی کو بھی درست بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ فرد کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ نظام کو۔ فردی اصلاح کے لئے ہمارا پروگرام وہی ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے ہمارا بنیادی طور پر تصوف کا سلسلہ ہے اویسیہ نقشبندیہ، ہم ذکر اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ہمدے کا تعلق اپنے رب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے سلسلے کے مرشد اول، حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں، اس لئے ہم کسی نئی بات کے موجد اور کسی نئے دعوے کے علمبردار نہیں ہیں۔

حضرت مولانا اللہ یار خاں ہمارے سلسلے کے شیخ تھے، انہوں نے برسوں لوگوں کے احوال باطن کی اصلاح کے لئے صرف کئے وہ ایک عالم باعمل تھے۔ ایک دیر ساقی، قصبائی، لیکن علم کا بحر، بحر اں، ان کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اس سلسلے کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ ہم موجودہ نظام کو تسلیم نہیں کرتے! موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنے کی غرض سے اس کا حصہ نہیں بنتے، ہم معروف معنوں میں کوئی انتخاب لڑنے والی جماعت نہیں ہیں۔ ہمارا موقف اصلی ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

اس وقت جو سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچہ ہماری مملکت کا ہے یہ وہ نہیں جس کے لئے لاکھوں جانوں کی قربانیاں دی گئی تھیں۔ جس کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا



تھا۔ اس طرح کے سیکرٹریٹ 'اس طرح کے دفاتر بھارت میں بھی موجود ہیں' ہر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے پاکستان کو کیوں بنایا تھا؟ کیا محض اس لئے کہ وہاں جو کچھ غیر مسلموں کے ہاتھوں ہوتا ہے، یہاں مسلمانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی ہے، اور یہی سوال ہم اٹھا رہے ہیں اور اس کا جواب اپنے عمل سے دینے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔

س :- آپ کی تنظیم میں کیا آپ کے سلسلہ اویسیہ نقشبندیہ کے لوگ ہی شامل ہو سکتے ہیں؟

ج :- اس وقت تو تنظیم کے افراد کی بڑی تعداد اس سلسلے ہی سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس میں شامل ہونے کے لئے کسی فرقے، رنگ، نسل یا جماعت کی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر وہ مسلمان جو ہمارے منشور سے متفق ہے، ہمارا رکن بن سکتا ہے۔ ہمارا تعلق کسی فرد یا کسی گروہ سے نہیں۔ ہم معاشرے کو متحد اور منظم کرنا چاہتے ہیں غلط تقسیم کو ختم کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمارے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ اس حوالے سے بھی آپ دیکھیں تو دوسروں کے اور ہمارے درمیان ایک بنیادی فرق ہے ہماری دعوت کسی شخصیت سے کسی فرقے کی طرف سے نہیں۔ ہم نہ کوئی بت بناتے ہیں نہ کسی دوسرے کے بنائے مت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہماری کوشش اور کاوش یہ ہے کہ ہم کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاؤ۔ ہم کسی سے نہیں کہتے کہ تم درود شریف آہستہ پڑھو یا بلند آواز سے۔ رفع یدین کرو یا نہ کرو۔ آمین بالآخر کہو یا نہ کہو۔ ہم ان تمام فروغی اختلافات سے اوپر اٹھنے کی بات کرتے ہیں۔ ہوس اقتدار کو بھی پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔ ہمارا پیغام یہی ہے کہ شمع رسالت کے پروانوں، شمع رسالت کے گرد جمع ہو جاؤ۔

س :- آپ بنیادی طور پر ایک "صوفی" ہیں۔ ایک سلسلہ تصوف کے شیخ ہیں۔ کیا

صوفیائے کبھی یوں جنظیمیں مائی ہیں کیا آپ کے شیخ نے اس طرح کی کوئی تنظیم مائی تھی؟

ج :- آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں 'جب بھی مثبت تبدیلی آئی ہے۔ صوفیائے اس میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ مجدد ثانی صوفی تھے 'شاہ ولی اللہ کا پورا خاندان صوفیا کا تھا۔ ہم تک کلمہ توحید 'کیا ان اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کے ذریعے نہیں پہنچا۔ صوفیا کا اسلام کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ ہمارا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں تو اسلام کو "اون" کریں۔ یہ آپ کے والدین کا 'دادا جان کا' یا بزرگوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کا اور ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔ ہم پر یہ لازم ہے کہ پہلے خود معلوم کریں 'سیکھیں۔ رسول اللہ نے حجت الوداع کے موقع پر انسانی حقوق کا جو چار ٹرڈیا 'اس پر خود عمل پیرا ہوں اور پھر اسے اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کے لئے جدو جہد کریں۔ ہمارے ہاں شخصی تربیت کا نظام سارا سال چلتا ہے۔ ہم نے دینی تعلیم کے کورسز ترتیب دیئے ہیں۔ جو دنیا بھر میں بذریعہ ڈاک بھیجے جاتے ہیں۔ جو ہمارے ساتھ منسلک ہوتا ہے 'اس کو چند روز کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہمدردی اسے مسلمان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

س :- آپ نے اپنی تنظیم کن خطوط پر قائم کی ہے؟

ج :- ہم نے اپنی تنظیم کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ اس نظام میں داخل نہ ہو جائے بلکہ نظام کو بدلا جائے۔ اس کی جگہ ایک دوسرا نظام دیا جائے۔ ایک متبادل اور ظلم و زیادتی سے پاک نظام۔

س :- آپ کے خیال میں تنظیم الاخوان کیا ہے 'اس کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟

ج :- تنظیم الاخوان محض مذہبی سیاسی یا فلاحی تنظیم نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تنظیم الاخوان کی نظر میں مذہب سیاست اور فلاح ایک ہی کام کے مختلف معنی

ہیں۔ اگر کوئی محض مذہبی تنظیم ہے تو اس کے پاس دین اسلامی کا جو مکمل ضابطہ حیات ہے، صرف ایک پہلو ہے اگر کوئی محض سیاسی تنظیم ہے تو اسکی مثال ایسے ہے جیسے بغیر بنیادوں کے گھر تعمیر کیا گیا ہو۔ بغیر کسی نظریے کے کوئی سیاسی سرگروہ رہا نہیں ہو سکتا۔ یا پھر مادر پدر آزاد جنگل کا قانون ہو گا۔ بقول شاعر مشرق :-

جدا ہو دیں سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگیزی

پھر اگر کوئی محض فلاحی تنظیم ہے تو فلاح کے لئے سب کے اپنے اپنے اسالیب ہیں۔ خصوصاً آج کل فلاح انسانیت کے نام سے Humanism یا قاعدہ ایک مذہب کو جنم دیا جا رہا ہے کہ جی اصل چیز تو انسانیت ہے۔ یہ مذہب وغیرہ، یہ آدمی کا ذاتی معاملہ ہے جبکہ حقیقت میں یہ ساری باتیں دین اسلام کے نظریہ حیات سے بالکل ناواقفیت کی دلیل ہیں۔

تنظیم الاخوان جامع خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ تنظیم نبی رحمت کے حکم کے مطابق کتاب اللہ کی روشنی میں دلائل کے ہر شعبے میں ہر کام کو تادم فکر اور فلاحی نقطہ نظر سے سرانجام دینے کی قائل ہے کیونکہ دین اسلام ہی درحقیقت کامل اور اکمل ضابطہ حیات ہے۔ تنظیم الاخوان محض دوسری تنظیموں کی طرح جذباتی خیالات پسند نہیں کرتی۔ بلکہ ٹھوس دلائل کے ساتھ موجودہ مادی ترقی کے دور کی تمام تر ضروریات کو پیش نظر رکھتی ہے۔

س :- آپ کا سلسلہ کتنے واسطوں سے حضرت مجدد الف ثانی تک پہنچتا ہے ؟

ج :- ہمارا نقشہ بندیہ سلسلہ حضرت مجدد کے سلسلے سے الگ ہے، یہ نقشہ بندیہ اولیہ سلسلہ ہے۔ یہ دوسرے تمام سلسلوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں شیخ کا مرید سے تعلق ”ون ثودن“ نہیں چلتا۔ دوسرے سلسلوں میں مرید، شیخ سے براہ راست اکتساب فیض کرتا ہے ہمارے ہاں فیض حاصل کرنے کے لئے جسمانی طور پر

لنا ضروری نہیں ہے یہاں روح روح نے فیض حاصل کر لیتی ہے۔ جس طرح حضرت اولیس قرنیؑ تک رسول اکرمؐ کی صحبت سے جسمانی فیض اٹھائے بغیر ان کی روح اطہر سے برکات پہنچ گئیں اسی طرح ہمارے سلسلے میں بھی فیض پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے یہ سلسلہ صرف تیرہ واسطوں سے رسول اکرمؐ تک پہنچ جاتا ہے۔

ہمارے شیخ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ ان کے بارے میں رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ ”ابو بکر ظاہری اعمال کی وجہ سے تم پر سبقت نہیں لے گئے۔ ان کی اصل سبقت وہ نعمت ہے جو میرے سینے سے ان کے سینے میں انڈیلی گئی۔“

س :- تو کیا حضرت ابو بکر بھی ”صوفی“ تھے؟ کیا وہ بھی تصوف کے قائل تھے؟

ج :- ”بھائی! یہ تصوف کا نام تو بعد میں متعارف ہوا۔ اصل چیز وہ ہے کہ جسے تزکیہ کہتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد قرآن کریم میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں، یعنی ان کے باطن کو چلا ڈھتے اور سوچ کو پاکیزہ انداز عطا کرتے ہیں۔“

س :- دوسری جماعتوں اور الاخوان میں کیا فرق ہے؟

ج :- ”تنظیم الاخوان ہر طرح کے تعصب سے پاک ہے۔ ہم لوگوں کو گروہ بندیوں سے نکال کر صرف اور صرف محمد رسول اللہؐ کے بیڑے جمع کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری بنیادی دعوت محمد رسول اللہؐ سے محبت ہے!!“

س :- آپ کو اپنی کامیابی کا کس حد تک یقین ہے؟

ج :- ”یہ ٹھیک ہے، اب تک کچھ نہیں ہوا۔ ہم کافی عرصہ تک ان دینی تنظیموں کی معاونت کرتے رہے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اب ضرورت اس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ ہمیں خود میدان میں نکلنا چاہئے۔ ہمارا ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ ہم کوئی تیر مار لیں گے لیکن کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم اللہ کی جواب دہی کے احساس سے میدان میں نکلے ہیں۔ اللہ کار ساز ہے وہ چاہے تو ہم فقیروں سے کوئی کام

لے لے۔

گھر میں آرام سے بیٹھنے کی اجازت نہ تو اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور نہ ہم اسکا مشورہ دیں گے۔ اگر واقعی آپ کو کسی اور جماعت پر اعتماد نہیں ہے تو پھر خود نکلیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیں اور یہ دعوت صرف زبانی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر آپ وطن عزیز میں اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں تو میرے اور آپ کے پاس بھی اس پاکستان کا ایک حصہ موجود ہے، ان بارہ کروڑ حصوں کو جوڑو گئے تو پاکستان بنے گا۔ اگر ہر فرد اپنے حصے پر اسلام نافذ کرے تو ایک دن آئے گا کہ پورے پاکستان پر اسلام کا پر حم لہرائے گا۔

س:- پاکستان میں فرقہ واریت مستقل طور پر ایک مسئلہ بن چکی جا رہی ہے۔ آپ کے خیال میں اس فرقہ واریت کے اسباب کیا ہیں؟

ج:- دراصل ہماری دینی جماعتوں کی کمزوری یہ ہے کہ ان کے پاس وسائل کوئی نہیں۔ وہ لوگوں کے عطیات اور زکوٰۃ پر ہی تکیہ کرتے ہیں اب جھگڑا نظریاتی مسائل پر نہیں ہو تا بلکہ وسائل پر ہوتا ہے۔ ہر جماعت کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے وسائل کم نہ ہوں۔ اس کے لئے اختلاف ضروری ہے۔ اگر اختلاف نہ ہو تو ان مسائل پر قبضہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال میں فرقہ واریت عطیات کا جھگڑا ہے، نظریات کا نہیں عطیات کی تقسیم پر لڑائی ہوتی ہے۔

فرقہ واریت کا ہمارا گہرا مطالعہ ہے ہمارے شیخ مولانا اللہ یار خانؒ بڑی علمی شخصیت تھے۔ وہ برصغیر میں مانے ہوئے مناظر تھے۔ انہوں نے ہندو، سکھوں اور عیسائی پادریوں سے کئی مناظرے کئے انہوں نے شیعیت پر بھی بہت تحقیق کی جس سے بعد میں مولانا منظور احمد نعمانی نے استفادہ کیا۔ لیکن ہماری مسجد میں کسی شیعہ کو نہیں روکا جاتا تھا۔ ہماری زمینوں میں بھی بڑی تعداد میں شیعہ تھے لیکن کبھی لڑائی

جھڑے کی نومت نہیں آئی۔ نقص اختلافات کا مقصد تصادم نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن تصادم کے اپنے ”فوائد“ ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی تعداد میں فنڈز جزیٹ ہوتے ہیں۔ سادہ لوح عقیدت مند سمجھتے ہیں کہ وہ دین کی خدمت کر رہے ہیں اس سے مختلف مراعات اور تحفظات کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ دین اسلام نے تو ہمیں لاکر ابی الدین کا اصول دے دیا کہ گمن پوائنٹ پر کسی کا عقیدہ تبدیل نہیں کرایا جاسکتا۔ انسانوں کی لئے دو خدائی حقوق ایسے ہیں جنہیں کوئی نہیں چھین سکتا..... زندگی اور عقیدہ!

اسی لئے میں کہتا ہوں الاخوان مروجہ معنوں میں نہ سماجی تنظیم ہے اور نہ سیاسی جماعت ہے بلکہ ہم صوفیا کی جماعت ہیں۔ ہمارا اصل زور کردار سازی ذکر اذکار اور عبادات پر ہے۔ دینی جماعتیں اپنا کام کر رہی ہیں وہ سیاست میں بھی حصہ لیتی ہیں اور دو چار سیٹیں حاصل کر لیتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کسی نظام کا حصہ بن کر اسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ جس نظام سے مراعات اور مفادات حاصل کریں اس کو تبدیل کرنے پر بھی تل جائیں۔ آپ نے کسی وسیع و عریض عمارت میں ایک کمرہ بھی لے لیا اور پھر اسے گرانے کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں مروجہ نظام میں اسلام کا پیوند لگانے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ دین ہمارا آپ کا یا کسی اور انسان کا، نایا ہوا نہیں۔ یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ۔

”دین میں پورے پورے داخل ہو جاؤ“۔ یہ حکم فرد اور ریاست دونوں کے لئے یکساں ہے۔ پھر آدھا تیر آدھا شیر والا معاملہ کبھی نہیں چلا۔ اگر یہ کافی ہوتا تو یقیناً پھر سب مسلمانوں کے لئے کافی ہوتا۔ اور مکمل اسلامی ریاست کے تصور کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

س :- موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کی بات تو بہت سے لوگ کرتے ہیں، لیکن آپ

اس کی جگہ کو نسا نظام لائیں گے 'کیا تبدیلی آپ کو مطلوب ہے۔ کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے آپ نے؟

ج :- ہمارے منشور کا مطالعہ کریں۔ آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا۔ ہم نے مختلف شعبوں کے ماہرین کو یک جا کر کے حالات کی اصلاح کے لئے ایک جیادی دستاویز تیار کی ہے۔ اگر آپ اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم تجویز کرنا چاہیں تو ہم اس پر بھی کھلے دل سے غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔

س :- اس کے جیادی نکات کیا ہیں؟

ج :- ☆ اسلام کا "شورائی" نظام حال کیا جائے۔ بالغ رائے دہی کے ذریعے مملکت کا سربراہ چنا جائے۔ اس کی کابینہ پندرہ افراد سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ وہی صوبائی گورنروں کو بھی قائم کرے۔ گورنروں اور کابینہ کے ارکان کے نام مشاورت کے لئے شورئی کے پاس بھجوائے جائیں۔

☆ وفاقی اور صوبائی مجالس شورئی کے لئے مخصوص نشستوں پر زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو سامنے لایا جائے۔ یوں کسان ' مزدور ' صنعت کار ' تاجر ' وکیل ' ڈاکٹر ' انجینئرز اور استاد فیصلہ سازی میں شریک ہو سکیں گے۔

☆ دستور میں موجود ارکان شورئی کی اہلیت کی شرائط کو نافذ کیا جائے۔

☆ ۱۸ سال سے زائد عمر کے شہریوں کو ووٹ کا حق دیا جائے۔

☆ غیر ملکی قرضوں سے فوراً نجات حاصل کرنے کے لئے خصوصی قومی فنڈ قائم کیا جائے اور لوگوں سے عطیات کی وصولی کی جائے۔ اندرون اور بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے تعاون سے قرضوں سے نجات حاصل کر لی جائے۔

☆ غیر ترقیاتی اخراجات محدود کئے جائیں اور ہر طرح کی فضول خرچی فوری

طور پر بند کر دی جائے۔

۱۱۔ فوجی ہتھکاری نظام کی تنظیم نو ہو، سود ختم کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں، قرض اور قرض خواہوں کے کوائف باقاعدگی سے مشترک کئے جائیں۔

۱۲۔ محاسبہ کا مؤثر انتظام کیا جائے اور عملدرائج کرنے کے لئے پہلے ایجنسیوں کو ہر طرح کی غفلت اور بد عنوانی سے پاک کرنا چاہیے۔

۱۳۔ ایک مکمل آزاد عدلیہ کا قیام عمل میں لایا جائے اس شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ کیا جائے کہ جو انہیں بہتر سے بہتر معیار زندگی کی ضمانت دے سکے۔

۱۴۔ فوری اور جلد انصاف کے لئے اپیل کے مراحل کم کئے جائیں۔ مقدموں کو نبھانے کے لئے وقت مقرر کیا جائے۔ گشتی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے اور کورٹ فیس ختم کر دی جائے۔

۱۵۔ نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے، اور ایک سال کے اندر اندر قومی سطح پر نصاب تیار کیا جائے۔ اساتذہ کو اعلیٰ مقام دیا جائے۔ نظام امتحانات کو یکسر تبدیل کر دیا جائے۔

۱۶۔ ایک خاص مد سے زیادہ زرعی آمدنی پر مناسب شرح سے ٹیکس عائد کئے جائیں۔

۱۷۔ ہر پاکستانی کو عسکری تربیت دی جائے۔

۱۸۔ سرکاری ملازمین کی جائیداد اور اخراجات کے گوشوارے ہر سال عوام کی اطلاع کے لئے مشترک کئے جائیں۔

س :- آپ کی تنظیم الاخوان کس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے؟

ج :- بہت تیز رفتاری سے



س :- اس وقت اس کے ارکان کی تعداد کتنی ہے ؟

ج :- ہزاروں میں۔

س :- انتخابات میں حصہ آپ نہیں لیں گے، مسلح جدوجہد پر آپ یقین نہیں کرتے، پھر تبدیلی کیسے آئے گی ؟

ج :- ہم انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن موجودہ نظام انتخاب کے تحت نہیں۔ اس وقت کم و بیش ستر فی صد افراد ایسے ہیں جو ووٹ ڈالتے ہی نہیں۔ تیس فیصد کے لگ بھگ لوگوں نے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے گویا اقلیت جمہوریت کے نام پر قابض ہے۔ یہ ستر فی صد افراد ہمارے مخاطب ہیں۔ ان میں سے ہمیں فی صد بھی متحرک ہو گئے انہوں نے سر پر کشن باندھ لیا، تو تبدیلی آجائے گی۔ موجودہ نظام کو اکثریت مسترد کر چکی ہے۔

س :- اعموان صاحب آپ کی جنرل ضیاء الحق سے ملاقاتیں رہیں کیا آپ نے ان کے ساتھ مل کر بھی کوئی منصوبہ بنایا تھا ؟

ج :- جنرل ضیاء سے میری ملاقات رہی۔ مجھے صاحب سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ سیاست سے الگ ہو کر بات یہ ہے کہ جنرل ضیاء ذاتی طور پر بڑی خوبیوں کے مالک تھے ان سے میں نے کہا کہ ہم نظام تعلیم پر کام کریں گے اور ایک ماڈل وضع کریں گے۔ پاکستان کا نظام تعلیم اس کے مطابق استوار کیا جاسکے گا۔ وہ منارہ آئے، انہوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی، لیکن جب ہمارا کام آگے بڑھا تو وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ہم نے اپنے ”پائلٹ پروجیکٹ“ کو دیکھنے کے لئے میاں نواز شریف اور ان کے وزارت نے تعلیم کو دعوت دی کہ وہ اسے ملک بھر میں پھیلانے کے بارے میں سوچیں، لیکن ان حضرات کو فرصت نہیں تھی یا پھر اس طرف ان کا رجحان نہیں تھا۔ انہوں نے اس طرف نہیں دیکھا۔ بہر حال ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

س :- کیا ان حالات میں ضرورت نہیں ہے کہ پہلے اس طبقے کی اصلاح کا پروگرام بنایا جائے؟

ج :- ضروری ہے۔ ہم یہ کام کر رہے ہیں۔ اس طبقے سے ہم ناامید نہیں ہیں۔ اس سے ہمارا رابطہ ہے اور تعلیمی نظام کا جو ماڈل تیار کر رہے ہیں۔ یہ اس کی طرف آہی رہے ہیں۔

س :- آپ کیا محسوس کرتے ہیں آپ کی اس کاوش کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

ج :- ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک ٹھیکل (typical) اسلام سب پر مسلط کر دیا جائے ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو براہ راست قرآن سکھایا جائے۔ نبی کریم کے ارشادات بتائے جائیں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس فریم ورک میں کچھ سیکھ سکے اور پھر آگے سکھا سکے وہ سب ٹھیک ہے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنی یا ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے ان معاملات میں الجھے بغیر اسلام پر عمل کیا جائے اسکی روح کو سمجھا جائے اور ہر شخص ایک خاص سانچے میں ڈھلتا جائے۔ ہم جبراً ہر ایک کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنا نہیں چاہتے۔

س :- خواتین ہماری آبادی کا تقریباً نصف سے بھی زیادہ حصہ ہیں۔ آپ معاشرے میں خواتین کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج :- جب ہم بات دین اسلام کی کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے تو پھر خواتین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کیوں نہیں کرتے۔ اور اس پر عمل پیرا نہ ہونے کے بہانے کیوں تلاش کرتے ہیں۔ اسلام کے منصفہ شہود پر طلوع ہونے سے پہلے کی تاریخ انسانی میں ہمیں سب سے زیادہ مظلوم، حقیر اور رسوا طبقہ جانوروں کے درجے سے بھی نیچے جو طبقہ نظر آتا ہے۔ وہ خواتین کا

ہے اور عجیب بات ہے کہ باوجود ذہنی شمار ترقی کے بے شمار علوم جدیدہ کے اس دور میں بھی اگر اسلامی فلسفہ حیات کو نکال دیا جائے تو عورت کی حیثیت عورت کو کی اہمیت نہیں۔ آج تہذیب جدید نے بہت بڑا کارنامہ یہ کیا ہے کہ عورت پر آزادی اور برابری کے نام پر مرد کے کندھے کا سارا بوجھ لا کر اسے میدان میں لا کھڑا کیا اور بغیر کسی عزت و احترام کے ماچس کی ڈھیا سے لے کر ایک قیمتی گاڑی تک پہنچنے کے لئے اسے بطور اشتہار استعمال کیا۔ اور جوڑے داریاں عورت کی تھیں وہ بہر حال عورت کے پاس رہی رہیں۔ ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ ”عورت میدان میں آکر ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کرتا ہے“ مگر وہ عورت نہیں رہتی۔“

اسلام نے آکر عورت کو ماں کی عزت دی، بہن کی عزت دی، بیٹی کی محبت دی، بیوی کے حقوق عطا کئے، خاوند کی میراث میں حصہ دیا۔ باپ کی جائیداد کا وارث بنایا۔ بیٹے کی جائیداد کا وارث بنایا۔ حتیٰ کہ پہلی دفعہ صدیوں بعد گمراہ انسانیت میں عورت کو پسند اور ناپسند کا اختیار ملا اور اس کا حق مہر لازمی قرار دیا۔ جو آج صرف ایک رسم رہ گئی ہے جب کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ جس گھر میں عورت جاتی ہے اس گھر کا ہر فرد پہلے سے اس جائیداد کا مالک یا وارث ہوتا ہے تو نئی آنے والی خاتون کو بھی گھر والوں کی حیثیت کے مطابق حصہ دیا جائے تاکہ وہ بھی اس گھر میں کچھ حصے کی مالک کہلائے۔

اللہ کریم نے نسل انسانی کو اس طرح جہاں میں بسایا کہ یہاں کام کرنے والے اپنی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ نخی نخی کو نپلوں کے سچ بولتے اور انہیں پانی دیتے۔ سینچتے اور نیا مکھن سجاتے چلے جاتے ہیں۔ انسان ہونے میں تو دونوں برابر ہیں۔ ایک ہی میدان میں ایک ہی عظیم ترین ہستی کے سامنے جوبلدہ ہیں۔ دنیا میں آج پھر ہم نے مرد اور عورت کو بہت دور کر دیا ہے ایک طبقے نے پھر دین کے نام پر

اسے عہد جاہلیت میں جا پھینکا۔ جہاں عورت کی کوئی رائے، اس کو کچھ کرنے یا نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ بھول گئے کہ کوئی نبی بھی کسی خاتون کی گود کے بغیر دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ عورت اگر نبی نہیں ہے تو نبی کی ماں تو ہے۔ کسی خاتون ہی کے سینے سے لگ کر اس نے پرورش پائی۔ اور دوسرے طبقے نے بڑی دلفریب صداؤں سے عورت پر اپنے حصے کا وجہ لاد دیا۔

اب آپ اندازہ کر لیں ہم خواتین کو کیا کردار دینا چاہتے ہیں۔ ہم خواتین کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کے منائے ہوئے قوانین پر عمل کروانا چاہتے ہیں جو کہ بالکل ناپید ہے یہ خواتین کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو پہچانیں۔ تنظیم الاخوان نے خواتین کے لئے "الاخوات" کے نام سے ایک شعبہ قائم کر دیا ہے جس کا مقصد خواتین کو قرآن و حدیث کا عام فہم درس میا کرنا ہے تاکہ خواتین کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ان کے گلشن میں اللہ تعالیٰ جو پھول کھلا رہا ہے اس میں وہ رنگ بھر دے کہ شناخت ہو جائے کہ یہ پھول محمد رسول اللہ کے دبستان کے پھول ہیں۔ یہ اسلام کے پھول ہیں۔

س :- کیا تنظیم الاخوان میں بھی خواتین کا کوئی عمل دخل ہے؟

ج :- تنظیم الاخوان خواتین کو میدان عمل سے بے دخل نہیں کر رہی ہے۔ اس لئے تنظیم میں خواتین کا شعبہ "الاخوات" قائم کر دیا گیا ہے۔ ہم نے صرف خواتین کے میدان عمل کا تعین موجودہ دور کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر قرآن و حدیث سے کیا ہے۔

خواتین کا اصل میدان بلاشبہ پہلے ان کا گھر اور پھر کوئی دوسری جگہ ہے تنظیم الاخوان مجاہدین کی تنظیم ہے اب اس میں موجود تمام حضرات گھر اور گھر سے باہر کام کر رہے ہیں ہماری دینی غیرت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم جانفشانی سے

س :- بھٹو صاحب سے آپ کی ملاقات کیسے ہوئی؟

ج :- یہ اللہ کا احسان ہے کہ میں جس شعبے میں بھی قدم رکھتا ہوں مجھے کامیابیاں ملتی ہیں۔ ایک وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ سیاسی شخصیات کہنی ہماری ضرورت محسوس کرتی رہتی ہے، یہ اور بات کہ ان سے ”ورکنگ ریلیشن شپ“ قائم ہو سکے یا نہ۔ تعلقات اسٹبلش ہوتے رہتے ہیں، بات چلتی رہتی ہے۔ بھٹو صاحب میں بھی کئی خوبیاں تھیں۔ آخری زمانے میں ان کے اندر یہ خوشگوار تبدیلی آئی تھی کہ وہ موجودہ نظام سے مایوس ہو چکے تھے۔ وہ مروجہ سیاست سے تھک چکے تھے، لیکن ان کے گرد جس طبقے نے دیوار بنادی تھی وہ انہیں آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

س :- مگر وہ تو دھن کے پکے تھے، آگے اپنے طور پر بڑھ سکتے تھے؟

ج :- میں سمجھتا ہوں، ہمارے اسلامی طبقے نے ان کی افادیت کو محسوس نہ کیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بھٹو فرشتہ بھی بن جائے تو اس پر اعتبار نہیں ہو سکتا، اس سے تعاون نہیں ہو سکتا۔

س :- اسلامی طبقے میں سے تو کئی جنرل ضیاء الحق کی بارے میں بھی یہی کہتے تھے؟

ج :- یہ اصل میں بد نفسی کی اہدا ہے۔ یہ لوگ ”ون سائیڈڈ“ ہو جاتے ہیں۔ یہ عقل، نیک اور اچھے لوگ تو ہیں لیکن حکمت سے کام نہیں لیتے۔ دنیا کی کسی اور قوم کو ضیاء الحق جیسا نظریاتی اہدہ مل جاتا تو وہ چند برسوں میں اس سے اتنا کام لے لیتی کہ صدیوں کے لئے کافی ہوتا۔ مگر ہمارے دینی طبقے انہیں صحیح طور پر استعمال نہ کر سکے۔ ان سے کام نہ لے سکے۔

س :- مگر آپ نے خود بھرپور استفادہ کیوں نہ کیا؟

ج :- ہم اس لئے نہ کر سکے کہ ثمرات اجتماعی سطح پر آگے جاسکتے تھے، انفرادی کوشش سے ان کا حصول ممکن نہ تھا۔

میدان عمل میں ہر جگہ کام کریں حتیٰ کہ کامیاب ہو جائیں۔

شعبہ ”الاحوات“ خواتین میں صحیح اسلامی اقدار کی روح پھونکنے کا تاکہ ان کی کوکھ سے صالح اولاد پیدا ہو اور ”الاخوان“ کے ذریعے ان عام خواتین کو جو گھر سے باہر فیلڈ میں موجود ہیں انہیں ان کے حقیقی حقوق و فرائض سے آگاہ کرے۔ ان خواتین کے ذمے یہ بھی ہو گا کہ موجودہ دور کے وہ چیلنج جو خواتین کو درپیش ہیں ان میں ان کی راہنمائی کرے اور معاشرے میں دین ہر طرح سے ان کو تحفظ فراہم کرے۔

س :- آپ کے خیال میں اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے ؟

ج :- ہمارا مسئلہ آج بھی یہ ہے اور آج سے تب تک کی رہے گا جب تک ہم واپس اپنی جگہ پر نہیں آتے کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں جو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ جھکے تو اس کا اپنا دھاریا تشخص باقی نہیں رہتا۔ قومی تشخص لباس ہوتا ہے وہ حوادث زمانہ سے بھی چھٹا رہتا ہے اور آئندہ اور عزت بھی دیتا ہے۔ اگر کسی کو بے لباس کر کے چھوڑ دیا تو وہ کہاں عزت پائے گا کیسے عزت پائے گا کون اس کی توقیر کرے گا ہم جب اپنے قومی تشخص اپنی آئینہ الوجہ اپنے نظریہ کو چھوڑ کر دوسری طرف جاتے ہیں۔ تب گڑبڑ ہوتی ہے۔

میری نظر میں ہمارا مسئلہ صرف یہ ہے کہ نظام کو بدلا جائے۔ اپنا نظام اپنایا جائے۔ ہمارے مسائل کا حل اسی میں موجود ہے۔ دہشت گردی کا بھی نا انصافی کا بھی ہر وزگاری کا بھی، بھوک اور افلاس کا بھی جتنے بھی مسائل ہیں ان کا حل صرف اسی ایک میں موجود ہے اور یہ کام کہ تا میری ذمے داری بھی ہے اور آپ کی بھی پیر صاحب کی بھی اور استاد کی بھی ہم پر ویسے بھی جماد فرض ہے جیسے آپ کشمیر میں لڑ رہے ہیں ہم کشمیر میں کیوں جہاد کر رہے ہیں میرے ساتھی بھی وہاں جائیں دے

رہے ہیں ہمارے دوست بھی وہاں کام کر رہے ہیں۔ مجبوری ہے ظلم ہو رہا ہے مسلمانوں پر اور جو ہو سکتا ہے کرنا چاہیے۔ کیا کشمیریوں پر ظلم ہو رہا ہے اور یہاں نہیں ہو رہا ہے وہاں عزتیں لٹتی ہیں یہاں محفوظ ہیں۔ وہاں گھر جلتے ہیں یہاں کوئی نہیں جلتا۔ اگلے دن کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا آپ کیا بات کرتے ہیں یہاں مسلمانوں سے جہاد کیسے؟ میں نے کہا کون کتنا ہے مسلمانوں سے جہاد کرو۔ ہم کہتے ہیں اسلام نافذ کرو۔ اب جو اس کے نفاذ کو روکنا چاہے وہ کیا مسلمان ہے؟ ہمیں تو اسلام کے لئے لڑنا ہی پڑے گا۔ ہم اس کے خلاف تو نہیں لڑ رہے وہ غلط جگہ چلا گیا اسے یہاں ہونا چاہئے تھا۔ اگر وہ وہاں بیٹھا ہے جہاں ہم لڑ رہے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور۔

س :- آپ نے وزیراعظم صاحب کو علماء کو نسل قائم کرنے کی تجویز دی ہے کچھ اس کی تفصیلات بتائیں؟

ج :- میں نے حکومت کو تجویز پیش کی ہے کہ وہ علماء کی ایک کو نسل قائم کرے جو وزیراعظم کو مشورہ دے گی کہ کون سا حکم اسلامی شریعت کے مطابق ہے اور کون سا نہیں۔ اس کو نسل میں ایسے علماء شامل کئے جائیں جنہوں نے اسلامی قانون میں خصوصی مہارت حاصل کی ہو۔ اس کو نسل کے مشورے کے بعد وزیراعظم جو حکم جاری کریں گے اس پر کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکے گا کہ یہ وزیراعظم نے ذاتی طور پر جاری کیا ہے۔

س :- کیا آپ کے خیال میں پارلیمنٹ کو علماء کی اس نامزد کو نسل پر اعتراض نہیں ہوگا؟

ج :- پارلیمنٹ کیوں معترض ہوگی؟ اس شریعت بل کی منظوری پارلیمنٹ ہی نے دی ہے۔ پارلیمنٹ کی اتھارٹی سے ہی یہ کو نسل وجود میں آئے گی۔ اس لئے علماء کو نسل اور پارلیمنٹ میں بظاہر تصادم کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

س :- آپ نے علماء کو نسل کی تجویز پیش کرنے کے لئے مختلف مکاتب فکر کے علماء سے مشورہ کیا؟

ج :- نہیں، میں نے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ ذاتی طور پر ہی یہ تجویز پیش کی ہے۔ میں نے یہ تجویز کوئی خفیہ طور پر پیش نہیں کی تھی بلکہ تقریباً ساڑھے تین ہزار علماء کی موجودگی میں پیش کی تھی۔ وزیر اعظم صاحب نے میری اس تجویز کو سراہا ہے۔

دراصل ہمارے علماء کرام کا مسئلہ یہ ہے کہ اب ان کا مزاج کچھ غصیلا ہو گیا ہے۔ وہ احتجاج پر یقین رکھنے لگے ہیں، رہنمائی میں نہیں، اگر وہ اپنے آپ کو صرف رہنمائی تک محدود کر لیں تو ان کے لئے بہت آسانی ہو جائے گی۔

اس کنونشن کے بعد ذاتی طور پر میرا وزیر اعظم سے کوئی رابطہ تو نہیں ہوا۔ کنونشن کے بعد وہ بیرون ملک چلے گئے۔ ویسے بھی مجھے سرکارِ دربار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے میں ٹھیک سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان پر کیا اثر ہوا تھا۔ البتہ انہوں نے شیخ پر کنونشن کے دوران ہی ایک چٹ لکھ کر مجھے بھیجی جس پر لکھا ہوا تھا، آپ کی تجویز عمدہ ہے، انشاء اللہ اس پر غور کریں گے۔

س :- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایرانی طرز پر خون خرابے کے بغیر کوئی تبدیلی ممکن نہیں؟

ج :- میرا خیال ہے خون خرابہ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ ایران میں انقلاب امن سے اور سکون سے آیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جسے لوگ خون خرابہ کہتے ہیں، وہ ان کے عدالتی فیصلے کے ذریعے مارے گئے۔ ان کے عدالتی فیصلوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا، یہ خون خرابہ تھا وہ قتل و غارت تھی جو نظام نو سے بغاوت کرے گا، اسے اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔

س :- اس وقت ”رہنمائی سیاسی جماعتوں“ میں جماعت اسلامی اور خالص دینی جماعتوں



میں تبلیغی جماعت اہم ہیں۔ آپ ان کی اب تک کی کارگردگی کو کیسے دیکھتے ہیں؟  
 ج:- میرے دل میں باقی دینی جماعتوں کی طرح ان جماعتوں کی بھی بہت قدر ہے۔ جماعت اسلامی کے حوالے سے میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ فرد کی تعمیر سیرت کے لئے یہ جماعت ایک عرصے سے کام کر رہی ہے لیکن اسے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ میں پوری دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ اگر جماعت اسلامی کے پاس ”ذکر الہی“ کا سرمایہ ہو تا تو انقلاب اسلامی کا کام پہلے ہو چکا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جماعت اسلامی کو جو ذہن دیا۔ جو انسان دیا جس پائے کی قیادت اسے نصیب ہوئی اور جس طرح کی تنظیم بنانے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ ان میں کہیں کوئی کمی اور جھول نظر نہیں آتا۔ پھر کون سی کڑی ناپید ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک سرگرم عمل رہنے کے باوجود یہ کامیاب نہیں ہو سکی۔

میں سمجھتا ہوں ان کے عقل و دماغ نے تو حقیقت پائی لیکن دلوں کے اندر وہ جذبہ و کیف وہ طاقت و صلاحیت پیدا نہ ہو سکی جو صرف ذکر الہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ مولانا مودودی مرحوم نے ذکر کے فضائل اپنی تفسیر قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان تو کر دیئے لیکن جماعت کے اندر عملاً اس کا اہتمام نہیں ہو سکا۔ اگر جماعت اسلامی میں یہ وصف بھی پیدا ہو جاتا تو آج شاید کسی اور تنظیم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

تبلیغی جماعت کے متعلق عرض کروں گا یہ مخلص اور دین دار لوگوں کی جماعت ہے اور بہت فعال ہے۔ مسلمانوں کو مدائیوں سے چانے اور نیکی کی طرف راغب کرنے میں اس کا اہم کردار ہے۔ اس کے لئے اس کا طریقہ کار موثر اور عملی ہے۔ رائے و نڈ میں ان کے اجتماعات تعداد کے لحاظ سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ یہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ تسبیح کرتے ہیں چلے کاٹے ہیں گلی گلی گھر گھر تبلیغ کرتے ہیں مگر شاید انہوں

نے معاشرے کی سماجی اور سیاسی برائیوں کو اجتماعی طریقے سے روکنا اپنے نصاب میں شامل ہی نہیں کیا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ ابھی سے اسلحہ اٹھالیں اور حکومتوں کو گرانے کے درپے ہو جائیں۔ میں سمجھتا ہوں رائے و نڈ کے سالانہ اجتماع کے لوگ اگر قبیح پڑھتے اپنے بستر اور مصلے کندھوں پر اٹھائے اسلام آباد کی طرف چل پڑیں تو جاہ سے جاہ حکمران بھی اطاعت دین پر مجبور ہو جائے۔

ایک مرتبہ جس وقت محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم تھیں تو وہ کہا کرتی تھیں کہ یہ جو اسلام کی سزائیں ہیں یہ تو وحشیانہ ہیں۔ یہ انفرادی باتیں ہیں ہم کہتے ہیں کہ اسلام نہ عبادات کا نام ہے اور ہی سزاؤں کا نام۔ یہ تو حقوق و فرائض کا علمبردار ہے اسلام میں حقوق و فرائض متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر عمل ہونا چاہئے اور ہر سطح پر عمل ہونا چاہئے۔ عبادات کا تعلق اللہ سے ہے وہ اللہ اور فرد کا معاملہ ہے اسلام نے جو حقوق متعین کئے ہیں وہ فرد کے ساتھ فرد سے متعلق ہیں اور اسلام فرد کے ساتھ فرد کے تعلق پر بہت زور دیتا ہے اس کے اندر حقوق متعین ہیں۔ اب دیکھئے ناں ہر آدمی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے وہ مسلمان ہو یا کافر آدمی کا جان و مال محفوظ ہونا چاہئے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ انسانی ضروریات غذا، تعلیم، رہائش ہر مسلمان اور کافر کا حق ہیں۔ ہمارے ہاں اس تصور کو نہیں ابھارا جاتا کہ انسانی حقوق کے معاملہ میں عیسائی ہندو سکھ اور مسلمان سب کے سب برابر ہیں۔ حضور کے زمانے میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ جو لوگ قیدی ہو کر مدینے میں آتے تھے انہیں وہاں اپنے عقیدے کے مطابق عبادات کی اجازت تھی۔ کسی نے ان پر مذہب تبدیل کرنے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا۔ اسلام کی غلط تعبیروں نے دراصل ہمیں الجھا کے رکھ دیا ہے اس الجھاؤ کی بدولت آج خانہ جنگی کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔

یہاں تو ہم نے تماشہ بنالیا ہے کہ وہ شیعہ ہے تو اسے گولی مار دو۔ وہ قادیانی ہے

تو اسے گولی مار دو وہ بریلوی ہے تو اسے گولی مار دو اور کوئی دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھتا تو اسے گولی مار دو۔ اسلام تو غیر مسلم کے ساتھ بھی اس سلوک کی اجازت نہیں دیتا۔ جو پاکستان کے اندر مسلمان اپنے بھائیوں کے ساتھ روار کھے ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے لوگوں کو الجھا دیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اگر کوئی ایمان لے آیا ہے تو وہ معاشرے کے افراد کے ساتھ اپنا تعلق اسلام کی بنیاد پر قائم رکھے اور معاشرے میں رہنے والے افراد کے حقوق کا خیال رکھے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان اپنے حقوق سے تجاوز نہ کرے بلکہ اگر ہو سکے تو دوسرے کے معاملے میں درگزر سے کام لے۔ الحمد للہ ہمیں اس سلسلہ میں خاصی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ جب ہم لوگوں کو ان کے حقوق کا احساس دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر ایک بہت بڑی طاقت بنے گی جو اسلامی انقلاب لائے گی۔

س :- بعض سیاستدان فوج کو حکومت دینے کی بات کر رہے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج :- ہمارے جو سیاستدان ہیں ان میں انہیں نابالغ سمجھتا ہوں۔ فوج کو سیاست میں مداخلت کی اجازت دینا سیاسی عدم بلوغت کی نشانی ہے۔ کیونکہ فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے سیاست کرنا نہیں لیکن جب سیاستدان انہیں ملوث کر لیتے ہیں تو پھر خود ہی چلانے بھی لگتے ہیں۔

س :- آپ مختلف مواقع پر حکومت کے خاتمے کے دعوے کرتے ہوئے اس کے لئے باقاعدہ تاریخ بھی دیتے رہے ہیں ایسا آپ کس بنیاد پر کرتے ہیں؟

ج :- میں نے کبھی دعویٰ یا اعلان نہیں کیا البتہ مختلف موقعوں پر تجزیے کرتا رہا ہوں جو اکثر اوقات درست بھی ثابت ہوئے ہیں میں نے جون سے پہلے حکومت کے اتحادیوں کی علیحدگی کے بارے میں بتایا اور جون میں حکومت کے بڑے بڑے اتحادی

نوٹ گئے۔ اب میں کہتا ہوں کہ حکومت نے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ شریعت نافذ کر دے اور اس سلسلے میں خلوص سے کام لے اس طرح ان کی آخرت بھی بچ جائے گی اور دنیا بھی، ورنہ انہیں شاید دونوں جگہ پر مایوسی ہوگی جہاں تک حکومت کے خاتمے کی بات ہے تو ہم اسے فتح کرنے والے کون ہوتے ہیں ہمیں افسوس ہے کہ کراچی میں پولیس کے بے شمار افراد مارے گئے اور انہوں نے ساٹھ ساٹھ لوگوں کے قاتل پکڑے جنہیں چھوڑ دیا گیا۔ حکومت خانے پکڑے گئے الطاف پر کئی مقدمات ہیں 28 سال کی سزا ہو چکی ہے لیکن حکمران اسے ملتے ہیں یہ ظلم ہے اس میں نہ ہم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں نہ حمایت کرتے ہیں۔

س:- پاکستانی معاشرے خصوصاً نظام تعلیم میں جدید اور قدیم کی تقسیم کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

ج:- انگریز کی آمد سے قبل جب تک برصغیر میں مسلمان حکمران رہے اس سرزمین پر یہ تقسیم نہیں تھی۔ ایک ہی قسم کے تعلیمی ادارے تھے جن میں جدید اور قدیم کی تقسیم نہیں تھی۔ انگریز نے برصغیر پر قبضے کے بعد یہاں اپنے ادارے بنائے۔ قیام پاکستان کے بعد اولین ضرورت جدید اور قدیم کی اس تقسیم کے خاتمے کی تھی لیکن بد قسمتی سے اس طرف توجہ نہ دی گئی۔ دینی ادارے اپنی قدامت پسندی کے اتنے اسیر ہو چکے ہیں اور جدید علم سے اتنے دور کہ انہوں نے ہر ”جدت“ کو کفر سمجھا۔ دوسری طرف جدید تعلیمی اداروں نے ہر ”قدامت“ کو مسترد کر دیا اور آج پچاس سال بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور پوری دیانتداری کے ساتھ ایک دوسرے کو موجودہ تباہی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ہم جدید اور قدیم کی اس خلیج کو کم کرنا چاہتے ہیں ان کے درمیان پل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ضیاء الحق دور میں انہیں ایک تعلیمی منصوبہ بنا کر دیا انہوں نے

اے حکومتی ماہرین کے سپرد کر دیا جو خود ”جدید اداروں“ کے فارغ التحصیل تھے۔ انہوں نے اسے ناقابل عمل قرار دے کر مسترد کر دیا۔ چنانچہ ہم نے اسے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے وسائل کی کمی کے باوجود سکول کی سطح تک ایک ماڈل نظام تعلیم قائم کیا۔

س :- نفاذ شریعت کے سلسلے میں کیا حکومت نے آپ کو اعتماد میں لیا ہے دوسری گزارش یہ ہے کہ اسلام میں قرآن پاک میں ہر چیز واضح ہے پھر کونسی نئی چیز کی وضاحت چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا دنیا کے کسی ملک میں اسلام نافذ ہے اگر ہے تو کہاں؟

ج :- آپ کے تین سوال ہیں پہلے کا جواب یہ ہے کہ وزیر اعظم کی سربراہی میں جو اسلام آباد میں علماء کی کانفرنس ہوئی تھی اس میں بھی میں نے یہ گزارش کی تھی کہ علماء کا ایک پینل تشکیل دیں جو علمی اعتبار سے قرآن اور اس کے نزول کے اعتبار سے قرآن پاک پر صحابہ کرام کا عمل، صالحین کی آراء پھر مختلف ادوار میں اجتہاد اور ضروریات کے مطابق فیصلے، پھر عہد جدید یعنی ماڈرن دنیا کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر یہ رہنمائی کر سکیں کہ جب بھی کوئی کام سامنے آئے تو اس کے بارے میں

قرآن و سنت کی رہنمائی کیا ہے۔ میری اس بات کو وزیر اعظم نے بھی پسند کیا۔ اس کے بعد پھر رابطہ نہیں ہو سکا۔ وزیر اعظم نے میری بات کو اپنی تقریر میں بھی سراہا اور میری طرف ایک پرچی بھی بھیجی کہ یہ اچھی بات ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن و سنت کے فیصلے طے شدہ ہیں لیکن وہ صورت حال جس پر یہ فیصلے لاگو کرنے ہیں وہ طے کرنا ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے نزول سے لے کر قیامت تک کے لئے قابل عمل ہے۔ جس زمانے میں اسلام کا نزول ہوا اس وقت دنیا کے کسی کونے میں بھی کوئی نظام نہیں تھا۔ سب کچھ طاقت سے چلتا تھا

اسلام نے نظام حکومت کو عوامی سطح پر متعارف کرایا۔ دوسرے مذہب جو آسمانی بھی تھے لیکن وہ مختلف اقوام اور مختلف علاقوں کے لئے تھے لیکن نظام اسلام پوری انسانیت کے لئے ہے۔ ترکی میں اسلامی حکومت ختم کی گئی جس کے رد عمل کے طور پر تحریک خلافت وجود میں آئی۔ یہ مسلمان حکمران لا کر مسلط کئے گئے۔ مشرق وسطیٰ میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اپنے پاکستان میں دیکھ لیں ایک مخصوص طبقہ جو انگریز کے مفاد میں کام کرتا ہے وہی اوپر لایا گیا اور ابھی تک ہے۔ اگر کوئی حادثاتی طور پر اوپر آتا ہے تو اسے اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ اب ہمیں امیدار ہو جانا چاہئے اور میں سمجھتا ہوں کہ احساسِ ایداری پوری امت مسلمہ میں پیدا ہو گیا ہے۔

س :- ”الاخوان“ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

ج :- تنظیم الإخوان کا نام قرآن مجید سے لیا گیا ہے اس کا مطلب ہے بھائی بھائی، بھائی بھائی، بھائی چارہ۔

س :- الإخوان کو بیرون ملک سے سپورٹ ملتی ہے؟

ج :- تنظیم الاخوات کئے ہر رکن کی جان مال اور وقت اس کے لیے حاضر ہے اور ویسے بھی کسی بھی ملک کی پشت پناہی کی ضرورت نہیں۔

س :- دوسری تنظیموں اور الإخوان میں کیا فرق ہے؟

ج :- ہماری تنظیم کی بنیادی دعوت محبت رسولؐ ہے ہم تمام فروعی اختلافات سے اور خصوصاً ہوس اقتدار کو پاؤں کی نھو کر پر رکھتے ہیں۔

س :- الإخوان کی بنیاد کب پڑی؟

ج :- حقیقت میں اس تحریک کی بنیاد 1952 میں اس وقت پڑی جب اللہ کے ایک برگزیدہ مددگار مولانا اللہ یار خان نے پہلے شخص کو یوں دعوت دی کہ ”آؤ میں تمہارے قلب کا تزکیہ کروں۔“

س :- اگر کل کلاں آپ کو لوگوں کی بھرپور تائید حاصل ہو جائے تو آپ کے پاس اس موجودہ سیٹ اپ کو تبدیل کرنے کا کیا طریقہ کار ہے ؟

ج :- اگر عوام اپنی بے حسی کو دور نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کسی کے مختل رہیں یا فقط دعاؤں پر اکتفا کرنے لگیں تو پھر تاریخ بتاتی ہے کہ ان سے زبردستی قربانی لی جاتی ہے ہر طرح کی قربانی جانی و مالی اوریوں کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان نے کہا کہ "اصل بات یہ ہے کہ ہم نے دین کو اپنا سمجھا ہی نہیں ہم نے اسے مولویوں کا، پیر صاحبان کا، بزرگوں کا سمجھا ہے اب اگر میرے پاس ایک بکس ہے جسے میں نے بڑا سنبھال کر رکھا ہے کہ یہ میرے والد صاحب کا ہے میرے بزرگوں کا ہے پیر صاحب کا ہے مولوی کا ہے اور مجھے اس سے بڑی عقیدت ہے اور میں نے اسے سینے سے لگا رکھا ہے تو جب مجھ سے کوئی پوچھے کہ میاں اس میں کیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ جی یہ تو والد صاحب کے پوتے ہوں گے کہ میں نے تو اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھا ہے میں نے تو اسے ابھی تک نہیں کھولا۔ مجھے کیا معلوم اس میں کیا ہے تو میرے پاس جو دین اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کریم کا اسوہ حسنہ ہے یہ ہمارا اپنا ہے ہی نہیں۔ یہ تو والد صاحب کا مولوی صاحب کا یا پیر صاحب کا ہے اور اس جمالت کا اندھیرا اس وقت تک دور نہیں ہو گا جب تک ہم اس بکس کو کھول کر نہیں دیکھیں گے جب تک ہم اللہ کی کتاب کو سمجھیں گے نہیں جب تک ہم رسول اللہ کے ارشادات کو پڑھیں گے نہیں یہ تو نام ہے مزے سے زندگی گزارنے کا مولانا محمد اکرم اعوان نے اپنے تفصیلی بیان میں

کہا۔ یہ مراقبہ یہ وعظ تسبیح یہ درود یہ تبلیغی چلے، یہ کیا ہے یہ سارا درست جس طرح فوجیوں کو پریڈ کرائی جاتی ہے جس طرح انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے نتیجہ کیا ہوتا ہے ان کی پریڈوں کا۔ انہیں ٹریننگ دینے کا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کریں۔ یہ

ساری عبادات پریڈ ہیں مومن کی کہ وہ میدان میں آکر اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرے اب اگر ساری پریڈ سکھا کر اسلحہ لے کر دشمن کے پاؤں چاٹنے لگے اور دشمن جس طرح کہے وہ کرنے لگے تو آپ اس کا کیا انعام دیں گے کفر کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والوں کو بھی اتنا ہی انعام ملے گا جتنا اس فوجی کو ملے گا۔

حضرت مولانا نے فرمایا اس دور کے مسلمانوں کو غلط فہمی ہے کہ ہمیں خصوصاً اس عہد کے مسلمانوں کو کہ رحمت الہی اخروی نجات ہے جنت ہے جنت کے انعامات ہیں رحمت الہی جنت ہے۔ لیکن ملے گی انہی کو جو دنیا میں رحمت الہی کا مظہر ہوتے ہیں وہ آخرت میں بھی کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر دنیا میں گناہ سے سمجھوتہ اور دین سے بیزاری ہے تو وہ اس آس پر نہ بیٹھا رہے کہ آخرت کی سرخروئی اسکے حصے میں آئے گی۔ آخرت کی سرخروئی اس کے ہاتھ میں آئے گی جسے دنیا میں مدد الہی نصرت الہی کا احساس ہو گا۔ ہمارے مغرب کے دانشور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ”سچائی پر اسلام کی اجارہ داری ہے“۔ اسلام کی سچائی پر اجارہ داری نہیں، سچائی اسلام ہی میں ہے۔ اسلام سے باہر سچائی کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ ہماری صورت حال یہ ہے کہ ہماری عملی زندگی خلاف اسلام سمجھوتوں پر گزر رہی ہے دنیا کے بدترین عیاش شرابی لوگوں کو ہم اقتدار میں لاتے ہیں دنیا کے بدکردار لوگوں کو قیادت دیتے ہیں۔ دنیا کا بدترین نظام ہم نے گلے میں ڈالا ہوا ہے جو محض غلاموں کو مزید غلام رکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو خود انگریز کے ملک میں نہیں سکا چل۔ یہ ان ممالک کے لئے تھا جن پر انگریز قابض تھا اور انہیں غلام رکھنا چاہتا تھا۔ رائی برادر بھی شرم ہو تو ہم روضہ رسول کی حاضری کے بھی قابل نہیں رہے ہیں کیا جا کر بتائیں گے۔ کہ ہم سود کھاتے ہیں یا ہماری بیٹیاں ڈانس کرتی ہیں ہمارے ہوٹلوں میں عصمت فروشی ہوتی ہے۔ کیا ملک کے بڑے نہیں جانتے جو



ہوٹلوں میں عیاشی کرنے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان نے فرمایا ہماری تنظیم جو عملی طرز پر اسلام کی داعی ہے ہم کہتے ہیں اسلام کو سیکھا جائے اپنایا جائے اپنے اوپر نافذ کیا جائے اور ملک اور معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ سیاست کا مطمع نظر اقتدار ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم غیر سیاسی ہیں ہم اقتدار کی خواہش نہیں رکھتے۔ نفاذ اسلام کے حامی ہیں جو اقتدار میں ہیں انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ نفاذ اسلام کے لئے ساعی ہوں انہیں عوام سے وہ سلوک روار کھنا چاہئے جو اسلام کہتا ہے ہمیں چاہئے کہ ہمارا اقتدار فی کو نفاذ اسلام کے لئے مجبور کر ڈالیں۔

س :- آپ کا فہم اسلام کیا ہے ؟

ج :- ”میں نے اپنے شیخ“ کے ساتھ 25 برس گزارے حضرت ”اپنے عہد کے مجتہدین علماء میں سے تھے میں نے جو کچھ سیکھا حضرت کی رفاقت سے سیکھا۔ اسلام کے دو شعبے ہیں پہلا فرد کا عبادت کے ذریعے اللہ سے اپنے تعلق کا اظہار کرنا اور دوسرا خلق خدا کے باہمی تعلقات۔ ان میں اسلام حقوق فرائض کی ایک تفصیل دیتا ہے پہلے حصے پر اسلام اتنا زور نہیں دیتا کہ اسے بزور شمشیر منوایا جائے اگر کوئی ماننا چاہے تو یہ اللہ کا پیغام ہے نہ ماننا چاہے تو زبردستی نہیں، دوسرے حصے کو جس میں فرد کے حقوق آتے ہیں اسے منوانے کے لئے اسلام جہاد کا راستہ دیتا ہے اگر ظلم کسی طرح نہ رکے کسی کے حقوق غصب ہوتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی رہے تو پھر اسے بزور شمشیر روکنا بھی جائز ہے، اسلام کا سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ عام آدمی کا جو زمین پر رہتا ہے اس کا حق اس کو ملتا ہے اسی طرح اس کے ذمے جو فرائض ہیں وہ بھی ادا کرنے ضروری ہیں۔

س :- آپ کی تنظیم الاخوان کا مصر کی الاخوان سے کیا تعلق ہے ؟

ج :- مصر کی اخوان المسلمون تنظیم تھی اور اب تک بھی ہے ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق اور رابطہ نہیں ہے۔ ان کے اپنے ملکی حالات اور ان کی اپنی ضروریات ہے۔ اخوان قرآن کریم کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے بھائی۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے مصر والوں نے اخوان المسلمون چنا ہم نے اس میں مسلموں کا اضافہ ضروری نہ سمجھا ہم نے الاخوان نام ہی چنا یعنی بھائی چارہ۔ س :- مصر کی الاخوان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سہیل سمجھا جاتا ہے کیا آپ اور ان کی سوچ و افکار میں کوئی ہم آہنگی ہے؟

ج :- نہیں ہم آہنگی اس لئے نہیں ہے کہ وہاں کے سیاسی حالات مختلف تھے یہاں کے سیاسی حالات مختلف ہیں۔

س :- اگر ہم اندرون ملک سود ختم بھی کر لیں لیکن بیرونی قرضوں پر تو ہمیں پھر بھی سود دینا ہوگا؟

ج :- میں سمجھتا ہوں کہ اگر داخلی طور پر سود ختم کر لیں تو ہمارے پاس اتنے وسائل آجائیں گے جن سے ہم آسانی سے اپنے غیر ملکی قرضے بھی ادا کر سکیں گے اور رفتہ رفتہ ہمیں بیرونی سودی قرضوں سے بھی نجات مل جائے گی۔ زکوٰۃ خیرات صدقات 'عشر قربانی کی کھالیں' یہ سب چیزیں پسماندہ لوگوں کو اوپر اٹھانے کے لئے ہیں۔ ہم نے گوجرانوالہ ڈویژن میں زکوٰۃ و عشر کے اعداد و شمار جمع کئے تو اندازہ ہوا کہ یہ زکوٰۃ و عشر واقعی جمع ہو جائے تو یہ رقم اس ڈویژن کے سرکاری اخراجات سے دس گنا ہوگی۔ سیالکوٹ، لاہور، فیصل آباد وغیرہ گوجرانوالہ سے بہت آگے ہیں۔ بعض علاقے اس سے پیچھے بھی ہوں گے اور یوں نہایت محتاط اندازے کے مطابق پورے ملک سے اتنا زکوٰۃ و عشر جمع ہو جائے گا جو ملک بھر کے انتظامی اخراجات سے کم از کم پانچ گنا ضرور ہوگا۔

نوٹ :

یہ انٹرویو مختلف اخباروں اور جرائد سے لیا گیا ہے۔ نیچے ان کے نام درج ہیں۔  
روزنامہ نوائے وقت۔

روزنامہ خبریں

روزنامہ اساس

ہفت روزہ چکوال پوائنٹ

قومی ڈائجسٹ

ماہنامہ زندگی

## صقارہ نظام تعلیم !!

انگریزوں نے اپنی آمد کے فوراً بعد جب برصغیر کا جائزہ لیا تو ان پر اعداد و شمار اور عملی صورت حال کو دیکھ کر یہ واضح ہوا کہ برصغیر کا مسلمان تعلیم یافتہ ہے۔ جس کا سبب مسلمانوں میں رائج تعلیمی نظام ہے۔ چونکہ اس تعلیمی نظام کو اسلامی حکمرانوں نے جاگیریں دے دے کر قائم کیا تھا اور ان اسلامی اداروں کے تعلیمی اخراجات ان جاگیروں کی آمدن سے پورے ہوتے تھے جو مسلمان حکمران اداروں کو دے دیا کرتے تھے تو انگریزوں نے فی الفور دو انقلابی فیصلے کئے۔

۱۔ تحریک بغاوت میں علماء کی حمایت پر بطور سزا ان مدارس کی جاگیریں ضبط کر لیں اور مسلمان طلباء کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔ جس سے عام لوگوں میں ان اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

۲۔ دوسرا اہم فیصلہ یہ کیا کہ انگریزی کو سرکاری و علمی زبان کے طور پر رائج کر دیا

اس ایک فیصلے سے ساری مسلمان قوم ایک جنبش قلم سرکاری طور پر ان پڑھ ہو گئی۔ اور اس طرح وہ مسلمان قوم جو بد صغیر میں ہزار سال سے حکمران تھی، اسے تباہی کے گڑھے پر پہنچا دیا گیا۔

انگریزوں نے آتے ہی بڑے منظم طریقے سے ہمارے نظام تعلیم کو تباہ کر کے، ہم پر ترقی کے راستے بند کر دیئے۔ انہوں نے اسلامی نظام تعلیم کی بجائے ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی، جو ہرگز سیکولر نہیں تھا۔ کیونکہ سیکولر کا مطلب تو یہ ہے کہ مذاہب سے بالاتر ہو کر انسانیت کے حوالے اور انسان کے حوالے سے بات کرنا۔ جبکہ جو نظام تعلیم ہمیں دیا گیا، اسکی بنیاد ہی مذہب دشمنی پر رکھی گئی اور یہ مذہب دشمنی بھی صرف اسلام تک ہی محدود رہی۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اور خواص دونوں مذاہب سے دور ہو گئے۔ اور اس طرح مروجہ نظام تعلیم مذہب دشمنی کے ساتھ ساتھ اقتصادی و علمی ترقی کا بھی دشمن بن گیا اور اب اس مروجہ نظام تعلیم کا واحد مقصد یہ رہ گیا ہے کہ ملک کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو کہ اصطلاحی طور پر تو عالم ہو، مگر کسی بھی فن میں اسے مہارت نصیب نہ ہو۔ بلکہ اب تو اس طریقہ تعلیم کا واحد مقصد حکومت میں بہتر ملازمت کا حصول رہ گیا ہے۔ اسی لئے اس کے بے شمار درجات بن گئے ہیں۔ مقتدرہ طبقتوں کے لئے علیحدہ نظام تعلیم اور غریبوں کے لئے علیحدہ نظام تعلیم بنایا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرہ مکمل طور پر انتشار کا شکار ہو چکا ہے۔

امیر ملک محمد اکرم اعوان نے ان تمام مسائل کے پیش نظر، اپنے منفرد تعلیمی ڈھانچے کے تحت قابل عمل، سستا اور موثر نظام تعلیم پیش کیا ہے۔ جس کے دو اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ ہر بچے کی نہ صرف ذہنی نشوونما اسلامی طرز پر کی جائے۔ بلکہ اس کو عملی طور پر

بھی ایک سچا مسلمان بنایا جائے۔

۲۔ صفحہ نظام تعلیم ہر قسم کے پیش ورانہ، دینی اور ترقیاتی علوم سکھانے کے نظام کو متعارف کراتا ہے۔

اس کے تحت لاہور اور منارہ دارالعرفان میں تعلیمی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ 87ء میں صفحہ اکیڈمی منارہ، دارالعرفان کا افتتاح مرحوم صدر ضیاء الحق نے کیا۔ تو امیر ملک محمد اکرم اعوان نے مرحوم صدر کو صفحہ نظام تعلیم کے بارے میں مکمل رپورٹ پیش کی جسے صدر نے یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیا کہ میں کوشش کروں گا اسے ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کو اس کی طرز پر چلا سکوں۔ مگر بعد میں مرحوم صدر کی جانب سے ایسے کسی اقدام کی خبر نہ موصول ہوئی۔

مگر دارالعرفان میں صفحہ اکیڈمی نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس کے پہلے سال کے امتحانی نتائج نے ہی لوگوں کو چونکا دیا۔ اسکے بعد سے اب تک ہر سال بورڈ ٹاپ کر رہے ہیں۔ صفحہ نیز پہلے اور دوسرے نمبر کی پوزیشنیں لے رہے ہیں۔

میں صفحہ اکیڈمی کے بارے میں اخباری کالموں اور مختلف لوگوں سے کافی کچھ سن چکی تھی اس کتاب کے دوران قریب سے اس ایجوکیشن سسٹم کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دینی اور دنیاوی تعلیم کا جو خوبصورت امتزاج یہاں ہے شاید ہی کہیں اور ہو۔ بے اختیار سوچا کاش اپنا کوئی چھوٹا چھوٹا جیسے ایک اچھا انسان بننے کے لئے اکیڈمی کے حوالے کر دیتی۔

صفحہ نظام تعلیم کیا ہے؟

اس کے مقاصد کیا ہیں اور اس کی ضرورت کیوں ہے؟

اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گی۔

۱۔ اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدوخال

۲۔ ایک وقت دین اور دنیا کی تعلیم

۳۔ غیر طبقائی تعلیم۔

۴۔ تعلیم کے لئے پاکیزہ ماحول۔ یہ ہے صقارہ ایجوکیشن سسٹم۔

یہ نظام تعلیم انسان کو اپنے مقصد تخلیق سے آشنا کرتا ہے۔ کائنات میں اپنے مقام کو پہچاننا اور خالق کائنات سے قلبی رشتہ استوار کرنا اس طرح سکھاتا ہے کہ انسان اللہ کا بندہ بن کر با مقصد دنیوی زندگی گزار سکے۔

پاکستان بننے ہی ہم نے اس مضموم کو پس پشت ڈال دیا اور ایک کافرانہ نظام تعلیم اپنایا جو سفید حکمرانوں نے اپنی حکومت چلانے کے لئے کلرکوں کی ایک فوج تیار کرنے کے لئے وضع کیا تھا۔ اور جس کا بانی لارڈ میکالے لکھتا ہے کہ ”یہ صغیر میں“ میں ایک ایسا نظام تعلیم قائم کر آیا ہوں جو مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذہنی غلامی میں مبتلا رکھے گا۔“

تو ایک طرف انگریزوں کا دیا ہوا نظام تعلیم اور دوسری طرف دینی مدارس۔ اول الذکر کے طلباء عصری علوم سے آگاہ مگر دین سے نااہل اور دینی اداروں سے فارغ التحصیل طلباء فیلڈ کے کام سے ناواقف۔ یہ ایسی عجیب و غریب پھولیشن تھی۔ جس نے درد مند دل رکھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور ایسی ہی درد مندی کی سوچ کے نتیجے میں صقارہ نظام تعلیم وجود میں آیا۔

صقارہ نظام تعلیم صرف ذریعہ معاش کے لئے تعلیم کا قائل نہیں ہے۔ یہ مسلم نوجوان کے شعور کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔ نہ تو یہاں فاکلوں میں دفن ہونے والے کلرک پیدا کئے جاتے ہیں نہ چندون کے محتاج مولوی۔ یہ نظام طلباء کے دلوں میں ایمان و یقین کی ایسی روشنی بھرتا ہے جس سے وہ دنیا کی قیادت کے قابل ہو سکیں اور مسلم امہ میں نئی روح پھونک سکیں۔

اس نظام کا طرہ امتیاز طلباء کے ارادے، ان کے قلوب اور ضمیر کو ایک آگہی دینا ہے، جس سے وہ اللہ اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کر سکیں۔ اس لئے ذکر قلبی اور تعلیم تصوف اس نظام کا جزو لاینفک ہیں۔ تصوف حسن اسلام ہے۔ شریعت مطہرہ کا نچوڑ ہے۔ جس کے بغیر انسان ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔



## صقارہ نظام تعلیم

صقارہ اکیڈمی کے پرنسپل، لیشنٹ کرنل محمد ابراہیم خلیل سے باتیں!!  
 ہم ایک تعلیمی پروگرام بنا رہے ہیں جس میں نرسری سے لے کر- Gradua-  
 tional تک تعلیم دی جائے گی۔ اور اسلامی تعلیمات اس میں اس طرح شامل ہوں  
 گی کہ گریجویشن کے بعد طالب علم کو اسلامی تعلیمات کے بارے میں کسی سے پوچھنے  
 کی ضرورت نہ پڑے، کیونکہ آنحضرت کا فرمان ہے کہ ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر  
 فرض ہے“

ہم ان کو فرائض کا علم دینا چاہتے ہیں، واجبات کا علم، جائز و ناجائز کا علم دینا  
 چاہتے ہیں جس سے وہ اپنی چوبیس گھنٹے کی زندگی کو Regulate کر سکیں۔ ہمارا  
 مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا ماڈل تیار کریں کہ اگر کل کو نظام اسلام کا احیاء ہو تو ہمیں  
 نظام اسلام کے لئے بغلیں نہ جھانکنا پڑیں۔ حضرت جی کا مقصد ایک تعلیم ایک جیسے  
 نصاب کا اجراء ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ صغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل تعلیم مفت  
 تھی اور طالب علموں کی کفالت بھی کی جاتی تھی۔ دینی اور دنیاوی تعلیم ساتھ ساتھ

دی جاتی تھی تاکہ وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد امام مسجد ہی نہ بنیں بلکہ روزمرہ زندگی میں بھی کامیاب انسان ہوں ساتھ عسکری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ہمارے ہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتحان گاہ میں نگران عملہ جو کہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی نقل نہ کرے۔ وہ وقت نظر ہمارے طالب علم کی امامت میں نماز ادا کرتا ہے۔ کلاس دہم کا ہمارا طالب علم کامران امتحان دے رہا تھا۔ سب لڑکے چلے گئے۔ لیکن وہ بیٹھا رہا۔ تو نگران عملہ اس کے پاس گیا کہ اگر کسی مدد کی ضرورت ہو تو ہٹاؤ۔ اس نے لکھتے لکھتے بایاں ہاتھ اوپر کھڑا کر دیا اور کہا۔ میرے پاس مدد ہے۔ عملے کے انچارج نے پوچھا کس کی مدد ہے تو اس نے جواب دیا اللہ کی مدد ہے پھر نگران انچارج نے کہا کہ یہ جب تک لکھ رہا ہے اسے لکھنے دیا جائے۔ ہماری کینٹین میں بھی بعض اوقات کوئی نہیں ہوتا لوگ خود ہی چیز لے جاتے ہیں اور پیسے دے جاتے ہیں۔

فوج میں ہر PMA کورس میں ہمارے اوسٹاڈو امیدوار چارہے ہیں اور کیپٹن تک پہنچ چکے ہیں لاہور میں ہمارا گریجویٹ کالج BSc تک ہے اور ایک سکول بھی ہے ہمارا منصوبہ ہے کہ ہر صوبائی سطح تک ڈگری کالج ہو اور ڈویژن سطح پر انٹر میڈیٹ کالج اور ہر ضلع میں ہائی سکول ہو۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ کرے کوئی ایسی حکومت آئے جو ہمارا تعلیمی نظام اپنائے، اکیڈمی کا پچھلے سال میٹرک کا رزلٹ 90% رہا اور چوں کے تفریحی پروگرام بھی رکھے جاتے ہیں۔ میں والدین سے کہتا ہوں کہ پاکستان میں اور کہیں بھی چوں کا ایسا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہاسٹل میں 60% بچے ایسے بھی ہیں جن کے والدین Education میں ہیں لیکن وہ اپنے چوں کو ہمارے پاس بھیجتے ہیں یا وہ لوگ جن کے والدین باہر ہیں ہمارے پاس آتے ہیں کیونکہ ان کے والدین ان پر صحیح توجہ نہیں دے پا رہے ہوتے۔

ہمارے پاس اس وقت ہاسٹل میں 160 طلبہ کی منجائش موجود ہے اور 154 طالب علم ہیں انھیں جماعت میں داخلے ہوتے ہیں۔ دو سال پہلے تو ہمارے پاس امریکہ کینیڈا اور سعودی عرب کے بچے بھی تھے۔ اس وقت ہمارے پاس پورے پاکستان سے طالب علم موجود ہیں ہمارا ایک Additional کورس ترکیہ نفس کا ہے جس کا رڈ کا امتحان نہیں ہوتا لیکن ہم خود امتحان لیتے ہیں اور اسی طرح عربی کا بھی۔ صبح کو ہم چوں کو جگاتے ہیں اور فجر کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کو ناظرہ قرآن پڑھواتے ہیں۔ جس نے ناظرہ پڑھا ہو اسکو تیسواں پارہ حفظ کرواتے ہیں۔ اس کے بعد سورۃ یاسین، منزل اور سورۃ رحمان حفظ کرواتے ہیں اور آخری Stage پر پہلے پارہ سے قرآن مجید کا ترجمہ کرواتے ہیں اور ترجمہ ایسے کرواتے ہیں کہ عربی گرائمر بھی ساتھ ہی سمجھا دیتے ہیں مثلاً الحمد کیا ہے اور الحمد سے احمد کیسے بنایا پیریڈ تمیں منٹ کا ہوتا ہے اس کے بعد چوں کو PT کروائی جاتی ہے PT کروانے کے بعد بچے نما کر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور اسمبلی ہوتی ہے ایک لڑکا تلاوت کرتا ہے اور ترجمہ۔ اسکے بعد ایک لڑکا سارے دن کی اہم خبریں سناتا ہے جو کہ زیادہ تر سٹوڈنٹس کی دلچسپی کی ہوتی ہیں ایک اردو میں تقریر کرتا ہے اور دوسرا انگریزی میں تقریر کرتا ہے اور روزانہ بچے بدلتے رہتے ہیں اس طرح سب کو یونے کا موقع ملتا ہے۔

اس کے بعد ایک Short Break ہوتی ہے اور بچے چائے وغیرہ پیتے ہیں پھر ایک پیریڈ ہوتا ہے اور نماز ظہر کے بعد لنگھ ہوتا ہے اور پھر دو گھنٹے ریٹ ہوتا ہے جس میں سونا ضروری ہوتا ہے اس کے بعد دو گھنٹے مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ عصر کے بعد Play ground۔ ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لے۔ ہماری پہلی ترجیح مارشل آرٹ ہوتا ہے اور مارشل آرٹ میں

Yellow Belt لینا compulsory ہے اس کے علاوہ باسکٹ بال وغیرہ کرکٹ کو ہم To be very frank ڈسکراج Discourage کرتے ہیں اس کی جگہ Base Ball ہے چونکہ Base Ball میں بھی تقریباً وہی کچھ ہے لیکن یہ سب ایک گھنٹے میں ختم ہو جاتا ہے اور کرکٹ میں وقت زیادہ ضائع ہوتا ہے اس کے بعد مغرب کی نماز ہوتی ہے اور پھر ذکر کی محفل ہوتی ہے اور تعلیم السلام کے نام سے ذکر ہوتا ہے جس میں دعائیں وغیرہ سکھاتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ کالج کو FSc تک لے جائیں تاکہ فوج میں کمیشن بھی Apply کر سکیں۔

## نئے عہد کی خوشبو

صفاہ نظام تعلیم کے متعلق لکھا ہوا یہ روزنامہ احساس میں گزار آفاقی کا کالم  
نئے عہد کی خوشبو کے نام سے 'نئے عہد کی بشارت کی گواہی ہے!!

”وہ نیم شب کی ساعتیں تھیں جب وہ میری بیمار پر سی کے بعد اپنی اگلی منزل  
کی طرف رواں ہوئے۔ رب کی دھرتی پر پھیلے ہوئے یہ کون لوگ ہیں۔ جو نفسا نفسی  
کے اس عالم میں بھی اور صبح دم سے شام تک محیط کشاکش زندگی کے باوصف مجھ  
جیسے بے مایہ و پرکاہ کے لئے دعائے نیم شبی اور سامان مسیحائی لئے پھرتے  
ہیں۔ ٹوٹے ہوئے ارادوں کو جوڑتے اور ریزہ ریزہ امیدوں کی شیرازہ ہدی کرتے  
ہیں دکھ سمیٹتے اور سکھ بانٹتے ہیں جن کی حیاتی کا ایک ایک سانس رب کے ذکر اور اس  
ذکر کی خوشبو کو عمل کے قالب میں ڈھالنے اور رب کی مخلوق کی خدمت میں گزرتا  
ہے۔ ان لوگوں کی تک و تاز کا ایک ہی مقصد رب کی دھرتی رب کا نظام کا نفاذ اور اس  
سلسلے میں سب لوگ محنت و ریاضت کے دھنی واقع ہوئے ہیں۔ ہر دستیاب و سیلے  
سے علم و ہنر اور مہارت تک رسائی ان کے ذوق و شوق کا حصہ ہے۔ مطالعے  
مشاہدے اور تجربے سے مالا مال یہ ہمدگان خدا ہی مکالمے رابطے اور-Interac

lion کے ذریعے خوب سے خوب تر کی تلاش میں محور رہتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ اور ذکر و فکر کے ذریعے ذہنوں کی پاکیزگی و طہارت ان کا خاص شغف ہے۔ ان کے ہاں قلب کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے کہ ذکر الہی قلب میں ایسی تبدیلی کا باعث بنتا ہے جسے حقیقی معنوں میں اسلامی انقلاب کی پیشگی ضرورت کہا جاسکتا ہے۔

محترم کرنل (ر) چوہدری بشیر احمد اور جناب بریگیڈیئر (ر) امتیاز احمد اپنے ناموں کے بچہ رینائر منٹ کی پیرانہ سالی رکھنے کے باوجود 'جوانوں سے زیادہ باہمت غازی ہیں۔ عرصہ دراز تک عساکر پاکستان میں خدمات انجام دینے کے بعد اب تنظیم الاخوان پاکستان کے سپاہی ہیں۔ اور حضرت جی امیر محمد اکرم اعوان صاحب کے معتمدین میں شمار ہوتے ہیں۔ کرنل بشیر صاحب تنظیم کے نائب صدر بھی ہیں۔ ان کے نزدیک سپاہیانہ معلومات رکھنے والے لوگ اپنے نظم و ضبط، مجاہدانہ ریاضت اور مقصد کے ساتھ اٹوٹ و استعجالی اور کومٹ منٹ کے باعث آدھے سے زیادہ صوفی ہوتے ہیں اور اپنے ہدف کے حصول کے لئے تن من و حن کی بازی لگا دینے کی آرزو ان کے اس لہو میں رچ بس چکی ہوتی ہے۔ ذکر اور اسکی اہمیت فضیلت کی بات چلی تو یہ بھید کھلا کہ یہ عمل قلب کی پاکیزگی و طہارت کیساتھ قرب الہی کا بھی موجب بنتا ہے اور قرب الہی اپنے آخری تجزیے میں ہم سے کہ اس فیصلہ کن معرکے کے لئے تیار کرتا ہے جس میں رب کی دھرتی پر رب کا نظام خوشبو عن کر بکھر جاتا ہے۔

”یہ خوشبو کب ہمارا مقصد بنے گی ہم کہ جو ایک بدبودار نظام کے ستائے ہوئے

ہیں“

بہت ساری باتوں کو خلاصے کی شکل میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ مولا کریم کی صفت یہ ہے کہ مظاہر فطرت کو تو ایک طے شدہ پروگرامنگ دے دی گئی ہے۔ البتہ انسانوں کی بستی میں رب کی دھرتی پر رب کا نظام انسانوں کے ذریعے

نافذ ہوتا ہے۔ اس نظام کا سارا خاکہ اللہ کی آخری کتاب اسوۂ نبویؐ میں محفوظ ہے۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کیجئے کتاب آپ سے ہم کلام ہو گی، آپ پر معافی اور مغفیم کے جہاں درجہاں کھلتے چلے جائیں گے۔ بس ضرورت یہ ہے کہ ایک مربوط اور موثر اجتماعی کوشش کے ساتھ ان معافی و مغفیم کو معاشرے پر سانبان کی طرح تان دیجئے پھر دیکھیے رب کی دھرتی کیا کیا محل بوئے کھلاتی ہے، کیسے کیسے شراپچا ہتی ہے اور کیسی کیسی فیوض و برکات لوگوں کی دلبیز پر پہنچتی ہیں۔

مگر سوال یہ ہے تربیت یافتہ انسانوں کی وہ جماعت کہاں سے آئے گی جو انسانوں کی بستی میں اور رب کی دھرتی پر رب کا نظام نافذ کر دے۔

باہمی مکالمے سے یہ منظر کھلا کہ تنظیم الاخوان کی سطح پر ایسے انسانوں کی شخصیت سازی کا ہمہ جہتی سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے اسلامی انقلاب کی کامیابی اور دوام میں واسطو ان انقلاب کی شخصیت سازی اور مابینت قلب کا نخل ہر سطح اور درجے پر جاری ہے اور اس وقت خالم یہ ہے کہ چند سوں کی کاوش کے نتیجے میں سوا لاکھ کے قریب افراد اسلامی انقلاب کے مشن کے سلسلے میں موت کی دیت یا ایثار عظیم کی کوٹ منٹ کے پختہ رشتے سے منسلک ہو چکے ہیں۔

مگر میرے لئے شخصیت سازی کے سلسلے میں تنظیم الاخوان کے شروع کردہ صقارہ علمی پروجیکٹ میں دلچسپی کا غیر معمولی سامان موجود تھا۔ یہ بات نہایت اطمینان بخش ہے کہ اس وقت جبکہ ہمارے ملک میں تعلیمی سسٹم نصابی اور عملی سطحوں پر تقسیم در تقسیم کا شکار ہے اور بے رحم کمرشل ازم کے باعث ہمارا تعلیمی شعبہ تجارتی منڈی کی پستی تک پہنچ چکا ہے، حضرت مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کی براہ راست سرپرستی میں صقارہ سکول سسٹم کے حقیقی معنوں میں ایک مربوط اور ہمہ جہتی اوصاف کے حامل نصابی پروگرام کے ذریعے ایسی نسل تیار کی جا رہی ہے جو

اول و آخر پاکستانی اسلامی انقلاب کے رنگ میں رنگی ہوگی۔ اس سلسلے کے سکولوں میں رائج نصاب اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے جس میں جدید علم کی سائنسی ضروریات، صنایع و تخلیقی اوصاف اور اسلامی طرز حیات کے تمام تقاضے پورے

ہوتے ہیں۔ صفحہ کے معنی شاہین کے ہیں۔ چنانچہ صفحہ میں تعلیم کا مقصد محض کاغذی ڈگریوں یا نوکریاں کا حصول نہیں بلکہ ایک ایسے مفید اور قابل فخر انسان کی تشکیل ہے جو اپنے وطن، اپنے دین اور اپنے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو۔ اس وقت صفحہ سسٹم کے تحت منارہ چکوال اور لاہور میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے متعدد سکول اور کالج سرگرم عمل ہیں جہاں ہائی سکول اور ڈگری کے درجے تک تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے منارہ چکوال میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کی تعداد ساڑھے چھ سو ہے۔ جبکہ لاہور ساڑھے پانچ سو چھ چیاں مختلف درجوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ منارہ میں قابل لحاظ تعداد غیر ممالک سے آئے ہوئے اقامتی طلباء کی ہے یہ بچے صبح علی الصبح بیدار ہوتے ہیں نماز فجر کے ساتھ ذکر کی محفل میں شرکت کرتے ہیں۔ پھر نریک سوئٹوں میں جنگل ہیلوں اور ٹیلوں میں جاگنگ کی جاتی ہے، ناشتے کے بعد تعلیمی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو دوپہر کے کھانے نمازوں اور سہ پہر کی گیمز کے ساتھ رات تک جاری رہتا ہے چوں میں صحت مند تفریحی و تخلیقی سرگرمیوں، صنایع اوصاف اور سائنسی و تکنیکی مہارتوں کو اجاگر کرنے کا خصوصی اہتمام بھی صفحہ علمی منصوبے کا خاصہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پنڈی بورڈ کے امتحانات میں متعدد بار صفحہ کے طلباء و طالبات نے نمایاں پوزیشنیں حاصل کی ہیں۔ اسے گریڈ کا حصول تو صفحہ کے ہر طالب علم کا خصوصی امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ کرنل بشیر صاحب بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ صفحہ کے فارغ التحصیل طلباء و طالبات آج زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔



اور میں پاکستان کے منظر نامے پر ایسی ہمہ گیر سماجی تبدیلیوں کے نقوش  
 ابھرتے دیکھ رہا ہوں جہاں جماندیدہ اور تربیت یافتہ نئی نسل ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے  
 ایک نئے عہد نامے 'ایک جدید سوشل کنٹریکٹ کی بنیاد رکھ رہی ہے' جہاں رب کی  
 دھرتی پر رب کے نظام کی جگہ گاہٹ میں ظلم و نا انصافی اور بھوک و بیماری کے سارے  
 اندھیرے دم توڑ رہے ہیں اور جہاں جسم و جان کی سلامتی کا ایک نیا عہد جنم لے رہا  
 ہے۔"

## شعبہ نشر و اشاعت !!

سلسلہ عالیہ کا ایک اہم شعبہ نشر و اشاعت کا ہے۔ جس کا کام حضرت جی کی تمام تصانیف کو شائع کرنا ہے اور سلسلہ عالیہ کی دوسری تعلیمات کی اشاعت ہے۔ ایک شعبہ آڈیو ویڈیو کا بھی ہے، جس میں حضرت جی کے خطابات اہم پروگرامز اور مشن سے متعلق مصروفیات کو محفوظ کرنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ شعبہ بھی نشر و اشاعت کا ایک حصہ ہے۔

شعبہ نشر و اشاعت میں :-

۱۔ کتابیں سلسلہ عالیہ سے متعلق اور حضرت جی کی مختلف تصانیف

۲۔ المرشد

۳۔ الاخوان نامہ

المرشد میں حضرت جی کی تقاریر شائع ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ روحانی دینی علمی اور فقہی مسائل پر تحریریں المرشد کی خصوصیت ہیں۔ اچھی شاعری بھی المرشد کا حصہ ہے۔ المرشد کا اجرا 78ء میں ہوا تھا۔ 80ء میں اس کا باقاعدہ ڈیکٹریشن ہو گیا تھا۔ اسکی سرکولیشن 3300 ہے۔ المرشد ملک کے طول و عرض میں رہنے والوں

ہر ماہ باقاعدگی سے پہنچتا ہے۔ خصوصاً سلسلہ عالیہ سے وابستہ لوگوں میں یہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ آج کل اس میں ایک نیا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ جس میں آنحضرت کے صحابہؓ کے حالات زندگی کے بارے میں ”من الظلمات علی النور“ کے عنوان سے مختلف شخصیات کے بارے میں بتایا جائے گا۔ سلسلے کی ایک لائبریری لاہور میں ہے جہاں دوسری کتابوں کے علاوہ سلسلے کے شعبہ نشر و اشاعت کے تحت چھپنے والی تمام کتب باسانی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی لائبریری دارالعرفان منارہ میں ہے۔ جس میں نادر علمی، فقہی، ادبی، سیاسی، دینی، روحانی اور دیگر تمام موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں نادر علمی نسخے بھی شامل ہیں۔ جو عربی اور فارسی زبانوں میں تحریر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک شعبہ ویڈیو، آڈیو کا ہے، وہ بھی سلسلہ عالیہ کے شعبہ نشر و اشاعت کے تحت چلتا ہے۔ مشن، حضرت جی کے خطابات اور دوسری اہم مسرودیات کو محفوظ رکھنے کا کام اسی شعبہ کے ذمہ ہے۔

گزشتہ برس سے آڈیو/ویڈیو سسٹم باقاعدہ منظم کر کے شعبہ نشر و اشاعت کے زیر اہتمام کر دیا گیا ہے۔ جس میں اب تک حضرت جیؑ کی دو درجن آڈیو کیسٹس کے علاوہ موجودہ شیخ کی پانچ سو ویڈیو اور تقریباً پچیس سو آڈیو کیسٹس موجود ہیں۔ جو ترویج دین میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

## ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

حوالہ دستور العمل سلسلہ عالیہ شق (ط) صفحہ 5۔ جس کا متن درج ذیل ہے :-  
 ”ا۔ سلسلہ کی نشر و اشاعت کا شعبہ روحانی تربیت کا حصہ ہے۔ اس پہلو کے

نشود نما اور تحفظ و بقا کے لئے ادارہ نقشبندیہ اویسیہ کے تابع ماہانہ المرشد اور جملہ تصانیف کی طباعت اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے اس شعبے کو دارالعرفان کا حصہ بنادیا گیا ہے۔ میں اپنی تمام تصانیف اور ان کے حقوق اور المرشد کو ادارے کی ملکیت میں دیتا ہوں۔ میرے کسی وارث کو حق وراثت نہ ہوگا۔

۲۔ میری زندگی میں میرے شاگرد اولین حافظ عبدالرزاق (چکوال) نے اس ادارے کی نشر و اشاعت اور استحکام کے لئے زندگی کا قیمتی حصہ وقف کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔ میں حافظ عبدالرزاق صاحب کو ادارہ نقشبندیہ اویسیہ کا ناظم نشر و اشاعت مقرر کرتا ہوں جو تابع مجلس منتظمہ کام کریں گے اور حافظ صاحب کے بعد مجلس موزوں آدمی کا انتخاب کرے گی۔

۳۔ نشر و اشاعت کے کام کے لئے حافظ عبدالرزاق صاحب کی معاونت کے لئے ان کی زیر نگرانی اور حسب ہدایات کمیٹی نشر و اشاعت بنائی جاتی ہے۔ یہ کمیٹی مجلس منتظمہ کے تابع ہوگی۔

اب جبکہ حافظ عبدالرزاق صاحب ضعیف العمری کی وجہ سے یہ بوجہ برداشت نہیں کر سکتے اور گزشتہ کمیٹی تشکیل نو کے باوجود کوئی فعال کردار ادا نہیں کر سکی لہذا اس اہم شعبے کو فعال بنانے کے لئے دستور العمل کی روشنی میں درج ذیل ہدایات جاری کی جاتی ہیں :-

(۱) ناظم نشر و اشاعت - کرمل سرور (ریٹائرڈ)

(۲) کمیٹی نشر و اشاعت (۱) محمد اجمل صاحب۔ صدر

(۲) عرفان الی لیکچرار صفارہ کالج

(۳) ماسٹر محمد اسلم عادل (۴) اللہ دیتہ .....

## ۱۔ ذمہ داریاں

(۱) سلسلہ عالیہ کی جملہ کتب کی طباعت۔ تقسیم اور اکاؤنٹنگ۔

(۲) ادبیہ کتب خانہ لاہور اور مرکزی سیل پوائنٹ دارالعرفان کی دیکھ بھال اور

سالانہ شاک بیکنگ۔ اول الذکر کی شاک بیکنگ۔ ہر سال جون کے آخری ہفتے

اور مرکزی سیل پوائنٹ کی ہر سال سالانہ اجتماع کے دوران ہوگی۔

(۳) بیرون ممالک کے حلقوں پر کتب کی تقسیم اور اکاؤنٹنگ۔

(۴) ہر کتاب کے دوبارہ طبع ہونے پر منصف سے نظر ثانی۔ حضرت کی کتب کی نظر

ثانی کا کام ناظم کے ذمہ ہوگا۔

(۵) طابع پریسوں کے ساتھ رابطہ اور کتب کے Set-up کو بہتر سے بہتر بنانے کی

تہیم کوشش۔

(۶) جملہ حسابات، بینک اکاؤنٹ اور سالانہ آڈٹ

(۷) مارکیٹنگ کی ہر ممکن کوشش۔

(۸) المرشد کی طباعت اور اشاعت کی نگرانی۔

(۹) کتب کی نشر و اشاعت سے متعلق ہر وہ کام جو اوپر درج نہ ہوا ہو۔

منہ رجبہ بالا Set-up اپنا کام جلد از جلد شروع کر دے گا اور 15-7-96 تک

کام کا چارج سنبھال لے گا۔ اور اپنی کارکردگی کی سہ ماہی رپورٹ ناظم اعلیٰ کے ذریعہ

شیخ سلسلہ عالیہ کو باقاعدگی سے پیش کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔